حدیث کے اصلاحی مضامین

جلد ششم

افادات

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل گجرات

شعبۂ فیض محمود سورت

تفصیلات

کتاب کا نام:......................حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد ششم)
افادات:...........حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
بہ اہتمام:...........................خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم
صفحات:...۴۴۴

ناشر:

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات:+9199133,19190/99048,86188
شعبۂ فیض محمود سورت:+9199988,31838

ملنے کے پتے

- مکتبۂ انور (مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی) جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل
- (حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ) دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر
- مدینہ ایجنسی جھانپا بازار سورت
- قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت
- اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت
- رلابیل شوپ رانی تالاب سورت
- مفتی سلیمان شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر)

اجمالی فہرست مضامین......جلد ٦

تفصیلی فہرست مضامین............جلد ششم

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرْحَامِ ا

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرْحَامِ ۲

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرحَامِ ۳

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرْحَامِ ۴

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

تَحْرِیْمُ عُقُوْقِ الوالِدَیْنِ وَقَطِیْعَةِالرَّحِمِ

والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت

فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

اِکْرَامُ اَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَبَيَانِ فَضْلِهٖ

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ ا

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ ٢

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

زِيارةُ أَهلِ الْخَيرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ ا
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

زِیارۃُ أَھلِ الْخَیرِ وَمُجالَسَتُھُمْ وَصُحْبَتُھُمْ وَمُحَبَّتُھُمْ ۲
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

زِیارۃُ أَھلِ الْخَیرِ وَمُجالَسَتُھُمْ وَصُحْبَتُھُمْ وَمُحَبَّتُھُمْ ۳
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ والحثِّ عَلَیهِ ا

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ والحثِّ عَلَیہِ ٢

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ والحثِّ عَلَیہِ ٣

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ والحثِّ عَلَیہِ ۴

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

علاماتُ حبِّ اللہِ تعَالیٰ العَبدَ وَالحثّ عَلَی التَّخَلُّقِ بِهَا ا

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

علاماتُ حبِّ اللہِ تَعالیٰ الْعَبْدَ وَالحثّ عَلَی التَّخَلُّقِ بِهَا ۲

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

اَلتَّحْذِيْرُ مِنْ اِيْذَآءِ الصَّالِحِيْنَ وَالضُّعْفَةِ وَالْمَسَاكِيْنَ

نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا

اِجْرَآءُ أَحْکَامِ النَّاسِ عَلیٰ الظَّاھِرِ وَسَرَائِرُھُمْ عَلیٰ اللہِ

ظاہر کے مطابق معاملہ کرو۔ دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مذہب اسلام پر اگر سو جانوں سے بھی فدا ہوا جائے تو اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا ایسی پاکیزہ تعلیمات، اتنے اعلیٰ اخلاق کوئی باطل مذہب بھلا کیونکر بتا سکتا ہے، اور پھر جامعیت اتنی ہر گوشہ اور جزئیہ کو کھول کر صاف اور دوٹوک بیان کردیا گیا۔ معاشرے میں فرحت ومسرت کی لہریں دوڑیں تو کیسے دوڑیں؟ ایسے کہ انسان اپنے حقوق کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں یکسوئی سے لگ جائے۔ سچ ہے! انسان اپنی دنیوی زندگی سے بھی اتباع شریعت وسنت کے بغیر لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ فیشن پرستی، مال واسباب، زروجائیداد سے کبر ونخوت تو حاصل ہوسکتا ہے، لیکن سکونِ قلب اور ماحول میں خوشگواری بغیر اتباع شرع کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ آج لوگوں کے پاس سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، مال دولت کی ریل پیل ہے، کوٹھیوں بنگلوں کی بہتات ہے، عہدوں اور ڈگریوں کی بھرمار ہے، اگر کمی ہے تو پاکیزہ تعلیمات اور اعلیٰ اخلاق کی، اور اسی وجہ سے زندگیوں سے چین وسکون رخصت ہو چکا ہے۔ بھائی بھائی سے بولنے کو تیار نہیں، ماں کو اولاد سے شکایت ہے، بیٹے کو والدین سے شکایت ہے، ہر ایک دوسرے کی شکایت کرتا ہے، لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ جس قوم کے پاس قرآن ہو وہ پریشان کیوں ہو۔ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس کے متعلق اسلام نے واضح رہنمائی نہیں کی۔ وہ کونسا سوال ہے جس کا جواب ہمارے مذہب نے نہیں دیا۔ وہ کونسی بیماری ہے جس کا علاج نہیں بتایا۔ وہ کونسی بحث ہے جسے تشنہ چھوڑ دیا۔ وہ کونسی الجھن ہے جس کو نہیں سلجھایا۔ حق یہ ہے کہ سارے مسائل ومشاکل ہماری ہی پیدا کردہ ہیں۔ قرآن وحدیث مکمل ہے، بس عمل کرنے کی دیر ہے۔

ہماری مثال اس آدمی کی سی ہے جسے اپنی بیماری کی دوا معلوم ہے، اور وہ اس کے پاس موجود بھی ہے، لیکن استعمال کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔ اس کا کوئی کیا علاج کرسکتا ہے؟ دوا تو استعمال کرتا نہیں، بد پرہیزی کر کے مزید بیماریاں اپنے ہاتھوں پیدا کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ﴾ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نہ چاہو اور ہم زبردستی تم پر تھوپ دیں؟ کرنا تو ہمیں ہی پڑے گا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: تم تو دہکتی آگ میں کودنے کے چکر میں ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تم کو بچا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی ہمارے لیے کیا کرسکتا ہے۔

اسلامی نبوی مقدس تعلیمات کا جو گلدستہ امام نوویؒ نے تیار کیا تھا اس کو مہکانے اور اس کی خوشبو پھیلانے کا سلسلہ پچھلے کئی سالوں سے سورت میں حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دام مجدہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللھم زدفزد۔ اس عرصہ میں ''ریاض الصالحین'' مکمل ہو کر اب ''الادب المفرد'' کا درس جاری ہے۔ فللّٰہ الحمد. درس حدیث کی ان پُرنور مجالس میں احادیثِ رسول کے ترجمہ وتشریح کے ضمن میں علمی و عملی اور الہامی والقائی مضامین کا جو دریا بہتا ہے اس پر تبصرہ کرنا کسی کی بساط نہیں ہے۔

''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی پانچ جلدیں منظر عام پر آ کر جو مقبولیت حاصل کرچکی ہیں وہ اس سلسلہ کی کامیابی اور قبولیت کی بین دلیل ہے۔ اب اس سلسلۃ الذہب کی اگلی کڑی یعنی چھٹی جلد پیشِ خدمت ہے۔ اس کے عنوانات یہ ہیں:

۱	بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ	والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید
۲	تَحْرِيمُ الْعُقُوقِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ	والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت

۳	فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ	والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید
۴	إِكْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ	اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت
۵	تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ	علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا
٦	زِيَارةُ أَهْلِ الْخَيْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ	نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا
۷	فضلُ الحُبِّ فی اللهِ والحثِّ علیه	اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید
۸	علاماتُ حبِّ اللهِ تَعَالىٰ الْعَبْدَ	اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں
۹	اَلتَّحْذِيْرُ مِنْ اِيْذَآءِ الصَّالِحِيْنَ وَالضُّعْفَةِ وَالْمَسَاكِيْنَ	نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا
۱۰	اِجْرَآءُ أَحْكَامِ النَّاسِ عَلىٰ الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ اِلىٰ اللهِ	ظاہر کے مطابق معاملہ کرو۔ دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

یہ کل دس موضوعات ہیں، انداز تو وہی حسب سابق ہے موضوع کے مناسب آیات وروایات اما نوویؒ منتخب فرما گئے ہیں جن کا ترجمہ وتشریح حضرت اقدس دامت برکاتہم انتہائی سادہ اور عام فہم انداز میں فرماتے ہیں۔ کیوں کہ مجمع میں علماء کے علاوہ عوام بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں، مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق بات بھی سمجھنا کسی کے لیے کچھ مشکل نہیں رہتا۔ بہت سی احادیث ایسی آتی ہیں جن کا ترجمہ وتشریح پہلی بار اتنا واضح اور صاف ستھرا سننے ملتا ہے، اور ضمنی علمی فوائد، مثالیں اور جواہر پارے اس کے علاوہ ہیں۔

ان دس موضوعات میں سے ہر موضوع سبق آموز نصائح وواقعات اور علمی وعملی فوائد پر مشتمل ہے، بہت سے نادر افادات ایسے ہیں جن کو الہامی والقائی قرار دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا، اور بات کو مثالوں سے واضح کرنے کی جو خوبی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے بعد ان کے حقیقی ورثاء کو عطا فرمائی ہے، اس کے بہت سے نمونے اس جلد میں نظر سے گزریں گے۔

جس شخص کو امت کا فکر دامن گیر ہوتا ہے اس کی احوال امت پر نظر بھی ویسی ہی گہری ہوتی ہے۔ نفسیات کی صحیح تشخیص اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت دام مجدہم کو خصوصی دین ہے، اس کا تجربہ طالب علمی کے زمانہ سے ہو رہا ہے، اور الحمدللہ یہ ملکہ ترقی پذیر ہی ہے۔ اس مجموعہ میں بھی دوران مطالعہ اندازہ ہوگا کہ امت کی کتنی صحیح نباضی فرمائی ہے۔ اولاد کی تربیت کے معاملہ میں آپ کی نگاہ کتنی دوررس اور باریک بیں ہے اس کا اشارہ ''توقیر العلماء'' والے مضمون کے بعض ضمنی افادات میں ملے گا۔

اس کے علاوہ حضرت موسیٰ وخضر کے قصہ کے ضمن میں تکوینیات وتشریعیات کی تشریح بھی انوکھی ہے۔

صلہ رحمی کے تعلق سے ہم میں کیا کوتاہیاں در آئی ہیں، اس کے مقابلہ میں شریعت کی اعلیٰ تعلیمات کیا ہیں، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم کتنا تاکیدی ہے، ان کی نافرمانی اور ایذارسانی کتنی خطرناک چیز ہے، رشتہ توڑنے پر کیا وعیدیں ہیں؛ یہ اموراس جلد کے پہلے دو مضامین میں پڑھنے ملیں گی۔ عربی زبان کے مشکل مفردات کو آسان بنا کر پیش کرنا بھی ایک خاص چیز ہے۔

کوئی والدین کا کما حقہ حق ادا نہ کرسکا، اب وہ نہ رہے تو ان کے حق کی ادائیگی کی کیا شکل ہے؟ وہ بھی اسلام نے بتائی ہے۔ یہ ہے مذہبِ اسلام کی جامعیت۔

شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے کیسے کیسے حربے آزماتا ہے، وہ بھی جگہ جگہ پڑھنے ملے گا۔

آیات وروایات کی تشریح کے ساتھ موقع ملتے ہی حضرت معاشرہ میں پنپ رہے منکرات پر تنبیہ بھی بحسن وخوبی فرماتے چلتے ہیں۔ ایسے بھی کئی نمونے ملیں گے ''ماں باپ کی تقسیم کا دردناک منظر'' وغیرہ عنوانات کے تحت ایسی چیزیں موجود ہیں۔

امام نوویؒ کے انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ باب سے متعلق قولی روایات کے علاوہ فعلی روایات بھی لی ہیں، یہ مہمیز بنتا ہے جذبۂ عمل کے لیے۔ آنحضور علیہ السلام نے جن امور کی تاکید اپنے ارشادات سے فرمائی، ان پر عمل کر کے بھی بتایا، اس کا اپنا اثر ہے۔

سابقہ مجموعوں کی طرح اس مجموعہ میں بھی مضمون کی مناسبت سے فقہی مسائل منفرد شان سے بتاتے چلے ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس فرمائی اپنی بات کی تائید میں اسلاف کے معمولات وواقعات پیش فرمادیئے۔ گھریلو اور خاندانی امور میں ہونے والی کوتاہیوں پر نقد وتبصرہ کا حضرت کا اپنا ہی انداز ہے۔ اس مجموعہ میں دیگر افادات کے علاوہ ہمارا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار کیوں ہے، اس کے باطنی اسباب کیا ہیں، علاج کیا ہے؛ خاص چیز ہے۔

عنوان ''اگر روحانی توجہات چاہئیں'' کے تحت سادات پر بات چلی تو حق ادا فرمادیا۔ پھر کئی سبق آموز واقعات سنائے۔

اس کے علاوہ اس مجموعہ میں جو خاص طور پر پڑھنے اور توجہ دینے کی چیزیں ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) توقیر العلماء کو اس مجموعہ کی روح کہا جاسکتا ہے۔ پورا ہی مضمون بہت دھیان سے پڑھنے کا ہے، کیوں کہ فیہ مافیہ۔

(۲)عنوان ’’صحبت کا کردار‘‘ اور ’’زندگی بھر روتے رہے‘‘۔

(۳)اخیر میں تصوف وسلوک کے مناسب انمول افادات طالب توجہات ہیں۔

(۴)عنوان ’’اسی سے ترقی ہوتی ہے‘‘ پڑھنے والی چیز ہے۔

(۵)موقعہ ملا تو ردِّ شیعیت سے بھی دریغ نہیں فرمایا۔ ’’خطبۂ غدیرِ خُم‘‘ کے ذیل میں موجود ہے۔

آپ کے اور کتاب کے درمیان اس سے زیادہ حائل نہیں بننا چاہتا۔ گستاخی کے لیے معافی خواہ ہوں۔ فقط

ابوزاہر

٦/جمادیٰ الاخریٰ۔۱۴۳۲ھ

۲۰۱۱/۵/۱۰ء

بِرُّ الْوَالِدَیْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

اور

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

۲۲/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۰/اپریل ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد: فأعوذ باللّٰہمن الشیطان الرجیم بسم اللّٰہالرحمن الرحیم۔وَاعْبُدُوااللّٰہ وَلاتُشْرِکُوْابِہٖ شَیْئاً وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً (النسآء ۳۶)

رشتہ داریاں دوطرح کی ہوتی ہیں

باب کاعنوان قائم کیا ہے ’’بِرُّالْوَالِدَیْنِ وَصِلَۃُالْاَرْحَامِ‘‘ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنااور صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ داری کونبھانا اوران کے حقوق کوادا کرنا، یہاں ان دونوں باتوں کو بتلانا ہے۔

’’رَحم‘‘ عربی زبان میں بچہ دانی کو کہتے ہیں،عورت کے پیٹ میں جہاں بچہ رہتاہے، اسے عربی میں رحم کہتے ہیں۔جورشتہ داریاں بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ساتھ میں لےکر دنیامیں آتاہے،ان ساری رشتہ داریوں کے لیےلفظ رحم بولا جاتاہے،مثلاً جب بچہ پیداہوتاہےتو پیداہوتے ہی وہ کسی (ماں باپ) کا بیٹاہوتا ہے، بھائی بہن دادادادی، نانا نانی، چچاماموں، خالہ پھوپھی؛ یہ ساری رشتہ داریاں وہ ہیں جو بچہ دنیامیں لے کرہی آتا ہے۔ایسی بات نہیں ہوتی کہ یہاں آنے کے بعدکوئی رابطہ قائم ہوا ہواور کانٹیکٹ ہوا ہو،جس کے نتیجہ میں رشتہ بنا ہو،اس لیے کہ کچھ رشتہ داریاں دنیامیں آنے کے بعد قائم ہوتی ہیں،مثلاً کسی عورت کے ساتھ نکاح ہوا تو وہ اس کی بیوی

بنی اور یہ اس کا شوہر بنا، اُس کے ماں باپ اِس کے ساس سسر بنے اور اِس کے ماں باپ اُس کے حق میں ساس سسر ہوئے، اور اس کے نتیجہ میں دوسرے بھی بہت سارے رشتے پیدا ہوئے۔ یہ رشتے بعد میں ایک تعلق قائم کرنے کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں، اس کو سسرالی رشتہ کہا جاتا ہے، قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَهُوَالَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَراً فَجَعَلَهٗ نَسَباًوَّصِهْراً﴾ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے پانی سے یعنی ماں باپ کے نطفہ سے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو نسبی رشتوں والا اور سسرالی رشتوں والا بنایا۔ یہی دو طرح کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں، ایک تو پیدا ہوتے ہی لے کر آتا ہے جیسا کہ اوپر بتلایا وہ تمام نسبی رشتہ داریاں کہلاتی ہیں، اور بعد میں جا کر نکاح کے ذریعہ جو رشتے قائم ہوتے ہیں وہ سسرالی رشتہ داریاں کہلاتی ہیں۔

صلہ رحمی کسے کہتے ہیں؟

تو عربی زبان میں لفظ رحم ان رشتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو پیدا ہوتے ہی بچہ نسبی طور پر اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے، اور ان رشتہ داریوں، ان قرابتوں اور ان سگائیوں کا خیال رکھنا اور ان میں سے ہر ایک کے حقوق ان کے درجے کے مطابق ادا کرنا؛ اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''صلہ رحمی'' ہے۔ جیسا جیسا جس کا درجہ اسی کے مطابق اس کا حق ہوا کرتا ہے۔ ماں باپ کا حق جتنا ہے، بھائی بہنوں کا اتنا حق نہیں ہوسکتا یہ بات ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن یہ سب رشتے وہی ہیں جو پیدا ہوتے ہی بچہ لے کر آیا ہے۔ یہ جتنی بھی نسبی رشتہ داریاں ہیں ان کو رحم کہا جاتا ہے اور ان رشتہ داریوں کا خیال رکھنا، ان کے حقوق ادا کرنا، ان کو نبھانا، ان کو باقی رکھنا، ان کو اور زیادہ مضبوط بنانا، اور ان رشتہ داریوں کی وجہ سے جو تعلقات قائم ہوئے ہیں ان کا لحاظ

کرنا؛ ان ساری چیزوں کو ''صلہ رحمی'' کہتے ہیں۔

صلہ رحمی کی مختلف شکلیں

اب صلہ رحمی مختلف طریقوں سے ہوتی ہے، مثلاً ماں باپ محتاج ہیں تو ان کا خرچ برداشت کرنا، ان کی خدمت کرنا وغیرہ۔ یعنی صلہ رحمی کے بھی درجات ہیں، صلہ رحمی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ پیسے ہی دیں، کھانا ہی کھلائیں، شریعت نے خود اس کے درجات متعین کئے ہیں، کس کس کا نفقہ اور خرچہ کس پر واجب ہے اور کب واجب ہے، یہ سارے مستقل مسائل ہیں، اس میں آپ کو خود سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے لیے تو آسان راستہ ہے کہ آپ کسی بھی مفتی سے یا کسی بھی دارالافتاء سے رابطہ قائم کر کے پوچھ سکتے ہیں کہ میرا فلاں رشتہ دار ہے، اس کا یہ معاملہ ہے، تو اب مجھ پر اس کا کتنا حق ہے؟ ان شاء اللہ اس کی ساری تفصیل آپ کو وہاں سے معلوم ہو جائے گی۔ بعض رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں جو آپ کی مدد کے محتاج نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دولت سے نواز رکھا ہے، ان کے پاس بھی اپنی ضرورت کے بقدر چیزیں موجود ہیں، اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ان کو کھانا کھلائیں، لیکن ان سے ملاقات کریں، ان کی خیریت پوچھیں، ان سے سلام کلام کریں؛ یہ بھی صلہ رحمی کا ایک درجہ ہے۔

باب کے عنوان کا خلاصہ

بہرحال! مَیں یہ عرض کرر ہا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں دو باتیں بتانا چاہتے ہیں ایک تو ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور دوسرا صلہ رحمی۔ مَیں جب بھی لفظ ''صلہ رحمی'' بولوں گا اس کا مطلب وہی ہوگا جو ابھی مَیں نے تفصیل سے بتلایا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی نسبی طور پر جو رشتہ داریاں

اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے، ان کا لحاظ کرنا اسی کا دوسرا نام ''صلہ رحمی'' ہے۔ اوران کالحاظ نہ کرنا، ان کے حقوق کوادانہ کرنا؛ اسی کا دوسرانام ''قطع رحمی'' ہے۔ اگرآپ ان دونوں کا ترجمہ کریں گے تو صلہ رحمی یعنی رشتہ داری کوملانا اور جوڑنا۔ اور قطع رحمی یعنی رشتہ داری کوتوڑنا۔ تو آدمی ان کے حقوق کو جب ادانہیں کرے گا، تو رشتہ داری کہاں قائم رہے گی، اسی کوقطع رحمی سے تعبیرکیا گیا۔ تو صلہ رحمی کا مطلب ہے رشتہ داری کے حقوق ادا کرنا اوراس کے تقاضوں کو پورا کرنا۔ اور قطع رحمی کا مطلب ہے ان تقاضوں کو پورانہ کرنا۔

اب ان رشتہ داریوں میں پہلی اور بنیادی رشتہ داری ماں باپ کی ہے، اس لیےانہوں نے ''بِرُّالْوَالِدَيْنِ'' کالفظ الگ استعمال کیا، اس لیے کہ ماں باپ ہی ہیں جن کے ذریعہ سب کے ساتھ تعلق قائم ہوا ہے۔ ماں اور باپ رشتہ داری کے اندر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، باقی سب رشتوں کے لیے یہی دونوں واسطہ بنتے ہیں۔ دادا یعنی باپ کا باپ، دادی یعنی باپ کی ماں۔ نانا یعنی ماں کا باپ، نانی یعنی ماں کی ماں۔ بھائی یعنی باپ کا بیٹا۔ بہن یعنی باپ کی بیٹی۔ بھتیجا یعنی باپ کے بیٹے کا بیٹا۔ بھتیجی یعنی باپ کے بیٹے کی بیٹی۔ بھانجا یعنی باپ کی بیٹی کا بیٹا۔ بھانجی یعنی باپ کے بیٹی کی بیٹی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی رشتہ میں بیچ میں ماں یاباپ کا واسطہ ضرور آئے گا۔ یہ سب تو براہِ راست رشتہ داریاں ہوئیں۔ پھران سے جو پیدا ہوئے وہ دوسرا سلسلہ ہوجائے گا، ان میں واسطہ اس کے نیچے والے بنیں گے۔ تو رشتہ داریوں میں بنیادی حیثیت ماں اور باپ کی ہے اس لیے انہوں نے والدین کوالگ سے ذکرکیا کہ ماں باپ اوردوسرے رشتہ داروں کے حقوق کوادا کرنا۔

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں اپنی عادت کے مطابق کچھ آیتیں

اوراحادیث پیش کرتے ہیں۔پہلی آیت تو وہی ہے جو پچھلے باب میں پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلہ میں آچکی ہے ﴿وَاعْبُدُوااللّٰہ وَلاتُشْرِکُوابِہٖ شَیْئًاوَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ چوں کہ اس آیت میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور رشتہ داروں کا خیال رکھنے کی تاکید ہے، اس لیے پہلے اسی آیت کو پیش کیا ہے،اس کی تفصیلی وضاحت مَیں گذشتہ مجلس میں کر چکا ہوں۔

خصوصی تاکید کا ایک نرالا انداز

دوسری آیت پیش کی ہے ﴿وَاتَّقُوااللّٰہ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ یہ اس آیت کا ایک ٹکڑا ہے جو خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے،جس میں صلہ رحمی کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ڈرو تم اس اللہ تعالیٰ سے جس کے واسطہ سے تم آپس میں ایک دوسرے سے اپنی ضرورتوں کو مانگتے ہو۔شروع آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرنے والے اور پالنے والے ہیں اوراس کے بعد بھی تم زندگی کے مختلف مرحلوں پر اپنے کام نکالنے کے واسطے اس کا نام استعمال کرتے ہو جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ بھائی! اللہ کے واسطے میرا یہ کام کر دینا۔ یہاں اللہ کا نام استعمال کیا گیا ہے اسی طرح موقع بموقع انسانوں سے اپنے کام نکالنے کے لیے اللہ ہی کا نام بیچ میں لاتے ہو اوراسی کا واسطہ دے کر سامنے والے کو دبانے کی کوشش کرتے ہو اوراس سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتے ہو۔تو جس کا نام لے کر تم دوسروں سے اپنا حق مانگ رہے ہو؛ اب تم خود ہی اگر اس سے نہ ڈرو اور دوسروں کا حق ادا نہ کرو تو یہ کیسی بات ہوئی؟ اسلیے یہاں خاص طور پر تاکید کی گئی ﴿وَاتَّقُوااللّٰہ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ﴾ تم اس اللہ سے ڈرو اوراس کے احکام کو پورا کرو جس کے واسطہ سے تم آپس میں ایک

دوسرے سے سوال کرتے ہو۔

جیسے کوئی آدمی اپنا کام تمہارا نام لے کر کسی دوسرے سے نکلوائے اور آپ کو پتہ چلے مثلاً آپ کے کسی دوست نے بتایا کہ فلاں صاحب آپ کا نام لے کر میرے پاس آئے تھے، تو آپ کی وجہ سے مَیں نے اس کا کام کردیا۔ اب آپ اس آدمی سے جس نے آپ کا نام لے کر اپنا کام کروایا تھا کوئی بات کہیں اور وہ نہ مانے؛ تو آپ کیا کہیں گے؟ واہ بھائی واہ! میرا نام کیش کرکے تو تو نے اپنا کام کروالیا اور اب مَیں جو کہتا ہوں وہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ صاف طور پر تاکید فرماتے ہیں کہ اے لوگو! اس اللہ سے ڈرو، اس کے احکام پر عمل کرو؛ جس کا نام لے کر اور جس کا واسطہ دے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور اپنی ضرورتیں پوری کرواتے ہو۔ جب اپنے کام کا وقت تھا تو اس کے نام کا واسطہ دے کر کام نکلوایا؛ اور اب جب اس کے احکام کو پورا کرنے کا وقت آیا تو پیچھے ہٹتے ہو؛ یہ کوئی بات ہوئی؟ یہ بھی خصوصی تاکید کا ایک انداز ہے۔

پھر آگے فرمایا ﴿وَالْأَرْحَامَ﴾ اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرنے سے ڈرو، تمہارے ہاتھوں رشتہ داریوں کے حقوق برباد نہیں ہونے چاہئیں۔

ڈبل پیمانے کیسے؟

بعض حضرات نے اس آیت کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم آپس میں سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں سے بھی ڈرو جن کا واسطہ دیتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رشتوں کا واسطہ دیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں ارے! آپ تو میرے چچا ہیں، آپ تو فلاں عزیز کے دوست ہیں، اس کا خیال کیوں نہیں

کرتے؟ تو جس طرح اللہ کے نام کو بیچ میں لاتے ہیں، اسی طرح کبھی کبھی رشتہ داری کو بھی بیچ میں لاتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنا کام نکالنے کے لیے تو رشتہ داری کا واسطہ دیا اور جب خود اس کا حق ادا کرنے کا وقت آیا تو یہ پیچھے ہٹ کیسی؟ اسی رشتہ داری کا ناتہ اور دُہائی دے کر دوسروں سے تو اپنا حق نکال لیا، اور اب اسی رشتہ داری کو بھول گئے کہ ان کے حقوق ادا نہیں کرتے، اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے؛ یہ کیسی بات ہوئی؟ یہ ڈبل پیمانے کیسے ہیں؟۔

تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کو رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرنے کی خاص تاکید کرنے کے لیے پیش فرمارہے ہیں کہ رشتہ داریوں اور سگائیوں کے حقوق کو برباد کرنے سے اور ضائع کرنے سے بچو اور ڈرو، تمہارے ہاتھوں رشتہ داری کا حق کا ضائع نہیں ہونا چاہیے، اس کے تقاضوں کو پورا کرو۔

عقل مندوں کے کچھ اوصاف

ایک اور آیت پیش کی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآأَمَرَاللّٰهُ بِهٖ أَن يُّوْصَلَ﴾ "أولوا الألباب" یعنی سمجھ دار اور عقل مند کون ہیں؟ ہم نے دنیوی لائن سے عقل مندوں کے کچھ اوصاف متعین کردئے ہیں اور انہی باتوں کو معیار بنا کر ہم کہتے ہیں کہ فلاں بڑا عقل مند ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی عقلمند کا لفظ استعمال کرکے اس کے کچھ اوصاف مقرر کئے ہیں اور یہاں ان کو ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک وصف یہ ہے کہ عقل مند وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں اور وعدے کو توڑتے نہیں۔ آج کل تو جو آدمی بار بار وعدے کرکے لوگوں کو جتنا زیادہ چکر میں ڈالے؛ اس کو لوگ عقلمند اور بڑا ہوشیار کہتے

ہیں لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو عہد و پیمان کو پورا کرے، وہ عقل مند ہے۔

عقل مندوں کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ لوگ جوڑتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور کس چیز کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ رشتہ داریوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو یہ لوگ بھی ان کے حقوق کو ادا کر کے اور ان کے تقاضوں کو پورا کر کے رشتہ داریوں کو قائم رکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ رشتہ داریوں کے تقاضوں کو پورا کرنا اور ان کے حقوق کو ادا کرنا؛ قرآن کی اصطلاح میں آدمی کے عقل مند ہونے کی علامت ہے۔

ماں باپ کے ساتھ اچھے سلوک کا تاکیدی حکم

آگے ایک اور آیت سورۂ عنکبوت کی پیش فرمائی ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ پچھلی مجلس میں بھی بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور بہت ساری آیتوں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا، اس کے ساتھ فوراً ہی ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم بھی جوڑ دیا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی بتلائی تھی کہ انسان کے وجود میں آنے کا حقیقی ذریعہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے لیکن مجازی طور پر اگر دیکھا جائے تو ظاہری سبب تو ماں باپ ہی بنتے ہیں، اس لیے ان کے حق کو ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

ایمان افروز واقعہ

اور اس آیت کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ جب وہ اسلام لائے، اس وقت تک ان کی

والدہ مسلمان نہیں ہوئی تھی، اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے بڑے فرمانبردار اور اطاعت شعار تھے۔ ان کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ میرا بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو کہنے لگی کہ مَیں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گی جب تک تو اسلام کو چھوڑ نہ دے اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور بھوک ہڑتال کر دی۔ اب یہ سمجھا بھی رہے ہیں کہ کھانا کھا لو لیکن وہ کہہ رہی ہے کہ تو نے نیا مذہب کیوں قبول کیا؟ جب تک تو اس کو نہیں چھوڑے گا وہاں تک میں نہیں کھاؤں گی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ماں مانتی نہیں ہے تو کہا کہ دیکھو اماں! تمہاری ہر بات پر مَیں جان دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن اگر تم اپنی جان اس لیے قربان کر رہی ہو کہ مَیں ایمان کو چھوڑ دوں؛ تو یہ کبھی ہونے والا نہیں ہے، اگر تمہیں کھانا ہے تو کھاؤ؛ ورنہ جیسا تمہیں کرنا ہو کرو۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نے انسان کو تاکید کی کہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ اگر وہ شرک کا حکم دیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کی جائے۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۰۵ ـ ۴/ ۱۵۷، بحوالہ مسند ابو داود طیالسی و مسلم۔ اصحاب سنن سوائے ابن ماجہ)

دیکھئے! اسلام نے تو کسی کی بھی اطاعت و فرمانبرداری اس شرط کے ساتھ مشروط کر دی ہے، اور ہر جگہ یہ قید لگا دی ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، وہاں ہی ان کی بات مانی جائے گی۔

مسلمان ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا حکم دیکھتا ہے

مَیں پہلے بھی کسی موقعہ پر بتلا چکا ہوں کہ مسلمان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتا ہے، مسلمان ماں باپ کی خدمت اس لیے کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسلمان بیوی بچوں کا خیال اس لیے رکھے گا کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کا خیال رکھنے کا اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، مسلمان بھائی بہنوں کے، دادا دادی، نانا نانی، رشتہ دار، پڑوسی، دوست احباب وغیرہ جن کے بھی حقوق ادا کرتا ہے وہ اس لیے کہ ان سب کے حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں۔ گویا اس نے تو اسلام قبول کر کے اور ایمان لا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کے حوالہ کر دیا ہے، اور اسی کے ساتھ تعلق قائم کر لیا ہے، اب وہاں سے جو حکم ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ کام کرتا ہے، اس کا اصل تعلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، اس لیے ہر کام میں وہ پہلے یہی دیکھے گا کہ وہاں سے کیا حکم ہے؟ وہاں سے جو حکم ہوگا اسی کے مطابق وہ معاملہ کرے گا۔

ایک بہترین مثال

اس بات کو سمجھنے کے لیے مَیں ایک مثال دیتا ہوں۔ جیسے آپ کے گھر میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو اس کا اصل تعلق تو ایکسچینج سے ہے، اس سے دنیا میں جہاں جہاں بھی آپ ٹیلیفون کریں گے تو پہلے اس کا رابطہ ایکسچینج سے ہوگا، بلکہ آپ کے جس پڑوسی کی دیوار بالکل آپ کی دیوار سے لگی ہوئی ہے، اس کے نمبر پر بھی آپ اپنے گھر کے نمبر سے فون لگائیں گے، تو اگرچہ اس کے گھر کا راستہ آپ کے گھر سے چند منٹ کے فاصلہ پر ہے، اور ایکسچینج کا راستہ آدھا گھنٹہ کے فاصلہ پر ہے، لیکن آپ کے نمبر سے فون سیدھے اس کے نمبر پر نہیں جائے گا بلکہ آپ کا فون پہلے ایکسچینج میں جائے گا اور وہاں سے اس کے نمبر پر جائے گا۔

اسی طرح ہمارا پہلا رابطہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، پھر ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، استاذ شیخ وغیرہ کے ساتھ ہے، اور ان کے جو بھی حقوق بتلائے ہیں اور

جن کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرنے کو کہا ہے، یا جن کی بات ماننے کے لیے ہمیں پابند بنایا گیا ہے؛ ان تمام احکام کو پورا کرنے کے لیے رابطہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بن رہی ہے۔ ہمیں یہی خیال آتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوجائے، ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے کٹنا نہیں چاہیے۔ جیسے ٹیلیفون ایکسچینج سے اگر ہمارا رابطہ کٹ گیا تو پھر پڑوس والے گھر سے بھی رابطہ نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ تعلق ایکسچینج کے واسطہ سے ہے۔ تو اصل تو یہ ہے کہ ماں باپ وغیرہ کوئی بھی ہو؛ ان کی بات ماننے کے لیے مدار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو

حدیثِ پاک میں ہے ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ“ (الدرالمثور ۲/ ۱۷۷، بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ) جہاں خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو وہاں کسی بھی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ جس مخلوق کی فرمانبرداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اسی کی ہم فرمانبرداری کر رہے ہیں، اب وہی مخلوق اگر خالق کی نافرمانی کروانا چاہتی ہے؛ تو بھلا اس کی بات کیسے مانی جاسکتی ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں کی بات مان کر چلنا اور پھر وہی آپ سے یوں کہے کہ اس کے ساتھ تعلق مت رکھیو، تو آپ کیا کہیں گے کہ ارے بھائی! تیری بات تو مَیں اس لیے مانتا ہوں کہ اُسی نے کہا ہے، اور اب تو مجھے اُسی سے تعلق رکھنے سے منع کر رہا ہے؟ یہ کیسی بات ہوئی۔ بات سمجھانے کے لیے مَیں نے ایک مثال دی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے سب کچھ کرتا ہے، اسی لیے حضور ﷺ نے ایک اصول بتلا دیا کہ کسی بھی مخلوق کی -چاہے وہ ماں ہو یا باپ ہو یا اور کوئی بڑے سے بڑا ہو- بات ایسی چیز میں نہیں مانی

جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہورہی ہو۔

ارے دوسرے تو دوسرے ہیں، خود حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ آپ کی بات بھی وہاں نہیں مانی جائے گی جہاں شریعت کی خلاف ورزی ہورہی ہو، حالانکہ حضور ﷺ سے بھلا ایسا ہونا کیا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔قرآنِ کریم میں سورۂ ممتحنہ میں مؤمن عورتوں کی بیعت کا تذکرہ ہے ﴿یَـٰأَیُّهَاالنَّبِیُّ اِذَاجَآءَ كَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰیٓ أَنْ لَّایُشْرِکْنَ بِاللّٰهِ شَیْئًاوَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَایَأْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ أَیْدِیْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَایَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ اے نبی! مؤمن عورتیں جب آپ کے پاس ان کاموں پر بیعت ہونے کے واسطے آویں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور بہتان تراشی نہیں کریں گی اور نیکی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ یہاں ﴿فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ کی قید لگائی ہے یعنی حضور ﷺ کی بات ماننے کا مسئلہ ہے حالانکہ ہر آدمی مانتا ہے کہ اللہ کا رسول کبھی کسی ایسی بات کا تو حکم دے ہی نہیں سکتا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو، پھر بھی یہاں ﴿فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ کی قید لگائی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ دراصل لوگوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ کسی کی بھی اطاعت اگر کی جائے گی تو نیکی کے کاموں میں اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہی کی جائے گی (تفسیر مظہری ۹/ ۲۶۷) جب نبیٔ کریم ﷺ کو کہا جارہا ہے ﴿وَلَایَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ تو پھر ہما شما کا کیا حال ہوگا۔قرآنِ کریم کی اس آیت نے تو بہت واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کردیا ہے۔اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ”لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةٍ، اِنَّمَاالطَّاعَةُ فِیْ مَعْرُوْفٍ“ کسی کی بھی بات

اسی وقت مانی جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ ماں باپ اگر کسی ایسی چیز کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو ان کے اس حکم پر عمل کرنا واجب تو کہاں ہوتا؛ جائز ہی نہیں ہے۔

والدین کے بوڑھاپے کا پورا لحاظ رکھو

ایک اور آیت پیش کی ہے ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ أَن لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ اور تیرے رب نے اس بات کا حکم دیا کہ صرف اُسی کی عبادت کی جائے اور والدین کے ساتھ اچھائی کا سلوک کرنے کا حکم دیا ﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾ اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو ''ہوں'' بھی مت کہو۔ جب عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو آدمی کی عقل پر ذرا اثر پڑ جاتا ہے، عقل میں فتور آ جاتا ہے اور وہ باتیں بھول جایا کرتا ہے۔ مثلاً ابا جان سو سال کے بوڑھے ہو گئے تو بعض دفعہ ایسی باتیں کرتے ہیں جس کا نقشہ خود قرآنِ کریم نے کھینچا ہے ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ اخیری عمر میں آدمی کو بہت ساری چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد کوئی ملنے والا آیا تو کہنے لگے کہ آج تو گھر والوں نے کھانا نہیں کھلایا۔ اب گھر والے کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو کھلایا اور یہ دوسروں کے سامنے ہماری شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو نہیں کھلایا۔

خیر! باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو ''ہوں'' تک مت کہو، یعنی آپ کی طرف سے ''ہوں'' کا لفظ بھی ان کے لیے شدید تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور ان کو جھڑکو مت اور ان سے اچھی اور نرم بات کرو، چاہے وہ کچھ بھی کریں لیکن آپ کی طرف سے جواب

میں کوئی ایسی نامناسب بات ہونی نہیں چاہیے، آپ تو ان کی عمر کے تقاضہ کا پورا لحاظ رکھیے۔

ایک سوال، دو ردِّ عمل

کسی کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا وہ سنا دوں: کہ ایک مرتبہ ایک بڑے میاں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، صاحبزادے بھی پاس میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک کوّا بول رہا تھا تو بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا! جو پرندہ بول رہا ہے یہ کیا ہے؟ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! یہ کوا ہے، تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا کہ بیٹا! جو بول رہا ہے، یہ کیا ہے؟ تو کہا کہ ابا! یہ کوا بول رہا ہے، تیسری مرتبہ پوچھا تو بیٹے کے آواز میں تیزی آئی کہ ابا جان! کوّا بول رہا ہے۔ پھر چوتھی مرتبہ پوچھا تو بیٹے نے ذرا چِلّا کر کہا کہ کہہ تو دیا کہ کوا بول رہا ہے۔ پھر پانچویں مرتبہ پوچھا تو بیٹا غصہ سے کہنے لگا کہ کتنی مرتبہ جواب دیا کہ کوا ہے، کوا ہے، کوا ہے اور کتنی بار پوچھیں گے۔

خیر! اب ابا جان گھر میں گئے اور اپنی ایک ڈائری لے کر آئے، اور کسی تاریخ کا صفحہ نکالا اور کہا کہ بیٹا! پڑھو، اِس میں کیا لکھا ہے؟ تو اس میں لکھا تھا کہ آج مَیں صحن کے اندر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ تین چار سال کی عمر کا میرا بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا اور قریب ہی ایک درخت پر ایک کوّا بیٹھا ہوا بول رہا تھا تو اس بچے نے پوچھا کہ ابا جان! یہ کیا ہے؟ مَیں نے کہا کہ بیٹا! یہ کوّا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ اس نے پوچھا تو میں نے کہا کہ بیٹا! یہ کوّا ہے۔ یہاں تک کہ پچیس مرتبہ اس نے پوچھا اور پچیس مرتبہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ یہ کوا ہے۔ اور آگے یہ جملہ لکھا ہوا تھا کہ ''اس کے بار بار کے اس سوال پر مجھے بڑا پیار آیا''۔ پھر کہا کہ بیٹا! ایسا ہی سوال تو نے بھی کیا تھا اور پانچ مرتبہ نہیں بلکہ پچیس مرتبہ کیا تھا اور مجھے تو تیرے اس سوال پر پیار آیا تھا، اور تجھے میرے پانچ مرتبہ پوچھنے پر غصہ آ گیا؟۔

ان کو ''اُف'' تک نہ کہو

بہر حال! یہاں قرآنِ پاک نے خاص طور پر تاکید کر دی کہ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے بوڑھاپے کی وجہ سے ان سے کوئی ایسی بات پیش آجائے جو آپ کی طبیعت کے خلاف ہو اور آپ کو ناگوار گزرے، تو ان کو ''اُف'' تک نہ کہو، اور ان کو جھڑکو مت، اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ ادب کا تقاضہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہیے، اور ان کے سامنے اپنی عاجزی کا بازو شفقت سے جھکائے رکھو یعنی زبردستی سے نہیں بلکہ شفقت و مہربانی کے ساتھ آپ ان کے سامنے جھکے جا رہے ہوں۔

﴿وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ اور اس سارے سلوک کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہو کہ اے اللہ! تو ان دونوں پر یعنی میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ گویا یہ سکھلایا گیا کہ اس سب کے بعد بھی تم ان کا حق تو ادا نہیں کر سکتے، اس لیے تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگو اور دعا کرو کہ اے اللہ! جیسے بچپن میں بڑی شفقت و محبت اور رحم کے ساتھ ان دونوں نے میری پرورش کی ایسے ہی تو بھی ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔

ماں باپ کی محبت ہی بے غرض ہوتی ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر جتنے بھی تعلقات اور جتنی بھی محبتیں ہیں، عام طور پر وہ سب غرض پر مبنی ہوتی ہیں، صرف ماں باپ کی محبت ہی ایسی ہے جو کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا، بلکہ اگر ڈاکٹروں نے یہ کہہ بھی دیا ہو کہ آپ کا بچہ زیادہ زندہ رہنے والا نہیں ہے، تو وہاں تو

اب یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ بڑا ہو کر بوڑھاپے کی لاٹھی بنے گا، پھر بھی جب تک وہ زندہ رہے گا، وہاں تک ماں باپ حقِ خدمت ادا کرنے میں اور اس کے ساتھ محبت وشفقت کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے حالانکہ اس سے کوئی غرض حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

بتلانا یہ ہے کہ ماں باپ کی محبت ہی ایسی محبت ہے کہ جو کسی غرض پر مبنی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں محبت ڈال دی ہے، اور اسی کی بنیاد پر وہ سارا سلوک کرتے ہیں۔ اب ہم ان کے ساتھ جو کچھ بھی کریں گے وہ سب اسی کا بدلہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا بدلہ جیسا چکانا چاہیے وہ ہم کبھی بھی چکا نہیں سکتے، اس لیے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سب کے باوجود یعنی آپ اُف بھی نہیں کریں گے، جھڑکیں گے بھی نہیں، اور ان کے ساتھ ادب سے بات چیت کریں گے، اور ان کے سامنے جھکے جھکے رہیں گے، پھر بھی ان کے حقوق کے جو تقاضے ہیں وہ پورے ادا نہیں کر سکتے، تو اب تمہارے لیے یہی ایک بات رہ جاتی ہے کہ ان کے لیے دعاءِ رحمت کرتے رہئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کے متعلق یوں سمجھیں کہ اس کے احسان کا بدلہ میں ادا نہیں کر سکتا تو اب آپ ہاتھ پھیلا کر دعا کریں گے کہ اے اللہ! میں تو اس کے احسان کا بدلہ ادا نہیں کر سکتا؛ تو ہی اپنے پاس سے ادا کر دے۔ اسی طرح یہاں بھی آپ کو سکھلایا گیا کہ اس سب کے باوجود آپ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے یہی ایک شکل رہ جاتی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے برابر یہ دعا کرتے رہو کہ اے اللہ! جیسے انہوں نے مجھے بچپن کے اندر شفقت ومحبت سے پالا تھا تو بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔

ماں نے تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلیں

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِىْ

عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کی تاکید کردی، اس کی ماں نے تکلیفوں پر تکلیفیں جھیل کر اس کو اُٹھایا اور پھر اس کو دو سال تک دودھ پلایا۔ اس لیے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی شکر ادا کرو۔ اس آیت میں ماں کی اُس خاص مشقت و تکلیف کا تذکرہ کیا گیا جو اُس نے زمانۂ حمل میں برداشت کی اور پھر دودھ پلایا اور دودھ چھڑانے کی تکلیف بھی اٹھائی۔ حالانکہ دودھ تو بچے کا چھڑایا جارہا ہے لیکن تکلیف ماں اٹھارہی ہے، اس کا بھی تذکرہ قرآنِ کریم میں کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ پسندیدہ عمل

٣١٢: عن أبي عبدالرحمن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَىٰ؟ قَالَ: اَلصَّلٰوةُ عَلٰى وَقْتِهَا۔ قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ، قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا۔ میں نے پوچھا: پھر؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ میں نے پوچھا: پھر؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

افادات: بہت ساری احادیث میں اسی قسم کا سوال مختلف حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اِس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضراتِ صحابہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی اور اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنے کا جذبہ کتنا زیادہ تھا، گویا ان کے دلوں میں ایک طلب اور تڑپ تھی کہ مجھے یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ کونسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے اور اس

کے کرنے سے مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا؛ تا کہ مَیں وہ کام کروں، اسی لیے وہ حضرات بار بار اس طرح کا سوال کیا کرتے تھے۔

ہم اور آپ سوال تو کیا کرتے بلکہ بغیر سوال کے ہی کسی کتاب میں پڑھ کر اگر یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں عمل اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند ہے کہ اس کو کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجائے گا؛ تو اس پر عمل کا ہم کتنا اہتمام کرتے ہیں؛ ہم خود ہی اپنے گریبان میں جھانک کر اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یہ تو حضراتِ صحابۂ کرام ہی کا ذوق و مزاج تھا، گویا ان کی طبیعتوں میں یہ بات رچی بسی ہوئی تھی، ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وہ تعلق و محبت اور وہ عشق تھا کہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی وہ حضرات اس کی طلب و جستجو میں رہتے تھے کہ ہمیں وہ عمل معلوم ہوجائے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اسی لیے آپ روایتوں میں بار بار پڑھیں گے کہ بہت سارے صحابہ نے یہی سوال حضور ﷺ سے پوچھا۔

ہمارے اور صحابہ کرام کے مزاج کا فرق

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا بڑا اونچا مقام ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ پوچھا۔ ویسے حضورِ اکرم ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھے بغیر جو اعمال بتلاتے تھے، ان پر تو وہ حضرات عمل کرتے ہی تھے، اس میں وہ حضرات کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے، مزید برآں وہ اپنی طرف سے یہ سوال کر رہے ہیں۔ ہم ہوتے تو سوچتے کہ جو بتایا گیا ہے وہی کیا کم ہے کہ مزید سوال کریں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، اور اُن حضرات کا مزاج یہ تھا کہ جو احکام دئے جاتے تھے ان کو تو بجا ہی لاتے تھے لیکن ساتھ ہی اپنی طرف سے اور بھی سوال پوچھتے تھے۔ یہ دراصل ذوق کی بات ہے۔ تو ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضراتِ صحابہ کرام کا جذبہ

شوق اوران کا مزاج کیا تھا۔

سوال ایک؛ جواب مختلف کیوں؟ ایک عمدہ مثال

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سوال کیا، اس کا جواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا جو آگے آ رہا ہے، اور یہی سوال دوسرے صحابی نے کیا تو ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا جواب دیا اور کسی تیسرے صحابی نے یہی سوال کیا تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ ہی جواب دیا۔ تو سوال ایک ہی ہے لیکن جواب مختلف ہیں؛ یہ آخر کیا بات ہے؟ سوال ایک ہونے کے باوجود جواب میں فرق کیوں ہے؟

اس بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لوگوں کی تربیت اور ان کا علاج کرنے کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو روحانی طبیب ہیں۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نوراللہ مرقدہٗ بڑے واعظ اور مقرر گزرے ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے، بڑے بزرگ اور عالم تھے، ان کے بیان کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ آج کل وعظ کا یہ طریقہ ہے کہ ایک بڑے مجمع کے سامنے وعظ کرنے والا آ کر نصیحت کرتا ہے؛ درحقیقت یہ اصولی علاج نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ حکیم اجمل خان صاحب کسی بڑے مجمع کے اندر آئیں اور تقریر کریں کہ ٹی بی کی بیماری ان اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس کا علاج اس طرح کیا جانا چاہیے اور اس میں فلاں چیزوں سے پرہیز کرو، اور اس میں فلاں چیزیں مفید ہیں اور فلاں چیزیں مضر ہیں، یہ ساری تفصیل ایک گھنٹہ تقریر کر کے ایک بڑے مجمع میں بتلا دیں۔ تو اب آپ ہی بتلائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے یہ تقریر کس کے حق میں مفید ہوگی؟ صرف ٹی بی کے مریضوں کے لیے ہی مفید ہوگی، بقیہ کے لیے وہ کسی کام کی نہیں ہے۔

علاج کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ حکیم صاحب اپنے مطب میں اپنی مسند پر بیٹھیں اور بیماروں سے کہہ دیا جائے کہ باہر بیٹھو اور ایک ایک کر کے آ کر ملاقات کرو، اور حکیم صاحب کے سامنے اپنی اپنی بیماری بتاؤ، وہ آپ کی بیماری کی تفصیل سن کر اس کے علاج کے طور پر دوا اور پرہیز بتائیں گے، جب ایک رخصت ہوگا تو دوسرا آئے گا، پھر تیسرا آئے گا۔ مطب کا اصل طریقہ یہی ہے۔

اسی طرح یہ بھی روحانی مطب ہے، اور روحانی طبیب کے علاج کا اصل طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی صاحبِ دل یا کسی عالم یا کسی ماہر کے پاس جا کر ہر شخص اپنے اپنے مسائل پیش کرے اور اس کے سلسلہ میں ہدایتیں حاصل کرے۔ باقی یہ ایک عام انداز ہے۔ خیر! یہ بھی کوئی فضول اور بالکل بے کار نہیں ہے، اگر اس میں عمومی جذبہ پیدا کرنے والی بات ہے تو بہت اچھا ہے۔

نبی کریم ﷺ طبیبِ روحانی تھے

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ طبیبِ روحانی تھے اور آپ کی خدمت میں لوگ اپنے اپنے مسائل پیش کرتے تھے، اور علاج کا مطالبہ کرتے تھے، جس میں جو کمی ہوتی تھی اس کی طرف نبی کریم ﷺ نشان دہی فرما کر اس کا علاج تجویز فرماتے تھے، اور اس کے مطابق ان کو ہدایت دی جاتی تھی۔ تو چاہے سوال ایک ہی ہے، لیکن سوال کرنے والے مختلف ہیں، اس لیے جواب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جیسا جیسا جس کا مسئلہ ہوگا ویسا ویسا اس کا جواب ہوگا۔ آپ کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر پوچھئے کہ ڈاکٹر صاحب! میرے لیے کونسی غذا مفید ہے؟ تو ڈاکٹر صاحب پہلے تو آپ کا مزاج معلوم کریں گے کہ گرم ہے یا سرد ہے، اس کے بعد آپ کو کوئی چیز بتلائیں گے۔ اور یہی سوال مَیں جا کر

کروں گا تو میری ساری تفصیل جاننے کے بعد مجھے کوئی دوسری چیز بتائیں گے۔ تیسرے آدمی کو اسی سوال کے جواب میں کچھ اور بتائیں گے۔اب تینوں نے ایک ہی سوال کیا؛ لیکن مجھے کچھ بتایا اور آپ کو کچھ اور بتایا اور فلاں کو کچھ اور بتایا۔تو اب کوئی کہے کہ مختلف جواب کیوں ہیں؟ بھائی! سوال کرنے والے مختلف ہیں اور ان کا مزاج مختلف ہے اور ان کی ضرورتیں بھی مختلف ہیں؛ تو جواب بھی مختلف ہیں۔اسی طرح مختلف حضراتِ صحابہ نے ایک ہی سوال کیا کہ کونسا عمل سب سے زیادہ افضل ہے؟ کسی کو جواب دیا کہ ماں باپ کی خدمت کرنا، کسی دوسرے کو جواب دیا کہ جہاد کرنا، کسی کو جواب دیا کہ غصہ نہ کرنا، کسی کو بتلایا گیا کہ خیر خواہی کرنا۔جس کے لیے جو مناسب سمجھا گیا اس کو وہ بتایا گیا۔اصل بات یہ ہے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے اس کے مطابق حکم بتایا گیا۔

وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے کا نام دین ہے

بزرگوں نے کہا کہ دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے کا نام دین ہے،اللہ اور رسول کی اطاعت اسی میں ہوگی، وقت کا تقاضہ کیا ہے اس کو سمجھو اور اس موقعہ پر اللہ اور رسول کی کیا ہدایت ہے اس کو پورا کرو۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک آدمی جنگل میں اپنی بیوی کے ساتھ تنہا اور اکیلا رہتا ہے، آبادی وہاں سے دور ہے، جب نماز کا وقت آیا تو یہ آدمی کہتا ہے کہ مَیں تو نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاؤں گا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی تاکید آئی ہے۔ بیوی کہتی ہے کہ ہمارا مکان جنگل میں ہے، آبادی دور دور تک نہیں ہے اور آپ عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہاں بڑا خطرہ ہے، اگر آپ چلے گئے تو میری کیا گت بنے گی۔اس وقت اگر وہ

یوں کہے کہ تیرا جو ہونے والا ہو وہ ہو، مَیں تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے جاؤں گا جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس گنا زیادہ ہے، وہ مَیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ دیکھو! اگرچہ نماز کا وقت آ گیا ہے اور جماعت کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس وقت یہ کہا جائے گا کہ اس کا نام شوق پورا کرنا ہے، اللہ و رسول کے حکم پر عمل کرنا نہیں ہے، حالانکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے، اس کے مطابق عمل کرو۔

اپنے معاملہ میں فیصلہ کا بہترین طریقہ

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو پہلو ہوتے ہیں اور کسی ایک پہلو کو ترجیح نہیں دے سکتا یا اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے دل کسی ایک پہلو کی طرف مائل ہے تو پھر اپنے معاملہ میں بجائے اس کے کہ خود فیصلہ کرے، کسی سمجھدار شریعت کے تقاضوں سے واقف آدمی کے سامنے پیش کرے اور اس سے مشورہ لے، تاکہ اس میں اپنے نفس کے کسی کید اور دھوکہ کو دخل نہ ہو، اور اس کی طرف سے جو مشورہ دیا جائے اس پر عمل کرے؛ یہی بہترین طریقہ ہے۔ بہت سی مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے اور اس کا دل یہی کہتا ہے کہ اس وقت کا تقاضہ یہی ہے، تو اب اس کو چاہیے کہ جو شخص دین کے تمام تقاضوں اور مسائل سے واقف ہو اس کے سامنے اپنی بات پیش کرے اور اس کے بتانے کے مطابق اپنا معاملہ درست کرے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایک ہی طرح کے سوال کے جواب میں مختلف باتیں فرمائی گئی ہیں، اس کی وجہ کیا ہے وہ مَیں نے بتلا دی۔

اس روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول!

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اَلصَّلوٰۃُ عَلیٰ وَقْتِھَا" نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا۔ بعض لوگ نماز تو پڑھتے ہیں لیکن مؤخر اور لیٹ کر دیتے ہیں یا قضا کر دیتے ہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے مستحب وقت میں اس کو ادا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل ہے۔

پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! اس کے بعد کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ "قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَیْنِ" آپ ﷺ نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ پھر مَیں نے پوچھا اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

دیکھو! اللہ کے راستہ میں جہاد کے مقابلہ میں ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کو آگے کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اور روایتیں بھی پیش فرمائیں گے، جو ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں پڑھی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

اور

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

۲۹/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۷/اپریل ۱۹۹۹ء

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کی تاکید کے سلسلہ میں قائم کیا ہے، قرآنِ پاک کی آیات اور ایک حدیث گذشتہ مجلس میں بیان ہو چکی ہے، آج مزید روایتیں پیش فرمارہے ہیں۔

باپ کا حق ادا کرنے کی ایک صورت

۳۱۳۔عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یَجْزِیُ وَلَدٌ وَالِداً اِلَّا أَنْ یَّجِدَهُ مَمْلُوکاً، فَیَشْتَرِیَهُ، فَیُعْتِقَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو پورا پورا بدلہ نہیں دے سکتا مگر یہ کہ اس کو غلام پائے تو اس کو خرید کر آزاد کر دے۔

افادات:- یعنی اولاد اگر اپنے باپ کا حق ادا کرنا چاہے تو اس کے حق کی ادائیگی کے لیے چاہے وہ کتنی ہی کوشش کرے اور کتنی ہی خدمت بجالاوے اور ان کی کتنی ہی اطاعت و فرمانبرداری کر لے، دنیا بھر کی راحتیں ان کو پہنچائے؛ تب بھی وہ پوری زندگی میں ان کا حق ادا نہیں کر سکتا، البتہ ان کا حق ادا کرنے کی ایک صورت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی جو اُس زمانہ میں پائی جاتی تھی جب کہ غلامی کا سلسلہ تھا اور وہ صورت یہ ہے کہ کسی کا باپ کسی کی غلامی اور ملکیت میں ہے اور بیٹا اپنے باپ کو اس کے مالک سے خرید کر کے آزاد کر دے۔ ویسے بیٹے کا باپ کو خرید لینا ہی باپ کی آزادی کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ بیٹا باپ کو خریدے تو اس کے خریدتے ہی خود بخود باپ آزاد ہو جاتا ہے۔

تو بیٹا باپ کو خرید کر آزاد کر دے تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے باپ کا حق

پورا پورا ادا کر دیا، اس لیے کہ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ باپ کو غلامی سے نجات دلا کر گویا اس نے باپ کو نئی زندگی عطا کی، جیسے باپ اس کے دنیا میں آنے کے لیے ذریعہ بنا تھا اور دنیوی زندگی کے لیے واسطہ بنا تھا؛ تو باپ کو خرید کر غلامی سے آزاد کر کے یہ بھی باپ کے لیے نئی زندگی حاصل ہونے کا ذریعہ بنا، اس اعتبار سے گویا باپ کا جو احسان اس کے اوپر تھا اس کا کچھ بدلہ ادا کیا، اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ایک شکل تو ایسی ہے کہ جس میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بیٹے نے باپ کا پورا پورا بدلہ ادا کر دیا، باقی وہ کتنی ہی خدمت کر لے، اس کے ساتھ احسان و بھلائی کا معاملہ کرے، اس کو کتنی ہی راحت پہنچائے اور اس کے حکم کی بجا آوری کرے؛ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یوں کہے کہ میں نے باپ کا پورا پورا حق ادا کیا۔ آج ہمارے زمانہ میں تو غلامی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اس شکل پر تو عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو

٣١٤۔ وعنه رضی اللہ عنہ أيضاً أَنَّ رسول الله ﷺ قال: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْ لِيَصْمُتْ. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ یا تو بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔

افادات: یہ روایت پہلے بھی ایک دو مرتبہ آ چکی ہے، اس میں صلہ رحمی والا حکم موجود ہے اس مناسبت سے اس باب میں اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔ عام طور پر

احادیث میں اختصار کے ساتھ یہ جملہ آتا ہے"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔اس میں سب ہی ایمانیات آجاتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور آخرت کے دن پر ایمان لانا اس کے درمیان میں فرشتوں پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا، رسولوں پر ایمان لانا؛ یہ سب موجود ہے، گویا پہلا اور آخر ذکر کر کے درمیان کی تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

نبیِ کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مؤمن ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ پہلے اس کی تفصیل بتا چکا ہوں۔

اور جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو یعنی جو آدمی مؤمن ہے اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ یہاں اس روایت کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ باب کے عنوان میں صلہ رحمی کا بھی تذکرہ ہے۔

صلہ رحمی کی مختصر تفصیل

صلہ رحمی یعنی کسی کے ساتھ قرابت، رشتہ داری اور نسبی تعلق ہے تو اس نسبت سے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان حقوق کو ادا کرنا۔ اب یہ حقوق کیا ہیں؟ تو پہلے بھی مَیں نے بتلایا تھا کہ جس قسم کی رشتہ داری ہے اور جس کی جو حیثیت ہے اسی کے مطابق حقوق کی ادائیگی اس پر عائد ہوتی ہے، مثلاً ماں باپ، اولاد، بھائی بہن، دادا دادی، نانا نانی، خالہ، چچا، پھوپھی وغیرہ جتنی بھی خاندانی نسبی رشتہ داریاں ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی میں بعض چیزیں تو وہ ہیں جن کو بعض حالات میں شریعت نے اس پر

واجب اور ضروری قرار دیا ہے مثلاً ماں باپ کے پاس اپنا مال نہیں ہے جس سے وہ اپنا گزر بسر کرسکیں اور بیٹے کے پاس مال موجود ہے، یا بیٹا کمانے کی طاقت رکھتا ہے؛ تو اس صورت میں اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ماں باپ کا نفقہ ادا کرے۔ ہاں! اگر ماں باپ کے پاس اپنا مال موجود ہے تو میں بتلا چکا ہوں کہ جب کسی کے پاس اپنا مال موجود ہو تو اس کے کھانے پینے کا، اس کے پہننے اوڑھنے کا اور اس کے رہنے سہنے کا خرچہ کسی دوسرے پر نہیں آتا، وہ اسی کے مال میں واجب ہوتا ہے سوائے بیوی کے، کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ اس کے پاس اپنا کتنا ہی مال موجود کیوں نہ ہو، وہ کروڑ پتی اور ارب پتی ہو تب بھی اس کا خرچہ اس کے شوہر پر ہی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی رشتہ دار ہو، ماں باپ، اولاد اور وہ بھی چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے تمام رشتہ دار کوئی بھی ہو، اگر ان کے پاس اپنا مال موجود ہے جس سے ان کے کھانے پینے کی ضرورت، پہننے اوڑھنے کی ضرورت، ان کے رہنے سہنے کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، تو اس صورت میں کسی دوسرے پر ان کا کوئی بھی نفقہ واجب نہیں ہے۔ اب واجب نہ ہونے باوجود ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اگر اولاد ان کے ساتھ ہدیہ وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھے تو اچھا ہے، لیکن شریعت واجب قرار نہیں دیتی۔ لیکن اگر ان کے پاس اپنا مال موجود نہیں ہے، اور اس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہے تو پھر اس میں بڑی تفصیلات ہیں۔ بعض صورتوں میں ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اور اگر کئی اولاد ہیں تو ہر ایک کے اوپر کچھ نہ کچھ حصہ ان کے حق کے مطابق عائد ہوتا ہے، جو ان کو ادا کرنا پڑے گا۔ بعض رشتہ داریاں دور کی ہیں مثلاً آپ کی خالہ ہیں اور ان کا بیٹا بھی موجود ہے اور اس کی حیثیت بھی ہے تو اس پر ہی ان کا خرچہ واجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ اس کو ادا

نہیں کرتا تو اس صورت میں آپ کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیے۔

صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ

اور صلہ رحمی کا کم سے کم درجہ یہ ہے آدمی ان کے ساتھ ملاقات کرتا رہے اور ان کے ساتھ سلام وکلام کا سلسلہ جاری رکھے، اور خیر خیریت معلوم کرے؛ یہ صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے، اگر کوئی آدمی یہ بھی نہیں کرتا تو یوں سمجھا جائے گا کہ اس نے قطع رحمی کی یعنی رشتہ داری کا حق ادا نہیں کیا، اور اس صورت میں قطع رحمی اور رشتہ داری کا حق ادا نہ کرنے پر جو وعیدیں قرآن واحادیث میں آئی ہیں وہ تمام اس کے اوپر عائد ہو جائیں گی اس لیے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے جتنے بھی رشتہ دار ہوں، جن کے ساتھ نسبی تعلق ہے، چاہے وہ قریب کے ہوں یا دور کے ہوں، ان کے ساتھ کبھی کوئی معاملہ ایسا تو ہونا ہی نہیں چاہیے کہ ان کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بند کردیں بول چال نہ ہو اور سلام کلام نہ ہو، اگر یہ نہیں ہوگا تو اس صورت میں یہ ساری وعیدیں اس کے اوپر آجائیں گی اور اس کے نتیجہ میں وہ مصیبتوں میں پھنسے گا۔

روزی کی تنگی کا سب سے بڑا سبب

آگے ایک روایت آنے والی ہے کہ آدمی جب صلہ رحمی کرتا ہے، رشتہ داری کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی روزی میں برکت عطا فرماتے ہیں اس کی زندگی میں برکت عطا فرماتے ہیں اور اگر قطع رحمی کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کی روزی میں بے برکتی ہوتی ہے، روزی کا سلسلہ ختم کردیا جاتا ہے۔ آج کل لوگوں کو عام طور پر شکایتیں ہیں کہ کاروبار نہیں چلتا، بہت تکلیف ہے اور برکت نہیں ہے، حالانکہ کاروبار میں برکت نہ ہونے اور روزی کی تنگی کا سب سے بڑا سبب قطع رحمی ہے،

اب اگر اس لائن سے وہ آدمی سوچے تو اس کو خود اپنی پریشانی کا جواب مل جاتا ہے کہ کسی رشتہ دار کے ساتھ کچھ نہ کچھ معاملہ خراب چل رہا ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو ماں باپ ہی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں بنیاد کی شروعات ہی میں معاملہ گڑبڑ ہے، اور اگر ماں باپ کے حق کی ادائیگی کا کچھ اہتمام کیا تو دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی میں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں اور بعضوں کے ساتھ ایسی لڑائی ہوتی ہے کہ ان کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، سلام و کلام کے لیے راضی نہیں، اور پھر چاہتے یہ ہیں کہ ہماری روزی میں برکت ہو؛ یہ کیسے ہوسکتا ہے، معمولی معمولی باتوں میں آپس میں جھگڑے ہوتے ہیں، بات چیت بند ہو جاتی ہے، سلام وکلام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، اور جب مصیبتیں آتی ہیں تو پھر روتے پھرتے ہیں، اور مصیبت تو یہ ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا، اور یہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ یہ تکلیف کاہے کی وجہ سے آئی۔ اور اگر اللہ کا کوئی بندہ متوجہ کرے تو اِدھر دھیان ہی نہیں دیتے، یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو ایسی ہی بات ہے، حالانکہ حقیقت میں مصیبت اسی کی وجہ سے آتی ہے۔

کمزوروں کی وجہ سے روزی دی جاتی ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صاحبزادے کما کر ماں باپ کو دے رہے ہیں، اب شادی ہوئی تو بیوی کان بھر رہی ہے، اور یوں کہتی ہے کہ دیکھو! آپ اتنی تکلیف اٹھا کر کما کر ماں باپ کو دیتے ہیں اور تمہارا فلاں بھائی تو بیٹھا بیٹھا کھا رہا ہے، ماں باپ اس کو کچھ نہیں کہتے۔ اور جب ایک بات بار بار کہی جاتی ہے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی سوچنے لگتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک کہتی ہے، اس کی بات پھینک دینے جیسی نہیں ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں وہ ماں باپ سے بات کرتا ہے، حالانکہ

جب آپ نے اپنی حیثیت کے مطابق خدمت کے طور پر ماں باپ کو پیش کر دیا تو اب ان کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں، لیکن جب آپ اس سلسلہ میں ماں باپ سے گفتگو کریں گے تو اسی کے نتیجہ میں کبھی تو ماں باپ کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں، اور بھائیوں کے ساتھ بھی ٹوٹ جاتے ہیں، اور پھر یہ صاحبزادے کہتے ہیں کہ مَیں ہی الگ ہو جاتا ہوں۔ پھر علاحدگی اختیار کر لینے کے کچھ زمانہ کے بعد کاروبار ٹھنڈا ہونے لگتا ہے تو اب سوچتے ہیں کہ کاروبار ٹھنڈا کیوں ہو گیا؟ ارے بھائی! تمہارے کاروبار میں جو کچھ آ رہا تھا وہ تو ان کمزوروں کی وجہ سے ہی آ رہا تھا حدیثِ پاک میں آتا ہے "اِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ" (سنن ترمذی، ١٧٠٢) تم کو تمہارے کمزوروں کی وجہ سے روزی دی جاتی ہے، یعنی جو کمزور خود کمانے کی طاقت نہیں رکھتے، تم کما کر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہو، تو ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہیں بھی روزی دیتے ہیں۔

پہلا شیطانی حربہ

اب دیکھو کہ نبی کریم ﷺ نے کیا تعلیمات دی ہیں؟ اور یہ یوں سمجھتا ہے کہ مَیں اِن کو کھلا رہا ہوں اور حضورِ اکرم ﷺ یہ بتلا رہے ہیں کہ یہ تجھے کھلا رہے ہیں۔ اب ہمارا ایمان تو نبی کریم ﷺ پر ہے، ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے ہیں اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم محنت کرتے ہیں اور ہم کما کر لاتے ہیں اور ہم اِن کو کھلا رہے ہیں، لیکن حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ نہیں! تم کو جو کچھ مل رہا ہے وہ تو اُس کی وجہ سے مل رہا ہے تو صریح ایمان والی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ بھی نظر آتا ہو لیکن اللہ کے پاک رسول ﷺ جب یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اُن کی وجہ سے روزی ملتی ہے تو ہمیں اس کو مان لینا چاہیے اور

ہمیں اسی کا یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری آنکھیں کچھ بھی دیکھتی ہوں، ہماری آنکھ غلط دیکھ سکتی ہے لیکن اللہ کے پاک رسول ﷺ کبھی غلط کہہ نہیں سکتے۔ اگرچہ بظاہر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم کما کر ان کو کھلا رہے ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ نے فرما دیا کہ ان کی وجہ سے تمہیں روزی مل رہی ہے تو اب ہمارا ایمان یہی ہونا چاہیے، اور جب یہ ایمان ہوگا تو کیا ہم ان کے ساتھ تعلقات ختم کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ جب ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمیں جو کچھ مل رہا ہے وہ اُس کی وجہ سے مل رہا ہے تو ہم کبھی بھی اُس کے ساتھ تعلقات نہیں توڑیں گے، بلکہ اگر وہ توڑنا بھی چاہے گا تو ہم اُس کے سامنے ہاتھ جوڑیں گے کہ اللہ کے واسطے ایسا مت کرو، میری غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردو، مَیں تو آپ کو ساتھ ہی رکھوں گا، آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ لیکن جب آپ یوں سمجھیں گے کہ مَیں محنت کرتا ہوں اور مَیں کما کر کھلاتا ہوں تو پھر آپ الگ ہونے کی بات کریں گے۔ جب کوئی آدمی آپ کو ایسا مشورہ دے رہا ہو، تو درحقیقت یہ پہلا شیطانی اور نفسانی حربہ ہے، آپ اس کو سمجھائیے کہ بھائی! مَیں اس کو نہیں کھلا رہا ہوں وہ مجھے کھلا رہے ہیں۔ اگر بیوی بھی یہ کہتی ہو تو اس سے کہنا چاہیے کہ پگلی! یہ بات نہیں ہے، تو جو سمجھ رہی ہے وہ بالکل غلط ہے، نبیٔ کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے، اس لیے یہ لوگ مجھے کھلا رہے ہیں، یہ نہ سمجھنا کہ مَیں ان کو کھلا رہا ہوں۔ جب تک میرا معاملہ ان کے ساتھ درست ہے وہاں تک میری روزی میں برکت ہے اور مجھے روزی ملتی رہے گی، اور جس دن مَیں ان سے تعلقات کٹ کردوں گا اسی دن سے میرا معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔

دوسرا شیطانی حربہ

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ قطع رحمی کی وجہ سے روزی کا

وبال آتا ہے اور پھر آدمی سمجھتا نہیں ہے اور روتا پھرتا ہے، وظیفے پڑھتا ہے اور پھر یوں سوچتا ہے کہ کسی نے کچھ کرادیا ہے، یہ دوسرا شیطانی حربہ ہوتا ہے۔ جیسے کسی بیماری کی صحیح تشخیص ہی نہ ہو تو اس کا علاج کیا ہوگا۔ اسی طرح شیطان اب دوسرے راستہ پر لے جا رہا ہے، بیماری کی جو بنیاد اور سبب ہے اُدھر سے دھیان ہٹا کر دوسری طرف لے جا رہا ہے، اب وہ اور زیادہ چکر پر چڑھ جاتا ہے، عاملوں کے پاس جائے گا، کہیں تعویذ گنڈے کرائے گا، کوئی کہے گا کہ کالا جادو ہے اور کوئی کچھ کہے گا، لیکن جو کالا جادو اپنے اندر ہے اس کو دور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا، یہاں پر بھی الزام دوسروں کے اوپر دیتا ہے، اپنی غلطیوں کی طرف آدمی کا ذہن جلدی سے نہیں جاتا۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایسے موقع پر اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ مَیں کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہا ہوں جس پر حدیثِ پاک میں تنگی کی وعید سنائی گئی ہے، اگر ایسا کوئی کام ہے تو اس سے فوراً باز آجانا چاہیے، اس کا اصل علاج یہی ہے، دوسرا کوئی علاج نہیں ہے۔ بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ صلہ رحمی کا ادنیٰ اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ سلام کلام کا سلسلہ جاری رکھے، اگر وہ سلام کلام کا سلسلہ ختم کردے گا تو یوں کہا جائے گا کہ اس نے رشتہ داری کا حق ادا نہیں کیا۔

اور نبی کریم ﷺ نے تیسری بات ارشاد فرمائی کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے، اس کی تفصیل بتا چکا ہوں۔

رشتہ داری کی اپیل

۳۱۵۔وعنہ قال رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ خَلَقَ الْخَلْقَ حَتّٰی اِذَا فَرَغَ مِنْھُمْ قَامَتِ الرَّحِمُ، فَقَالَتْ: ھٰذَا مُقَامُ الْعَائِذِبِکَ مِنَ

الْـقَـطِيْـعَةِ۔قـال: نَـعَـمْ!أَمَـا تَـرْضَيْـنَ أَنْ أَصِـلَ مَـنْ وَصَـلَكِ،وَأَقْـطَـعَ مَـنْ قَـطَـعَكِ؟قـالـت: بَـلـىٰ۔قـال: فَـذَالِكَ لَكِ۔ثُمَّ قالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اِقْرَؤُوْااِنْ شِئْتُمْ ﴿فَهَـلْ عَسَيْتُـمْ اِنْ تَـوَلَّيْتُـمْ أَنْ تُفْسِدُوْافِى الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا أَرْحَامَكُمْ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمٰى أَبْصَارَهُمْ﴾ (متفق عليه)

وفـي روايـة لـلبـخـاري: فَـقَـالَ اللّٰهُ تعالىٰ: مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ،وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب تمام مخلوق کو پیدا فرما چکے،تو قرابت کھڑی ہوئی۔اور کہا کہ باری تعالیٰ! قطع رحمی کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے مَیں آپ کی پناہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔تو باری تعالیٰ نے بھی اس سے فرمایا کہ بالکل! تمہیں گارنٹی دی جاتی ہے۔اچھا! کیا اس بات پر تو خوش ہے کہ جو تجھے جوڑے گا،مَیں اس سے جوڑوں گا،اور جو تجھے کاٹے گا،مَیں اس کو کاٹوں گا؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ جی ہاں! مَیں اس پر تیار ہوں،تو باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ! تمہیں اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو،جس کا خلاصہ ہے کہ کیا تمہیں یہ توقع ہے کہ تم کو اگر قبضہ حاصل ہو جائے تو زمین کے اندر فساد پھیلاؤ گے اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو گے یعنی قطع رحمی کرو گے؟ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی اور حق بات کے سننے سے ان کو بہرا بنا دیا اور حق کی طرف نظر کرنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داری سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا تو میں اسے اپنے سے کاٹوں گا۔

افادات: وہ نسبی رشتہ داری جو بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے،اس کو عربی میں ''رَحِمْ'' کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرابت و رشتہ داری جسمانی اور جاندار چیز تو

ہے نہیں کہ اُٹھے اور بات کرے؟ اس سلسلہ میں شرّاح نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے اس کے ان جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس کی اس درخواست کو پیش کرنے کے لیے کسی فرشتے کو کھڑا کر دیا ہو اور اس فرشتہ نے یہ بات اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی ہو۔

یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اگر چہ رشتہ داری حسی چیز نہیں ہے بلکہ ایک معنوی چیز ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ وہ اس کو کوئی جسم اور شکل عطا کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بات پیش کرے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرابت اور رشتہ داری کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کے لیے نبی کریم ﷺ نے تعبیر کا ایک مخصوص انداز اختیار فرمایا ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کتنی اہمیت ہے وہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔

خیر! تو قرابت اور رشتہ داری اُٹھی اور کہا کہ باری تعالیٰ! قطع رحمی کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے مَیں آپ کی پناہ حاصل کرنا چاہتی ہوں گویا قرابت اور رشتہ داری نے اپنی درخواست اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ کہہ کر پیش کی کہ میرے حقوق کو اگر ضائع کیا گیا تو اس کے لیے کیا گارنٹی ہے؟ رشتہ داری نے باری تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ باری تعالیٰ! آپ نے مجھے پیدا کیا اور میرے کچھ حقوق آپ نے مقرر کیے کہ ان کو ادا کیا جائے، اور ان کو ضائع و برباد نہ کیا جائے، تو اب میرے ان حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے سلسلہ میں مجھے آپ کی بارگاہ سے کوئی گارنٹی ملنی چاہیے اور ایسا

کچھ اطمینان مجھے ملنا چاہیے؛ تا کہ اس گارنٹی کی وجہ سے کوئی آدمی اگر میرے حقوق کو ضائع کرنے کا ارادہ کرے تو وہ ڈر جائے اور ضائع نہ کرے۔

کیا گارنٹی ہے کہ لوگ میرے حقوق ادا کریں گے یا نہیں کریں گے۔ اور اگر نہیں کریں گے تو ان کو کیا سزا ملے گی، اور اگر ادا کریں گے تو اس پر کیا انعام ملے گا؟ ابھی سے یہ طے ہو جائے تو میرا خیال رکھا جائے گا، اور اگر طے نہیں کیا جائے گا تو لوگ میرا خیال بھی نہیں رکھیں گے۔

رشتہ داری کو زبردست گارنٹی ملی ہے

تو باری تعالیٰ نے بھی اس سے فرمایا "نَعَمْ" بالکل! تمہیں گارنٹی دی جاتی ہے اچھا! کیا تو اس بات پر خوش ہے کہ جو تجھے جوڑے گا اور جو تیرے حقوق ادا کرے گا، مَیں اس سے جوڑوں گا، اور جو تجھے کاٹے گا اور تیرے حقوق ضائع کو برباد کرے گا، مَیں اس کو کاٹوں گا یعنی اس کو برباد کروں گا؟ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قرابت اور رشتہ داری کو کتنی زبردست گارنٹی دی گئی کہ باری تعالیٰ قرابت سے پوچھ رہے ہیں کہ اب تو تجھے اطمینان ہے؟ اس کے جواب میں قرابت نے کہا کہ جی ہاں! مَیں اس پر تیار ہوں، اگر اتنی گارنٹی مجھے مل جائے تو مَیں خوش ہوں۔ تو باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ! تمہیں اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کو جوڑے، تو پھر ساری دنیا بھی اس سے منہ موڑے تو اس کو کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے کاٹے پھر تو ساری دنیا بھی اسے خوش کر دینا چاہے تو وہ خوش نہیں ہوسکتا۔ دنیا کا معمولی حاکم یا آپ کے شہر کا ڈی ایس پی، یا کلکٹر جب کسی کے متعلق اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے تو اس آدمی کو رات بھر نیند نہیں آتی،

زندگی کا چین وسکون خراب ہوجاتا ہے، تو جب اللہ تعالیٰ یوں کہہ دیں کہ مَیں اس کو کاٹوں گا تو اب وہ آدمی رشتہ داری کے حقوق ضائع کر کے کیا سکون واطمینان کی نیند لے سکتا ہے؟ کیا اس کو زندگی میں چین وسکون حاصل ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کبھی بھی چین نہیں مل سکتا۔ اگر وہ چین وسکون حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرے۔

تو اب رشتہ داری اتنی بڑی زبردست گارنٹی لے کر دنیا میں آئی ہے، اور ہم پیدا ہوتے ہی اس رشتہ داری کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں، اب اگر ہمیں اپنا کام بنانا ہے تو پھر اس رشتہ داری کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے، اور اگر اس کو ضائع وبرباد کریں گے تو پھر یہ وعید ومصیبت ہم پر عائد ہوجائے گی۔

دولت اور کرسی کا نشہ

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی ایک آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، جس کا خلاصہ ہے کہ کیا تمہیں یہ توقع ہے کہ تم کو اگر حکومت مل جائے اور قبضہ حاصل ہوجائے تو زمین کے اندر فساد پھیلاؤ گے اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو گے اور قطع رحمی کرو گے؟ یعنی عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں جب کچھ پاور آتا ہے، چاہے وہ مسلس پاور ہو یا منی پاور ہو یعنی پیسوں کا پاور ہو یا طاقت وقوت کا پاور ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے ''ہم چوں من دیگرے نیست'' ہم سے بڑا کوئی نہیں ہے، پھر رشتہ داریوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو ضائع کرتا ہے، لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتیاں کرتا ہے۔ عام طور پر دولت آتی ہے یا کرسی ملتی ہے تو اسی کے نشہ میں آدمی یہ حقوق ضائع کرتا

ہے۔آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے قوت کے بل بوتے پر زمین میں فساد پھیلایا اور رشتہ داریوں کے حقوق ضائع کئے، ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی۔لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دوری۔اور حق بات کے سننے سے ان کو بہرا بنا دیا اور حق کی طرف نظر کرنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔اس نشہ میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھاتے بھی ہیں اور ساری دنیا ان کو اصل حقیقت دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ تم یہ سب غلط کر رہے ہو، لیکن ان کو نظر ہی نہیں آتا، ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں، کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

٣١٦: وعنه رضی اللہ عنہ قال: جَآءَ رَجُلٌ اِلیٰ رسولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يارسولَ اللّٰهِ! مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ؟قَالَ:أُمُّكَ۔قَالَ:ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ:أُمُّكَ۔قَالَ:ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ:أُمُّكَ۔ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟قَالَ:أَبُوْكَ۔ (متفق عليه)

وفى رواية: يارسول اللّٰه! مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ؟قال:أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أَبَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا، اے اللہ کے رسول، میرے حسنِ سلوک کا لوگوں میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا، تیرا باپ۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اے اللہ کے رسول! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ، پھر رشتہ داری کے اعتبار سے جو جتنا قریب ہو۔

افادات: گویا حسنِ سلوک کے معاملہ میں باپ کے مقابلہ میں ماں کو تین گنا حق دیا گیا یعنی تین حصے ماں کے ہوئے اور ایک حصہ باپ کا ہوا۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں ایک ہے خدمت اور حسنِ سلوک۔ دوسرا ہے تعظیم اور حکم کی بجا آوری۔ تو تعظیم اور حکم کی بجا آوری میں ماں پر باپ مقدم ہے، اگر دونوں کے احکام میں ٹکراؤ ہو جائے اور کسی کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو تو باپ کا حکم مانا جائے گا۔ اور خدمت اور راحت پہنچانے کے معاملہ میں اور ہدیہ دینے کے معاملہ میں باپ پر ماں کو ترجیح ہوگی۔ اس لیے کہ ماں نے اس کے لیے تین مشقتیں اٹھائی ہیں، جب پیٹ میں تھا، جب پیدا ہوا، اور دودھ پلانے کے زمانہ میں۔ اور بعد میں جب پرورش کا زمانہ آیا تو ماں کے ساتھ باپ بھی شریک ہے، پہلے تین مرحلوں میں باپ میدان میں تھا ہی نہیں، صرف ماں ہی ماں تھی، لیکن جب بڑا ہوا اور تعلیم و تربیت کا زمانہ آیا تو اب دونوں شریک ہیں۔ تو گویا ماں نے تین گنا محنت کی ہے، اس لیے حسنِ سلوک اور خدمت و محبت کے معاملہ میں ماں کو ترجیح دی ہے، لیکن تعظیم اور حکم کو بجا لانے کے معاملہ میں باپ کو ترجیح دی ہے، باپ کا حکم مقدم رکھا جائے گا۔

وہ آدمی ہلاک و برباد ہو

٣١٧: وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَالْكِبَرِ، أَحَدَهُمَا أَوْ كِلاهُمَا، فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اس کی ناک غبار آلود ہو، وہ آدمی ہلاک و برباد ہو، وہ آدمی ہلاک و برباد ہو؛ جس نے اپنے ماں باپ میں سے دونوں کو یا کسی ایک کو بوڑھاپے میں پایا، اس کے باوجود ان کی خدمت کر کے وہ جنت میں داخل نہ ہو سکا۔

افادات: اس لیے کہ بوڑھاپے کی حالت میں ماں باپ کو پایا، اگر وہ ان کی

خدمت کرتا تو وہ ضرور اس کو جنت میں داخل کراتے، لیکن اس نے ان کا حق ادا نہیں کیا اور جنت میں داخل نہیں ہو پایا تو اب اس کے لیے ہلاکت کے علاوہ اور کیا باقی رہا۔ اس لیے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں خاص طور پر بوڑھاپے میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

ماں باپ کی تقسیم کا دردناک منظر

آج کل تو ایسا زمانہ آیا ہے کہ کیا کہا جائے، اللہ کی پناہ۔ ایک مولانا صاحب سنانے لگے کہ اب تو ماں باپ کو بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو بتایا کہ بیٹوں میں جب جائیداد تقسیم ہوتی ہے تو بیٹے کہتے ہیں کہ باپ کو تو رکھ اور ماں کو میں رکھتا ہوں۔ پھر کیا ہوا؟ باپ کی وجہ سے جائیداد میں سے دو چار بیگہ زمین الگ کی گئی تھی، اور ماں کی وجہ سے کچھ الگ کی گئی تھی۔ اب ایسا ہوا کہ ماں کا انتقال ہو گیا، اور باپ رہ گیا، تو پھر اس میں بھی جھگڑے ہوتے ہیں۔ اب وہ بیٹا جس کے ساتھ باپ رہتا ہے وہ یوں کہتا ہے کہ والدہ کا تو انتقال ہو گیا اب تُو آرام سے بیٹھ گیا، اور میرے اکیلے پر باپ کی زحمت ہے، اس لیے اب تو بھی ان کی خدمت میں کچھ حصہ لے، ورنہ پھر زمین میں سے میرا حصہ لا۔ اللہ اکبر! یہ مزاج عام ہوتا جا رہا ہے، یعنی ماں باپ کی خدمت بھی جائیداد کی بنیاد پر کی جا رہی ہے، حالانکہ جائیداد اصل چیز تھوڑی ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ ایک بھائی کے یہاں ماں رہے گی اور دوسرے کے یہاں باپ رہے گا۔ حالانکہ پوری زندگی تو ان دونوں نے ایک ساتھ رہ کر زندگی گزاری، کیا یہ اولاد کی سعادتمندی کی بات ہے کہ ان کی اخیری زندگی میں ان دونوں کو الگ رکھا جائے؟ اس بات کو کون برداشت کرے گا؟ آپ تو اپنی بیوی سے الگ رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ماں باپ

کے ساتھ یہ معاملہ کیا جارہا ہے؟

اچھا! یہ تو ماں باپ کی تقسیم ہوئی تھی۔ اوراب تو باپ اکیلا رہ گیا تو انہوں نے یہ کیا کہ وہ کھانا ایک کے یہاں کھائیں گے، دوسرے کے یہاں غسل کرنے کے لیے جائیں گے اور سونا رہنا تیسرے کے یہاں ہوگا۔ مَیں نے کہا کہ واہ بھئی واہ! یہ کیسی بات ہوئی کہ بوڑھاپے کے اندر باپ فقیروں کی طرح گداگری کرتا پھرے گا۔ یہ سب ہمارے سماج میں ہورہا ہے، اگر آپ معلوم کریں گے تو آپ کے معاشرہ میں بھی ایسے نمونے ضرور مل جائیں گے۔ استغفر اللہ۔

ایک افسوس ناک واقعہ

اوراب تو دھیرے دھیرے یہ مزاج بنتا جارہا ہے کہ اگر ماں باپ بوڑھے ہوگئے ہیں تو ان کو بڈھا گھر (nursing home)(۴۱۲۳۱۴۱۲) میں بھیج دو، یورپ اورامریکہ میں یہ طریقہ چل رہا ہے، ماں باپ بوڑھے ہوگئے تو بیٹا بڈھا گھر (nursing home)(۴۱۲۳۱۴۱۲) والوں سے رابطہ قائم کر کے کہتا ہے کہ مَیں اپنے ماں باپ کو آپ کے یہاں چھوڑ دیتا ہوں اوراس کی ماہانہ فیس ادا کردیتا ہوں۔ یورپ والوں کو ماں باپ کی خدمت کرنے کی فرصت نہیں ہے، حالانکہ یہی جنت کمانے کا وقت تھا۔ اب نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ کراچی میں ایک صاحب کے متعلق سنا کہ بیٹا باپ کو بڈھا گھر (نرسنگ ہوم) میں چھوڑ آیا تھا، باپ کا وہاں انتقال ہوگیا تو نرسنگ ہوم والوں نے اس کو اطلاع دی کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ پلیز آپ ذرا ان کے کفن دفن کا انتظام کردیجئے، اس کا

جو بل ہو گا وہ مَیں ادا کر دوں گا، اور جنازہ کا جو وقت ہو وہ مجھے بتا دو، مَیں پہنچ جاؤں گا۔ خیر! انہوں نے جنازہ کا وقت اس کو بتایا لیکن اسی وقت صاحبزادے صاحب کی کوئی اہم میٹنگ تھی اس لیے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اس وقت تو میری بہت اہم میٹنگ ہے، اس لیے مَیں حاضر ہونے سے قاصر ہوں، مہربانی کر کے آپ ان کو دفن کر دیں اور جو بل ہو؛ وہ مجھے بھیج دینا، مَیں ادا کر دوں گا۔ یہ ساری چیزیں جو ہمارے معاشرہ میں آ رہی ہیں، وہ سب درحقیقت اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں۔

ایسے موقعہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے

اسلام نے جس قسم کا مکمل معاشرہ قائم کرنا چاہا اور صلہ رحمی کی تاکید کر کے آپس کے حقوق بتلائے اور ان کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا، اس کے نتیجہ میں جو محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو معاشرہ قائم ہوتا ہے؛ اس کو یورپ والے کیا جانیں۔ اور اب ہم بھی یورپ کی تقلید میں وہی حرکتیں کرنے لگے ہیں جن کا اسلامی تعلیمات اور انسانی شرافت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آدمی کو یہی سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی خدمت کا موقع دیا ہے، اور ان کی خدمت کر کے مَیں جنت کما سکتا ہوں، تو ایسے موقعہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اگر دوسرے بھائی یہ کہتے ہوں کہ ہم ماں باپ کو رکھنے کے لیے تیار ہیں تو آپ آگے بڑھ کر کہئے کہ نہیں نہیں! کچھ بھی ہو جائے، مَیں ہی ماں باپ کو رکھوں گا ہر ایک اس معاملہ میں سبقت سے کام لے، اور ہر ایک ان کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچانے کی کوشش کرے، کوئی ایک بات بھی ہماری طرف سے ایسی پیش نہیں آنی چاہیے جو اُن کی طبیعت پر گرانی کا باعث ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک
اور
رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

۷؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۲۴؍اپریل ۱۹۹۹ء

ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا بیان چل رہا ہے، اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے بہت ساری روایتیں پیش کیں، آج ایک اور روایت پیش کی ہے۔

کثیر الوقوع شکایت خدمتِ نبوی میں

۳۱۸: وعنه أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! اِنَّ لِيُ قَرَابَةً أَصِلُهُمُ وَيَقُطَعُونِيُ، وَ أُحسِنُ اِلَيُهِمُ ويَسِيئُونَ اِلَيَّ، وَأَحُلُمُ عَنُهُمُ وَيَجهَلُونَ عَلَيَّ، فَقَالَ: لَئِنُ كُنُتَ كَمَا قُلُتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَلايَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيرٌ عَلَيُهِمُ مَادُمُتَ عَلٰى ذَالِكَ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار ہیں، مَیں تو ان کے حقوق کو ادا کرتا ہوں، لیکن رشتہ داری کی حیثیت سے میرے جو حقوق ان پر ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتے۔ اور مَیں ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا ہوں، محبت سے پیش آتا ہوں، اور وہ لوگ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں۔ اور اگر ان کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو مَیں تحمل و بردباری اور برداشت سے کام لیتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر واقعہ یہی ہے جیسا کہ تو نے کہا تو گویا تم اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعہ سے ان کے منھ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو۔ اور جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔

افادات: آج کل عام طور پر یہ ساری شکایتیں ہوتی ہیں، ایسے لوگ جو شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں، یا مثلاً اس سے پہلے آپ نے جو روایتیں سنیں، یا آئندہ سنیں گے اس کے بعد آپ کے دل میں آیا کہ ہمیں رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے چاہئیں اور آپ نے اس پر عمل شروع بھی کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آرہے ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کر رہے ہیں، اگر ان کی طرف سے کوئی نادانی

ہو جائے تو آپ برداشت سے کام لے رہے ہیں، لیکن ان کی طرف سے جواب کے طور پر آپ کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا جو آپ ان کے ساتھ کر رہے ہیں؛ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

اپنا فیصلہ کسی غیر جانبدار سمجھدار آدمی سے کرایا جائے

نبی کریم ﷺ سے یہی شکایت کی گئی کہ میرا ایسا ایسا معاملہ ہے۔ تو حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''تیرا معاملہ واقعتاً ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہہ رہا ہے'' آپ ﷺ نے یہ جملہ اس لیے فرمایا کہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے طور پر یوں سمجھتا ہے کہ مَیں حق ادا کر رہا ہوں، حالانکہ دیانتداری کی بات تو یہ ہے کہ اپنے بارے میں آدمی کو خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو کسی غیر جانبدار اور سمجھدار آدمی کے سامنے پیش کرے کہ ایسا ایسا ہو رہا ہے، وہ یوں کر رہے ہیں اور مَیں یہ کر رہا ہوں، اور مَیں یوں سمجھتا ہوں کہ مَیں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے۔ مَیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آ رہا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، مَیں اچھائی سے کام لیتا ہوں اور وہ برائی سے پیش آتے ہیں؛ اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں طرف سے جو معاملہ ہو رہا ہے اس میں کون صحیح کر رہا ہے اور کون غلطی پر ہے۔ پوری تفصیل کسی ایسے آدمی کے سامنے رکھی جائے جو قرآن وحدیث اور اسلامی احکام سے واقف ہو اور سمجھدار ہو، اور اسی سے فیصلہ طلب کیا جائے۔

اس لیے کہ عام طور پر معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ جو دعویٰ آپ کر رہے ہیں، فریقِ مخالف بھی وہی دعویٰ کرتا ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ مَیں ان کا حق ادا کرتا ہوں وہ میرا حق ادا نہیں کرتے۔ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ آپ کے متعلق یہ شکایت ہے تو وہ جواب

میں یہی کہیں گے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ مَیں ان کا حق ادا کرتا ہوں وہ میرا حق ادا نہیں کرتے۔ جو بات آپ اُن کے خلاف کہہ رہے ہیں، ہو بہو وہی دعویٰ وہ بھی آپ کے خلاف کررہے ہیں۔ اب اگر دونوں اپنا اپنا دعویٰ لیے بیٹھے رہیں تو اس جھگڑے کا فیصلہ کبھی بھی آنے والا نہیں ہے، اس لیے جو آدمی سمجھدار اور شریعت کے احکام سے واقف ہو، اس کے سامنے بات پیش کیجئے، اگر آپ کی کوئی کمزوری ہے اور آپ کی طرف سے کوئی کمی اور فالٹ ہے تو اس کی طرف سے اس بات کی نشاندہی کی جائے گی کہ اس بارے میں آپ فالٹ میں ہیں، آپ کو اس کی اصلاح کرنی چاہیے، اور اُن کی طرف سے جو ہورہا ہے اس سلسلہ میں بھی آپ کو ہدایت دی جائیگی۔

اکابر کا طرزِ عمل

ہمارے اکابر کو دیکھا کہ اپنا ذاتی کوئی بھی معاملہ ہوتا تو باوجود اس کے کہ ان کے پاس وافر علم ہے، بہت بڑے آدمی ہیں لیکن دوسروں سے رجوع فرماتے۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی مجلس میں بارہا دیکھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تھا اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لاتے تو فرماتے کہ مفتی جی! ایسا معاملہ ہے، اب آپ بتلاؤ کیا کیا جائے؟ ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ پیش فرماتے تھے، حالانکہ خود سب کچھ سمجھتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا نفس کبھی خیانت کرجاتا ہے اور ہمارے اکابر تو اپنے نفس پر اعتماد کرتے ہی نہیں تھے کہ معلوم نہیں کب وہ خیانت کرلے، اور ہم لوگ ہیں کہ اپنے نفس پر بالکل مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ ہم برابر ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں، ہماری طرف سے کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اپنے معاملہ میں آدمی کے نفس کو اپنی کمزوری نظر نہیں آتی

اور وہ اپنے متعلق یہی سوچتا، سمجھتا اور فیصلہ کرتا ہے کہ مَیں جو کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک کر رہا ہوں، اور سامنے والی پارٹی اور دوسرے فریق کی طرف سے میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس لیے خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

ان کے منہ میں گرم راکھ

یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے کوئی تفصیل تو پوچھی ہی نہیں تھی بلکہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم جو کہہ رہے ہو واقعتاً ایسا ہی ہے تو گویا تم اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعہ سے ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو۔ ویسے بھی کوئی سفوف آدمی پھانکتا ہے تو وہ جلدی سے گلے سے نہیں اترتا، اور راکھ تو کھانے کی چیز ہے ہی نہیں اور وہ بھی گرم ہو تو کتنی تکلیف دہ ہوگی۔ آپ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم حق ادا کرتے ہو اور وہ ادا نہیں کرتا، تم اس کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے ہو اور وہ تمہارے ساتھ برائی سے پیش آتا ہے، تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنی اس روش کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ اس کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو، اور جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔

ایک مددگار فرشتہ کا ساتھ

حدیثِ پاک میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک آدمی بُرا بھلا کہہ رہا تھا، حضرت اس کو جواب نہیں دے رہے تھے بلکہ خاموش تھے، حضور ﷺ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برابر دیکھ رہے تھے، اور دیر تک ایسا ہوتا رہا، جب اس نے بہت زیادتی کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دینا شروع کیا، اب حضورِ اکرم ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا بات ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے، اُس وقت تک ایک فرشتہ تمہاری طرف سے اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ ہٹ گیا۔ (ابوداود شریف، ۴۸۹٦)

اور یہ بات سمجھ میں بھی آنے والی ہے، مَیں آپ کو ایک مثال دوں کہ آپ کے دو بیٹے لڑ رہے ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کر رہا ہے، تو تھوڑی دیر تک آپ یہ تماشہ دیکھیں گے کہ ایک کی طرف سے دوسرے پر کیا زیادتی ہورہی ہے، اور جب آپ نے دیکھا کہ اس کی زیادتی ختم نہیں ہورہی ہے اور دوسرا اس کو کوئی جواب بھی نہیں دے رہا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اور جو زیادتی کر رہا ہے اس کو آپ خود سزا دیں گے۔ اور اگر آپ نے دیکھا کہ ایک نے کچھ کیا اور دوسرے نے بھی اس کا جواب دیدیا تو اب معاملہ نمٹ گیا، اب آپ کسی کی طرف سے کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ قدرت کی طرف سے بھی بندوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ خیر! تو یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔ آج کل یہ شکایت بہت عام ہوگئی ہے جیسا کہ آگے ایک دوسری روایت آرہی ہے۔

مؤمن کی سوچ بڑا بدلہ ہونی چاہیے

اور مَیں اس باب کے شروع میں بتلا چکا ہوں کہ مؤمن کا جو بھی عمل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوتا ہے، ہم اس کے ساتھ جو بھلائی کر رہے ہیں اور اس کے حقوق کو ادا کر رہے ہیں وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے، ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے کر رہے ہیں، اب اگر وہ اس

کے جواب میں ہمارے ساتھ بھلائی سے پیش نہیں آتا اور ہمارے حقوق ادا نہیں کرتا تو ہمیں دل گرفتہ ہونے اور پریشان وغمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے تو جو کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے کیا تھا، اور جس کا حکم پورا کرنے کے لیے ہم نے کیا ہے وہ ان شاء اللہ ہم کو دنیا اور آخرت میں ضرور بدلہ دے گا۔ بھائی! جس کے لیے کام کیا ہے وہاں سے تنخواہ لو، جیسے کسی آدمی کو بادشاہِ وقت نے کہا کہ فلاں کا یہ کام کردو، اور اس نے وہ کام کردیا، تو جس کا کام کیا ہے وہ آدمی اگر معاوضہ میں کچھ دینا چاہے گا تو یہ قبول کرے گا؟ نہیں کرے گا، بالکل منع کردے گا اور کہے گا کہ بادشاہ سلامت نے کام کرنے کا کہا ہے، اس لیے کیا ہے، مجھے تو وہاں سے بدلہ ملنے والا ہے۔ اور اگر اس نے یہاں سے قبول کرلیا تو وہاں سے جو بڑا بدلہ ملنے والا تھا وہ نہیں ملے گا۔

بہرحال! مؤمن جو بھی کرتا ہے وہ اللہ واسطے کرتا ہے، اس لیے جو آدمی یہ کہتا ہے کہ مَیں اس کے حقوق ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا، مَیں ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہوں وہ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں، اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ مَیں ان کے جو حقوق ادا کررہا ہوں یا ان کی باتوں پر تحمل و برداشت سے کام لے رہا ہوں وہ اس لیے کررہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے، اور مَیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کررہا ہوں، اور جس کا حکم پورا کررہا ہوں وہ مجھے ضرور بدلہ دے گا، یہ ہمارے ساتھ جو چاہے کرے، اسے ہمیں نہیں دیکھنا ہے۔ دراصل ہماری سوچ یہی ہونی چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچ لیں تو پھر سامنے والے کے کسی بھی سلوک کی وجہ سے کبھی ہمیں ناگواری نہیں ہوگی، ہمارے دل کو اطمینان ہوگا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کیا ہے۔ اگر آدمی کی یہ سوچ بن جائے تو کبھی اس کے معاملات میں تبدیلی نہیں آئے گی اور وہ

اپنے طرزِ عمل پر باقی رہے گا۔ہاں! دل پر ذرا اثر تو ہوتا ہے لیکن وہ اس سے صرفِ نظر کرتا ہے اوراس وقت نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات پیشِ نظر ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری مدد ہورہی ہے۔اس لیے یہ بڑی اہم اورضروری چیز ہے۔

جوآدمی روزی میں برکت کا طالب ہو

۳۱۹: عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَنُ أَحَبَّ أَن يُّبُسَطَ لَهُ فِیُ رِزُقِهٖ وَيُنُسَأَ لَهُ فِیُ أَثَرِهٖ فَلُيَصِلُ رَحِمَهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جوآدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی ہو،اس کو برکت والی روزی ملے،اوراس کی عمر کے اندرزیادتی ہوتو وہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے حقوق کواداکرے۔

افادات: گویارشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں یہ بدلہ ملتا ہے کہ اس کی روزی کشادہ ہوتی ہے اوراس کی عمرمیں برکت ہوتی ہے حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رشتہ داری ایسی چیز ہے کہ وہ جس طرح دنیامیں اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی،اسی طرح جب ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے گا تو دنیامیں زیادہ رہنے کا بھی ذریعہ بنے گی۔

ایک سوال اوراس کا جواب

اب یہاں بعض لوگوں کوسوال ہوتا ہے کہ عمرکی زیادتی اورروزی کی کشادگی کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ سب چیز تقدیرمیں لکھی جاچکی ہے؟ تواس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تقدیر کے مختلف طبقات ہیں،درجہ بدرجہ مختلف مراحل ہیں،مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ لکھا ہے کہ اگرآدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تواس کی روزی میں

کشادگی ہوگی اوراس کی عمر میں زیادتی ہوگی، یہ ایک مرحلہ ہوا، پھر دوسرے مرحلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے گا یا نہیں، اگر اس مرحلہ میں یہ بھی طے ہوگیا ہے کہ صلہ رحمی کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کی روزی میں کشادگی ہونے ہی والی ہے اور عمر بڑھنے والی ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ روزی میں کشادگی کا ذریعہ صلہ رحمی والا عمل بنا۔

بہرحال! یہ چیز دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہے اور آخرت میں بھی اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔ اوراس کے برعکس بھی ہے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ دنیا میں کسی نیکی کا بدلہ اتنا جلدی نہیں ملتا جتنا صلہ رحمی کا ملتا ہے۔ فوراً روزی میں برکت ہوتی ہے اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، اور کسی برائی کی سزا اتنی جلدی نہیں ملتی جتنی قطع رحمی کی ملتی ہے کہ اس کی وجہ سے فوری اثر روزی پر پڑتا ہے، روزی میں تنگی آتی ہے اور عمر کی برکت ختم ہوجاتی ہے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

۳۲۰۔وعنه رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ أَبُوطَلْحَةَ رضی اللہ عنہ أَكْثَرَالْأَنصَارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالاً مِّنْ نَخْلٍ، وَكَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ إِلَيْهِ بَيْرَحَاء،وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَالْمَسْجِدِ،وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَدْخُلُهَاوَيَشْرَبُ مِن مَّآءٍ فِيْهَاطَيِّبٍ۔قَالَ أنسٌ:فَلَمَّانَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّحَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾قَامَ أَبُوطَلْحَةَ إِلٰى رَسولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَارَسولَ اللّٰهِ!إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ أَنْزَلَ عَلَيْكَ﴿لَنْ تَنَالُوْاالْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾وَإِنَّ أَحَبَّ مَالِي إِلَيَّ بَيْرَحَآءُ، وَإِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالىٰ أَرْجُوْا بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَاللّٰهِ تَعَالىٰ،فَضَعْهَا يَارَسولَ اللّٰهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللّٰه. فَقَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: بَخٍ!ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ،ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ۔ وَقَدْسَمِعْتُ مَاقُلْتَ۔ وَإِنِّيْ أَرىٰ أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِيْنَ، فَقَالَ أَبُوطَلْحَةَ:أَفْعَلُ يَارَسُولَ اللّٰهِ، فَقَسَّمَهَا

أَبُوطَلْحَةَ فِيْ أَقَارِبِهِ، وَبَنِيْ عَمِّهِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سب سے زیادہ کھجور کے باغات کے مالک حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، اوران کوان میں سب سے زیادہ محبوب باغ ''بیرحاء'' تھا، اوروہ باغ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اورخود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار وہاں تشریف بھی لے جاتے تھے اوراس میں جو میٹھا پانی تھا اس کو نوش بھی فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی محبوب چیز کو خرچ نہ کرو، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اُٹھے اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے اورعرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، اورمیری جائیداد، اموال اورملکیتوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب مال ''بیرحاء'' نامی باغ ہے۔ لہٰذا یہ باغ میری طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ ہے، مَیں اس باغ کے خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ سے نیکی اور ثواب کی توقع اوراُمید رکھتا ہوں، اس لیے اے اللہ کے رسول! اس باغ کو آپ جہاں چاہیں صَرف کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ! یہ تو بڑا عمدہ اورنفع بخش مال ہے، یہ تو بڑا نفع بخش مال ہے، اورتم نے جو بات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ خود لے کر اس کو صَرف فرماتے، ان کو یہ مشورہ دیدیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جو غریب محتاج ہیں، آپ ان کو دیدیجئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اسی طرح کروں گا۔ اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس باغ کو اپنے چچازاد بھائیوں کے درمیان تقسیم کردیا۔

افادات: ''بیرحآء'' نامی باغ مسجدِ نبوی کے بالکل سامنے تھا، اب تو وہ جگہ بھی مسجدِ نبوی کے نئے اضافہ شدہ حصہ میں آچکی ہے، بابِ مجیدی کی طرف ایک پتھر پر بیرحاء لکھا ہوا بھی ہے۔

مَیں پہلے بھی بتلاچکا ہوں کہ آدمی جب خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے مال میں جو گھٹیا چیز ہوتی ہے اسی کو اختیار کرتا ہے، مثلاً ''کپڑے'' تو جو استعمال شدہ ہیں وہ دو۔ ''کھانا'' جو بچ گیا ہے وہ دو۔ چیزوں میں بھی جو اپنے کام کی نہیں رہی ہے وہ دو۔

عمر میں بھی جب آخری منزل آتی ہے، اور کاروبار کے لائق نہیں رہتا، تو کہتا ہے کہ اب مسجد میں بیٹھو۔ خیر! یہ ساری چیزوں کی توفیق بھی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے تو بڑی چیز ہے، لیکن یہ بات ہے کہ اگر آدمی اپنی چیزوں میں سے بڑھیا اور عمدہ چیزیں اگر اللہ کے لیے دینے لگے؛ تو اس کا بدلہ بھی بڑا ملے گا۔

بہر حال! جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو اِن چیزوں پر بڑھ چڑھ کر عمل کرنے والے تھے ہی، اس لیے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ تم نیکی کامل طور پر حاصل نہیں کر سکتے یہاں تک کہ جو مال تمہیں محبوب اور پسند ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، اور میری جائیدادوں میں جو مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ جائیداد ہے وہ بیرحاء نامی باغ ہے، اس کو مَیں اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہوں اور مَیں اس کی نیکی کی اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھتا ہوں اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ اس کی نیکی اللہ تعالیٰ کے یہاں میرے لیے ذخیرہ ہوگی، لہٰذا یارسول اللہ! یہ باغ آپ جہاں مناسب سمجھیں وہاں خرچ کردیں، آپ کو پورا اختیار دیتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ واہ واہ! یہ تو بہت بڑھیا اور عمدہ مال ہے اور تم نے جو کہا وہ مَیں نے سن لیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ دیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس باغ کو اپنے رشتہ داروں میں جو غریب ہیں ان کے درمیان تقسیم کردو۔ اس پر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ضرور مَیں اسی پر عمل کرتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے چچازاد بھائیوں میں وہ باغ تقسیم کردیا۔

تو رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ہوا اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ثواب بھی ملا۔

ماں باپ کی خدمت جہاد بھی اور ہجرت بھی

۳۲۱: وعن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص ﷺ قال: أَقْبَلَ رَجُلٌ اِلیٰ نَبِیِّ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: أُبَایِعُکَ عَلیٰ الْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ، أَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ۔ قَالَ: فَھَلْ لَّکَ مِنْ وَالِدَیْکَ أَحَدٌ حَیٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ بَلْ کِلاھُمَا۔ قَالَ: فَتَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ؟ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ: فَارْجِعْ اِلیٰ وَالِدَیْکَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَھُمَا۔

(متفق علیه) وھٰذالفظ مسلم۔

وفی روایة لھما: جَآءَ رَجُلٌ، فَاسْتَأْذَنَهُ فِی الْجِھَادِ، فَقَالَ: أَحَیٌّ وَالِدَاكَ؟ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ: فَفِیْھِمَا فَجَاھِدْ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں آپ کے ہاتھ پر جہاد کی اور ہجرت کی بیعت کرتا ہوں، اور اس بیعت سے میرا مقصود اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! دونوں زندہ ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: واقعتاً تو اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کی اچھی خدمت کرو۔

دوسری روایت میں ہے: ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں جہاد کرو۔

افادات: اس زمانہ میں جو لوگ ایمان لاتے تھے، وہ حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کی بیعت کرتے تھے۔ اور مَیں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ حقیقی نیکی اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر چلنا ہے، اپنی مرضی پر نہیں۔

اہم سے روک کر غیر اہم میں ڈالنا شیطانی حربہ ہے

اور شیطان کی عادت یہ ہے کہ وہ انسان کو نیک کام کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اس کی پہلی کوشش تو یہی ہوتی ہے آدمی نیکی کا ارادہ ہی نہ کرے، اور اگر اس نے ارادہ کرلیا تو پھر جو کام موقع کے اعتبار سے اہم اور ضروری ہوتا ہے اس کو چھڑوا کر غیر اہم کام کی اہمیت اس کے دل میں ڈال دیتا ہے تاکہ اگر ثواب پاوے تب بھی زیادہ نہ پاسکے، اسی لیے آدمی جو کام کر رہا ہو اس میں اپنا ذاتی فیصلہ کرنے کے بجائے اس معاملہ میں جو جانکار ہوں ان سے مشورہ لینا چاہیے کہ اس وقت میرے لیے کیا مناسب ہے۔

عام طور ہوتا یہ ہے کہ والدین موجود ہوتے ہیں اور وہ اس کی خدمت کے محتاج ہوتے ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے باجود ان کی خدمت کے بجائے وہ دوسرے کاموں میں لگا رہتا ہے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر چہ شریعت کے ضروری احکام کا علم حاصل کرنا ہر آدمی پر فرضِ عین ہے، لیکن اگر اس کے ماں باپ اس کی خدمت کے محتاج ہیں اور اس کے وہاں سے ہٹ جانے کی صورت میں ان کو ضرر ہوگا تو وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا، اس کے لیے وہیں ان کے پاس رہنا ضروری ہے۔ اور اگر وہ خدمت کے محتاج نہیں ہیں اور اجازت نہ دیں تو فرضِ عین کے لیے نکل سکتا ہے، لیکن فرضِ کفایہ کے لیے ان کی اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں ہے۔

بہر حال! شیطان یہ کرتا ہے کہ جو اہم چیز ہے اس سے اس کا دھیان ہٹا دیتا ہے اور غیر اہم کام میں اس کو مشغول کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ماں باپ کی خدمت کا موقع جب ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر جس کام میں لگا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اُدھر سے بھی دھیان ہٹا دیتا ہے۔ عام طور پر یہ

چیزیں آدمی کو پیش آتی ہیں، ایک قسم کا انتشار پیدا کرنا ہی شیطان کا کام ہے، ہر چیز میں اس کی ایسی کوشش لگی رہتی ہے، اس لیے آدمی کو پہلے سے اس سلسلہ میں اہلِ علم سے مشورہ کر کے آگے اقدام کرنا چاہیے، تا کہ اس کی نوبت نہ آئے۔

دوسری روایت میں ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں جہاد کرو یعنی ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔

صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟

۳۲۲۔وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيءِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَاقُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا. (رواه البخاری)

ترجمہ: انہی سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی برابر کا بدلہ دے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے جس کا حق ادا نہ کیا جائے لیکن وہ حق ادا کرتا رہے۔

افادات: عام طور پر رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں ہم لوگوں کا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ اگر وہ ہمارے ساتھ اچھائی کر رہا ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ اچھائی کریں گے، اور اگر وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا اور ہمارے حقوق ادا نہیں کرتا تو ہم بھی اس کے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کوئی سمجھاتا ہے تو کہتے ہیں کہ جب وہ ہمارے حق ادا نہیں کرتا تو ہم کیوں ادا کریں۔ حالانکہ ہم پر اس کے جو حقوق شریعت نے واجب کئے ہیں اس میں ایسی کوئی قید نہیں لگائی ہے کہ اگر وہ تمہارا حق ادا کرے تب ہی تم پر اس کا حق واجب ہوتا ہے۔ بلکہ ہم کو الگ سے یہ حکم دیا

گیا ہے کہ تم پر تمہارے رشتہ داروں کے یہ حقوق ہیں، اب ہم کو تو اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے، اگر ہم ان حقوق کو ادا نہیں کریں گے تو اس کے متعلق وہاں پوچھ ہوگی، وہاں ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ باری تعالیٰ! انہوں نے تو ہمارے حقوق ادا نہیں کئے تھے اس لیے ہم نے بھی ادا نہیں کئے۔ یہ جواب وہاں کارآمد بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اگر وہ ہمارے ساتھ اچھائی کا سلوک کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھائی کا سلوک کریں؛ اس کا نام صلہ رحمی نہیں ہے، یہ تو برابری کا معاملہ ہوا۔

بھائی! کوئی پرایا اور اجنبی آدمی جس کے ساتھ ہماری کوئی قرابت اور رشتہ داری نہیں ہے وہ بھی جب ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا تو اگر آدمی کی طبیعت کے اندر شرافت ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ بھلائی کرے گا، اس میں رشتہ داری کی کیا خصوصیت ہوئی۔ بلکہ کوئی کافر بھی ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا تو ہم اس کے ساتھ بھی بھلائی کریں گے، تو بھلائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرنا اس میں رشتہ داری کا معاملہ کہاں آتا ہے؟ یہ تو ایک الگ مسئلہ ہو گیا۔ صلہ رحمی کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کی تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے؛ فقط اسی کو سامنے رکھ کر آپ اس کے ساتھ بھلائی کیجئے، چاہے وہ آپ کے ساتھ بھلائی کرے یا نہ کرے، اسی کو حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں "لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي" جو آدمی بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کرے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ سامنے والا حق ادا نہیں کرتا تب بھی یہ اس کا حق ادا کرے۔

ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے

کوئی آپ کے ساتھ برائی کرتا ہے اور بدلہ میں آپ بھی اُس کے ساتھ برائی کریں؛

تو اُس میں اور آپ میں فرق کیا ہوا؟ آپ کو تو چاہیے کہ وہ برائی کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آئیں۔ عربی کا محاورہ ہے "کُلُّ اِنَآءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْهِ" ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ ہم تو اپنے اندر بھلائی ہی بھلائی بھرے رکھیں، پھل دار درخت پر اگر کوئی آدمی پتھر مارے تو جواب میں وہ پھل ہی دے گا، پتھر نہیں۔

ہارون رشید اور ایک غلام

ہارون الرشید بہت بڑا بادشاہ تھا، اس کی حکومت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ ایک مرتبہ ایک بادل جا رہا تھا اس کو دیکھ کر ہارون الرشید نے یوں کہا کہ اے بادل! تو کہیں بھی جا کر برس؛ تیرے پانی سے جو کھیتی پیدا ہوگی اس کا خراج میرے خزانے میں ہی آنے والا ہے۔ اتنی بڑی سلطنت تھی۔ خیر! یحییٰ بن اکثم ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑے تابعی گذرے ہیں، ایک مرتبہ انہوں نے ہارون الرشید کے یہاں رات گذاری، رات کے وقت بادشاہ سلامت کو پیاس لگی تو انہوں نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔ غلام نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا کہ دن میں بھی چین نہیں اور رات کو بھی چین سے سونے نہیں دیتے، ایسا کہہ کر پھر سو گیا۔ بادشاہ سلامت نے خود ہی اٹھ کر جا کر پانی لیا اور پیا۔ یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ مَیں نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ اس کو کوئی تنبیہ نہیں کرتے؟ غلام ہو کر اس طرح نامناسب جواب دیتا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اگر مَیں اس کو تنبیہ کروں گا تو مَیں اپنے اخلاق خراب کروں گا، اور مَیں اپنے اخلاق بگاڑ کر اس کے اخلاق سدھارنا نہیں چاہتا۔

پھر ایک وقت آئے گا

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رشتہ دار اگر ہمارے ساتھ بھلائی کریں تب ہی ہم اپنے

رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کریں؛اس کا نام صلہ رحمی نہیں ہے۔حضورﷺفرماتے ہیں کہ یہ تو برابر کا بدلہ ہوا،اور یہ رشتہ دار کی خصوصیت نہیں ہے،اجنبی آدمی بھی بھلائی کرے گا تو ہم اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں گے۔صلہ رحمی تو یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ برائی کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ بھلائی کریں،اس لیے یہی معاملہ ہونا چاہیے،ہمیں اپنی طرف سے وہی معاملہ کرنا چاہیے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔جیسے ایک کہاوت ہے کہ کتا کاٹے تو ہم جواب میں کاٹتے نہیں ہیں۔مطلب یہ ہے کہ کوئی برائی کا معاملہ کرے تو ہم جواب میں برائی کا معاملہ نہ کریں، بلکہ ہم تو اچھائی کا معاملہ ہی کریں،خاص کر رشتہ داروں کے معاملہ میں تو یہ بہت ہی ضروری ہے۔اگر اسی طرح سب سوچتے رہیں گے تو پھر آخر رشتہ داروں کے حقوق کیسے ادا ہوں گے؟ آپ تو ان کے ساتھ اس طرح پیش آتے رہیے کہ اگر کسی روز وہ آپ کے ساتھ تعلقات ٹھیک کرلیں تو آپ کو پشیمانی،ندامت اور پچھتاوے کی نوبت نہ آوے،اس کو زندگی بھر پچھتاوا رہے کہ وہ میرے ساتھ اب تک برابر اچھا سلوک کر رہا ہے،مَیں ہی نالائق ہوں،اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا،آپ کا ضمیر مطمئن رہے گا،آپ کے دل میں کبھی تکلیف نہیں ہوگی۔اور ہم اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لیے کریں، جب اس نیت سے کریں گے تو ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ جو ہمارے ساتھ بدسلوکی سے پیش آرہا ہے وہ بھی سدھر جائے گا اور اس کے حالات بھی درست ہوجائیں گے۔

رشتہ داری کی دعا

۲۲۳: وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت:قال رسول اللہ ﷺ:اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ: مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ،وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ.(متفق علیه)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشتہ داری عرش کے پاس لٹکی ہوئی یہ دعا کرتی رہتی ہے کہ جو مجھے جوڑے گا اللہ اسے جوڑیں گے اور جو مجھے توڑے گا اللہ اسے توڑیں گے۔

افضلیت موقع محل کے اعتبار سے ہوتی ہے

۲۲۴: عن أم المؤمنين ميمونة بنت الحارث رضى لله عنها أَنَّهَا أَعۡتَقَتۡ وَلِيۡدَةً، وَلَمۡ تَسۡتَأۡذِنِ النَّبِىَّ ﷺ۔ فَلَمَّا كَانَ يَوۡمُهَا الَّذِىۡ يَدُوۡرُ عَلَيۡهَا فِيۡهِ، قَالَتۡ: أَشَعَرۡتَ يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ! أَنِّىۡ أَعۡتَقۡتُ وَلِيۡدَتِىۡ؟ قَالَ: أَوَفَعَلۡتِ؟ قَالَتۡ: نَعَمۡ۔ قَالَ: أَمَا اِنَّكِ لَوۡ أَعۡطَيۡتِهَا أَخۡوَالَكِ كَانَ أَعۡظَمَ لِأَجۡرِكِ. (متفق عليه)

ترجمہ: اُم المؤمنین میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے ایک باندی آزاد کی، اوراس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ان کی باری کا دن آیا اور نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی۔ حضور ﷺ نے پوچھا: اچھا! ایسا کرچکی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آزاد کرچکی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تم کو زیادہ ثواب ملتا۔

افادات: نبی کریم ﷺ کی نو (۹) ازواجِ مطہرات تھیں اور ہر ایک کی ایک ایک دن کی باری تھی، اس طرح نویں دن ایک کی باری آتی تھی، جب ان کی باری کا دن آیا اور نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی۔ غلام و باندی کو آزاد کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی ایک غلام یا باندی کو آزاد کردے تو اللہ تعالیٰ اس آزاد ہونے والے غلام کے ہر ہر عضو کے بدلہ میں آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو جہنم سے رہائی عطا فرمائیں گے۔ خیر! انہوں نے اطلاع

دی کہ آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی؟ حضور ﷺ نے پوچھا: اچھا! ایسا کرچکی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آزاد کرچکی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تم کو زیادہ ثواب ملتا۔

حالانکہ آزاد کرنا بہت بڑی فضیلت والا کام ہے لیکن دراصل ان کے ماموں کو باندی اور نوکرانی کی ضرورت تھی، اس لیے حضور ﷺ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اس کو باندی باقی رکھتے ہوئے ماموؤں کو ہدیہ دے دیتیں تو تم کو ثواب زیادہ ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بظاہر کسی کام کو ہم زیادہ بڑا سمجھتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا کام دوسری حیثیت سے ثواب میں بڑھ جاتا ہے۔ چوں کہ یہاں باندی ان کو ہدیہ کرنی تھی اور ساتھ ہی ان کی ضرورت پوری کرنی تھی اور پھر ساتھ ہی رشتہ داری کے حق کو بھی ادا کرنا تھا؛ یہ ساری باتیں پائی گئیں اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ثواب زیادہ تھا۔ ویسے تو باندی کو آزاد کرنا کسی کو ہدیہ کرنے کے مقابلہ میں فضیلت کی چیز ہے، لیکن یہاں دوسری حیثیت سے ثواب بڑھ جاتا۔

غیر مسلم رشتہ دار اور حسنِ سلوک

۳۲۵: عن أسماءَ بنتِ أَبِیْ بَکْرٍ الصِّدِّیْقِ رضی اللّٰہ عنہا قَالَتْ: قَدِمَتْ عَلَیَّ أُمِّیْ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ، فَاسْتَفْتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قُلْتُ: قَدِمَتْ عَلَیَّ أُمِّیْ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ، أَفَأَصِلُ أُمِّیْ؟ قَالَ: نَعَمْ، صِلِیْ أُمَّكِ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میری والدہ جو مشرکہ تھیں صلح والے زمانہ میں مجھ سے ملنے مدینہ آئیں تو مَیں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں میرے یہاں کچھ ضرورت لیکر آئی ہیں، کیا مَیں ان کی ضرورت پوری کردوں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ان کی ضرورت کو پورا کرو، اور ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔

افادات: حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، ان کی والدہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام نہ لانے کی وجہ سے طلاق دے کر الگ کردیا تھا، اور پھر وہ دوسرے کے نکاح میں تھیں، جب ٦ سنہ ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ والوں کے ساتھ صلح ہوئی تو مکہ والوں کا مدینہ منورہ آنا جانا شروع ہوگیا، اور حضرت اسماء کی والدہ جو مشرکہ تھیں، وہ بھی اپنی بیٹی کے پاس اسی زمانہ میں مکہ سے مدینہ منورہ ملنے کے واسطے آئیں تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میری ماں میرے یہاں کچھ درخواست اور ضرورت لے کر آئی ہیں، تو کیا میں ان کی وہ ضرورت پوری کردوں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ چوں کہ وہ غیر مسلمہ تھیں اس لیے پوچھنا پڑا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جی ہاں! ان کی ضرورت کو پورا کرو، اور ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔

مطلب یہ ہوا کہ رشتہ دار اگر غیر مسلم ہو تب بھی ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا چاہیے۔ ماں باپ اگر غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ تو حسنِ سلوک کا حکم قرآنِ پاک کی اس آیت کے ذیل میں گذر چکا جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے موقع پر نازل ہوئی تھی، اور وہاں تفصیل بتلادی تھی۔

بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

اور

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

۱۴ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱/ مئی ۱۹۹۹ء

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کی تاکید کے سلسلہ میں بیان چل رہا ہے اسی سلسلہ میں ایک اور روایت پیش کر رہے ہیں۔

۳۲۶: عَنْ زَيْنَبَ الثَّقَفِيَّةِ امْرَأَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ وعنہا قالتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَصَدَّقْنَ يَامَعْشَرَ النِّسَآءِ وَلَوْمِنْ حُلِيِّكُنَّ۔ قَالَتْ: فَرَجَعْتُ اِلٰى عبدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ فَقُلْتُ لَهٗ: اِنَّكَ رَجُلٌ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ، وَاِنَّ رَسولَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ أَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ، فَأْتِهِ، فَاسْأَلْهُ، فَاِنْ كَانَ ذٰلِكَ يُجْزِیءُ عَنِّیْ، وَاِلَّا صَرَفْتُهَا اِلٰى غَيْرِكُمْ۔ فَقَالَ عبدُاللّٰهِ: بَلِ ائْتِيْهِ أَنْتِ۔ فَانْطَلَقْتُ، فَاِذَا امْرَأَةٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، حَاجَتِیْ حَاجَتُهَا، وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَدْ أُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ، فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ، فَقُلْنَا لَهٗ: اِئْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، فَأَخْبِرْهُ أَنَّ امْرَأَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْأَلَانِكَ، أَتُجْزِیءُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى أَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى أَيْتَامٍ فِیْ حُجُوْرِهِمَا؟ وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ۔ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَسَأَلَهٗ، فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ا: مَنْ هُمَا؟ قَالَ: اِمْرَأَةٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَ زَيْنَبُ۔ فَقَالَ رَسَوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَیُّ الزَّيَانِبِ هِیَ؟ قَالَ: اِمْرَأَةُ عَبْدِاللّٰهِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَهُمَا أَجْرَانِ، أَجْرُالْقَرَابَةِ، وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کرو چاہے اپنے زیورات ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ جب میں مجلسِ وعظ سے واپس اپنے شوہر کے گھر لوٹی، تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ (آج نبی کریم ﷺ نے ہم کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی، اور اس ترغیب کی وجہ سے میں

اللہ کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا چاہتی ہوں، اب چوں کہ) آپ کے پاس ہی کچھ نہیں ہے اس لیے آپ نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر پوچھیں کہ مَیں جو کچھ اللہ کے راستہ میں نکالنا چاہتی ہوں؛ کیا وہ آپ کو دے سکتی ہوں؟ ورنہ پھر کسی دوسرے پر خرچ کروں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں تو نہیں جاتا، تم ہی جاؤ اور پوچھو۔ حضرت زینب فرماتی ہیں کہ مَیں پوچھنے کے لیے حضور ﷺ کے درِاقدس پر گئی تو دیکھا کہ ایک اور انصاری عورت بھی اسی مقصد سے حضور کے دروازہ پر آئی ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قدرتی طور پر ایک ہیبت عطا فرمائی تھی کہ جس کی وجہ سے کوئی آدمی جلدی سے آپ سے کوئی سوال نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس سلسلہ میں پوچھنے کے واسطہ ہم جھجک رہی تھیں اور آپ کے دروازہ پر ہی کھڑی تھیں کہ اچانک حضرت بلال رضی اللہ عنہ گھر سے نکلے، تو ان دونوں نے حضرت بلال سے کہا کہ آپ حضورِ اقدس ﷺ کے پاس تشریف لے جائیے اور بتلائیے کہ دروازہ پر دو عورتیں کھڑی ہیں اور آپ سے یہ سوال پوچھ رہی ہیں کہ صدقہ اگر ہم اپنے شوہروں پر کریں اور ہماری گود میں جو یتیم بچے پرورش پا رہے ہیں ان پر اگر خرچ کریں؛ تو کافی ہے یا نہیں؟ اور نبی کریم ﷺ کو یہ مت بتلائیو کہ ہم کون ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور ان کا مسئلہ پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ پوچھنے والیاں کون ہیں؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتلا دیا کہ ایک انصاری عورت ہے اور ایک زینب ہیں، تو حضور اکرم ﷺ نے پوچھا کہ کون سی زینب ہے؟ کہا کہ حضرت ابن مسعود کی اہلیہ۔ پھر نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ان کو بتلا دو کہ ان کو دوہرا اور ڈبل ثواب ملے گا، ایک تو صلہ رحمی کا اور ساتھ ہی ساتھ صدقہ کا ثواب بھی ملے گا۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق

افادات: (۱) نبی کریم ﷺ کے گھریلو امور حضرت بلال رضی اللہ عنہ انجام دیا کرتے تھے، خاص کر جو مال آتا جاتا تھا اس کا حساب و کتاب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس ہی رہا کرتا تھا، جو مہمان آتے تھے ان کی ذمہ داری بھی انہی کے سر تھی، اور وہی انتظام کرتے تھے، کبھی پیسے نہ ہوتے تو وہی کہیں سے قرض لے آتے تھے، بعد میں جب نبی کریم ﷺ کے پاس مال آتا تھا تو ادا کر دیا کرتے تھے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے واسطہ جو مال خرچ کیا جائے اس کو صدقہ کہتے ہیں، اب اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے؛ تو وہ صدقاتِ واجبہ میں شمار ہوگا۔ اور اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے، لیکن آدمی اپنے طور پر اللہ کے لیے مال نکال رہا ہے؛ تو وہ صدقاتِ نافلہ میں شمار ہوگا۔ صدقہ کا مطلب ہی ہوتا ہے وہ مال جو اللہ کے واسطہ نکالا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی کو دیا جائے یعنی اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو۔ اس کے علاوہ ایک ہدیہ ہوتا ہے، اس میں جس کو دیا جاتا ہے اس کو خوش کرنا مقصود ہوا کرتا ہے، اس میں بھی ثواب ملتا ہے، لیکن ایک الگ حیثیت سے ملا کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہدیہ میں آپس میں محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال! عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہدیہ ایک الگ چیز ہے اور صدقہ الگ چیز ہے۔

اور صدقہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک واجب اور دوسرا نفل۔ واجب تو انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جو محتاج ہوں، جن کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف نفل صدقہ کے لیے کوئی قید نہیں ہے وہ کسی کو بھی آپ دے سکتے ہیں، مسلمان ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب، البتہ اگر امیر کو دیں گے تو صدقہ نہیں بلکہ ہدیہ کہلائے گا، چاہے آپ دل میں صدقہ کی نیت کریں تب بھی وہ ہدیہ ہی کہلائے گا۔ کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے۔

(۳) حدیث سے معلوم ہوا کہ نفلی صدقہ اپنی اولاد اور شوہر کو بھی دے سکتے ہیں۔

زکوٰۃ اصل زیور ہی میں ہے

تو نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو تاکید فرمائی کہ اے عورتوں کی جماعت! اللہ کے واسطہ مال کو خرچ کرو، چاہے اپنے زیورات ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ یعنی کوئی مال نہیں

ہے تو زیور ہی کو اللہ کے واسطہ خرچ کرو۔ چوں کہ عورتیں زیور کے معاملہ بہت زیادہ بخل سے کام لیتی ہیں، یہاں تک کہ زیور کی جو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اس کی ادائیگی کے لیے بھی اگر پیسے نہ ہوں تو زکوٰۃ ادا نہیں کریں گی، اور اس میں تاخیر کریں گی۔ حالانکہ زکوٰۃ جو فرض ہوتی ہے وہ اصل اسی مال میں فرض ہوتی ہے جس پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے مثلاً زیور ہے تو مان لیجئے کہ اگر کسی کے پاس دس تولہ زیور ہے تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر واجب ہوگا، تو وہ اس زیور ہی میں واجب ہوتا ہے، اب ہم جو پیسے دیتے ہیں تو وہ اس کے بدلہ میں ہوجاتا ہے، اور اس سے بھی زکوٰۃ ادا تو ہوجاتی ہے، ورنہ اصل زکوٰۃ جو واجب ہوئی وہ تو اسی زیور کا چالیسواں حصہ واجب ہوا ہے، اسی کو نکالنا چاہیے، لیکن اگر کوئی آدمی اس زیور کا چالیسواں حصہ نکالنے کے بجائے اس چالیسویں حصہ کی قیمت ادا کردے؛ تب بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔ عام طور پر عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ ہمارے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ معاف ہوجاتی ہے، بلکہ ایسی صورت میں جس زیور میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس زیور ہی کا چالیسواں حصہ نکالا جائے اور اسی کو زکوٰۃ کے طور پر دیدیا جائے، اس میں تاخیر نہ کی جائے۔

بنیادی تعلیمات میں سے صلہ رحمی بھی ہے

٣٢٧: وعن أبی سفیانَ صَخرِبنِ حَرْبٍ رضی اللہ عنہ فِیْ حَدِیْثِهِ الطَّوِیْلِ فِیْ قِصَّةِ هِرَقْلَ، أَنَّ هِرَقْلَ قَالَ لِأَبِیْ سُفْیَانَ: فَمَاذَا یَأْمُرُکُمْ بِهِ؟ یَعْنِی النَّبِیَّ ﷺ، قَالَ قُلْتُ یَقُوْلُ: أُعْبُدُوااللّٰه وَحْدَهُ، وَلَاتُشْرِکُوْابِهِ شَیْئاً، وَاتْرُکُوْامَایَقُوْلُ آبَاءُکُمْ وَیَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ.

ترجمہ: حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی روایت منقول ہے جس میں ہرقل والا پورا واقعہ

موجود ہے،اس میں ہرقل نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ یہ نبی جوتمہارے درمیان آئے ہیں وہ تم کوکس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ابوسفیان کہتے ہیں کہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ وہ ہمیں جن چیزوں کا حکم دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو،اس کے علاوہ کسی اور کی پوجا مت کرو، اس کے ساتھ کسی اور کوشریک نہ ٹھہراؤ۔اورتمہارے آباء واجداد اور پرانے لوگ جو شرکیہ باتیں کہا کرتے تھے ان سب کو چھوڑ دو۔اور یہ نبی ہم کونماز کا،سچائی کا، پاکدامنی کا،اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتے ہیں۔

افادات: یہ روایت پہلے بھی کئی موقعوں پر آ چکی ہے۔نبی کریم ﷺ نے جب دنیا کے مختلف حکمرانوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے،تو قیصرِ روم جس کا نام ہرقل تھا اس کو بھی نبی کریم ﷺ نے نامۂ مبارکہ روانہ کیا،حضرت دحیہ کلبیؓ وہ خط لے کر گئے تھے،اور بُصریٰ جوشام کے علاقہ میں ایک جگہ ہے وہاں کا حاکم اس ہرقل کے ماتحت تھا اس کے حوالہ کیا اور اس نے وہ خط ہرقل تک پہنچایا۔ہرقل نے بیت المقدس کی زیارت کی منت مانی تھی اوراس منت کو پورا کرنے کے لیے اس زمانہ میں ہرقل شام ہی آیا ہوا تھا،اس کو وہ خط وہیں پہنچایا گیا اوراس کو بتلایا گیا کہ یہ خط عرب سے ایک شخص نے آپ کے نام بھیجا ہے اور وہ شخص اپنے آپ کو اللہ کا بھیجا ہوا نبی کہتے ہیں۔تو ہرقل نے نبی کریم ﷺ کا وہ نامۂ مبارک کھول کر پڑھنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ آپ ﷺ کے متعلق تحقیق کر لی جائے کہ جنھوں نے یہ خط میرے پاس بھیجا ہے وہ کون ہیں؟ وہ خود بھی کتبِ سابقہ کا بڑا عالم تھا،اس زمانہ میں نصاریٰ میں دو بڑے عالم تھے ایک تو یہ خود ہرقل اور دوسرا ضَغَاطِرُ نامی آدمی تھا جو اُن کا مذہبی پیشوا (لاٹ پادری) تھا۔اس لیے اس نے پوچھا کہ جہاں سے یہ خط آیا ہے اس علاقہ کے کچھ لوگ یہاں ہیں؟اس زمانہ میں

نبی کریم ﷺ کی قریش کے ساتھ صلح ہو چکی تھی اور قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام پہنچا ہوا تھا اور اس قافلہ کے سردار ابوسفیان تھے جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس وقت قریشِ مکہ کے سرغنہ یہی تھے۔ چنانچہ بتلایا گیا کہ ایک تجارتی قافلہ آیا ہوا ہے، تو ہرقل نے دربار قائم کیا اور ان قافلہ والوں کو بلایا اور اپنے سامنے ان سب کو بٹھایا اور پوچھا کہ تمہارے قافلہ میں ان خط بھیجنے والی شخصیت کا نسبی اور خاندانی اعتبار سے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ مَیں ہوں۔ چنانچہ ان کو سب سے آگے بٹھایا اور باقی سب کو ان کے پیچھے بٹھایا اور ان سے کہا کہ مَیں ان سے کچھ سوالات کرتا ہوں، اگر یہ درست جواب دیں تب تو ٹھیک ہے، اور اگر کوئی غلط جواب دیں تو تم لوگ بتلا دینا اور پھر اس نے کچھ سوالات کئے، ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا "فَمَاذَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ؟" یہ نبی جو تم میں آئے ہیں، تم کو کس چیز کا حکم دیتے ہیں اور کون سے کام کرنے کی تاکید کرتے ہیں؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ وہ ہمیں جن چیزوں کا حکم دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کسی اور کی پوجا مت کرو اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور تمہارے آباء واجداد اور پرانے لوگ جو شرکیہ باتیں کہا کرتے تھے ان سب کو چھوڑ دو۔ اور یہ نبی ہم کو نماز کا، سچائی کا، پاک دامنی کا، اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتے ہیں۔

بس! یہاں اس روایت کو اسی لیے پیش کیا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات جن کو تمام اہلِ عرب جانتے تھے، اور وہ لوگ جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے ان کو بھی جب پوچھا گیا تو ابوسفیان نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کی اہم اور بنیادی چیزیں

ہرقل کے سامنے پیش کیں، ان میں رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی تذکرہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی تھی اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اس لیے اس چیز کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

مصر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

۳۲۸: وعنْ أَبی ذرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ : اِنَّكُمْ سَتَفْتَحُوْنَ أَرْضاً يُذْكَرُ فِيْهَا الْقِيْرَاطُ.

وفی رواية: سَتَفْتَحُوْنَ مِصْرَوَهِيَ أَرْضٌ يُسَمّٰى فِيْهَاالْقِيْرَاطُ، فَاسْتَوْصُوْا بِأَهْلِهَا خَيْراً، فَاِنَّ لَهُمْ ذِمَّةًوَرَحِماً.

وفی رواية: فَاِذَا افْتَتَحْتُمُوْهَا، فَأَحْسِنُوْااِلىٰ أَهْلِهَا، فَاِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَرَحِماً. أوقال: ذِمَّةً وَصِهْراً. (رواه مسلم)

قال العلماءُ: الرَّحِمُ الَّتِیْ لَهُمْ كَوْنُ هَاجَرَأُمّ اِسْمَاعِيْلَ علیہ السلام مِنْهُمْ. ((وَالصِّهْرُ)): كَوْنُ مَارِيَةَ أُمّ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْهُمْ۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم ایک سرزمین اور ملک فتح کرو گے جہاں قیراط کا سکہ چلتا ہے۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اس ملک کو فتح کرو تو وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اس لیے کہ وہاں کے رہنے والے ذمی بن کر تمہارے ماتحت رہیں گے، اور ان کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے۔ علماء نے فرمایا کہ قریش کی یہ رشتہ داری حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ کی وجہ سے تھی کہ وہ اصلاً مصر کی رہنے والی تھیں۔ اور سسرالی رشتہ داری اس طرح تھی کہ نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ ماریہ قبطیہ کا تعلق مصر سے تھا۔

افادات: دس قیراط کا ایک درہم ہوا کرتا ہے اس روایت میں جس ملک کی

طرف اشارہ کیا ہے وہ ملکِ مصر ہے، جس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت مصر فتح نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وہ فتح ہوا اور اس کو فتح کرنے والے لشکر کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی سے پیشین گوئی فرما دی تھی کہ جس ملک میں قیراط کا سکہ چلتا ہے، اس ملک کو تم لوگ فتح کرو گے، اور ساتھ ہی آپ نے یہ ہدایت وتاکید بھی فرمائی تھی کہ اس ملک کے رہنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ اور اس کی وجہ یہ بتلائی تھی کہ جب تم اس ملک کو فتح کرو گے تو وہاں کے رہنے والے ذمی بن کر تمہارے ماتحت رہیں گے۔

اسلام میں ذمی کے حقوق کی رعایت

جو لوگ اسلام قبول کرلیں ان کے لیے تو وہی احکام ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان کو جان و مال وغیرہ کی وہ ساری سہولتیں اور فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں جو مسلمانوں کو دئے جاتے ہیں، لیکن ذمی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ملک میں جو غیر مسلم آباد ہیں، وہ لوگ جب اسلامی حکومت کو تسلیم کرلیں اور وہیں رہائش منظور کرلیں تو ان کو کچھ خراج اور ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے، اور اس خراج کی ادائیگی کے بدلہ میں ان کو بھی جان اور مال کی حفاظت کی وہی گارنٹی دی جاتی ہے جو ایک مسلمان کے لیے ہوا کرتی ہے، بلکہ ان کے لیے مزید سہولت یہ ہے کہ اگر کبھی دشمن کی طرف سے کوئی حملہ ہو، یا دشمن سے مقابلہ کی نوبت آئے تو ہر مسلمان کا فرض ہوتا ہے کہ اگر حاکم کی طرف سے کہا جائے یا جہاد کا عام اعلان ہو تو وہ مقابلہ کے لیے باہر نکلے، لیکن غیر مسلم رعایا پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، اور مذہبی پوری پوری آزادی بھی ان کو حاصل ہوتی ہے یعنی اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر پوری آزادی سے عمل کرسکتے ہیں۔

مصر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وجہ

بہر حال! ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ایک وجہ تو یہ بتلائی کہ جب وہ اسلامی حکومت میں داخل ہوں گے تو عقدِ ذمہ (یعنی ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا اس) کی وجہ سے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔ اور حضور ﷺ نے دوسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ ان کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے۔ وہ رشتہ داری کون سی ہے؟ یہ عرب والے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، قریش ان ہی سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ تمہاری رشتہ داری بھی ہے۔ یہاں بتلانا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کتنی دور کی رشتہ داری کا لحاظ فرمایا، اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کئی پیڑھیوں اور نسلوں کے بعد نبی کریم ﷺ کا زمانہ آتا ہے، لیکن اس رشتہ داری کے لحاظ کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی اور اسی کی بنیاد پر اس ملک کے رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رشتہ داری کے کتنے حقوق ہیں۔ اور جتنی قریبی رشتہ داری ہوگی اتنے زیادہ حقوق عائد ہوں گے اور اس کا اتنا ہی لحاظ بھی کیا جائے گا۔

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ سسرالی رشتہ بھی ہے یعنی نبی کریم ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن سے نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تھے وہ بھی مصر ہی کی رہنے والی تھیں، تو اس سسرالی رشتہ کا بھی لحاظ کیا گیا۔

اپنے رشتہ داروں کو ڈرایئے

۳۲۹: وعن أبی هریرة رضی الله عنه قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ ﴿وَأَنْذِرْ

عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ دَعَارَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قُرَيْشاً،فَاجْتَمَعُوْا،فَعَمَّ وَخَصَّ۔ وَقَالَ:يَابَنِيْ عَبْدِشَمْسٍ يَا بَنِيْ كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ! أَنْقِذُوْاأَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ،يَابَنِيْ مُرَّةَبْنِ كَعْبٍ! أَنْقِذُوْاأَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِيْ عَبْدِمَنَافٍ! أَنْقِذُوْاأَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِيْ هَاشِمٍ! أَنْقِذُوْاأَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ! أَنْقِذُوْا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ،يَافَاطِمَةُ!أَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ،فَإِنِّيْ لاأَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً،غَيْرَأَنَّ لَكُمْ رَحِماً،سَأَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا۔(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآنِ پاک کی یہ آیت ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی، کہ آپ اپنے قریبی خاندان والوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایئے،تو نبی کریم ﷺ نے تمام قبیلۂ قریش کو بلایا جب سب جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے عمومی اور خصوصی انداز میں خطاب فرمایا، کہ اے بنوعبد شمس اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے بنوکعب بن لوی! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے بنومرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے بنوعبدمناف! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے بنوہاشم! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے بنوعبدالمطلب! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔میں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، البتہ تمہاری میرے ساتھ رشتہ داری ہے،اس کو میں تر کرتا رہوں گا۔

افادات: بنوعبدمناف نبی کریم ﷺ کے والدصاحب کے پردادااور ہاشم کے والد ہوتے ہیں۔اور آپ ﷺ اوپر سے شروع فرما کر نیچے تک آئے، یہاں تک کہ اپنی صاحبزادی کو بھی خصوصی خطاب فرمایا۔اور نبی کریم ﷺ نے اپنے والدصاحب کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ حضرت عبداللہ کی اولاد میں صرف آپ ﷺ تھے۔لیکن دادا کی اولاد میں دوسرے چچااوران کی اولاد تھیں،اس لیے ان کا نام لیااوراس کے بعد اپنی صاحبزادی کا نام لیا۔یہاں نبی کریم ﷺ نے تمام خاندان والوں کوالگ الگ خطاب فرمایا۔بتلانا یہی

چاہتے ہیں کہ دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے اپنے اہلِ خاندان کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے کا حکم دیا تھا، اس حکم کو پورا کرنے کے لیے آپ ﷺ نے تمام کو الگ الگ خطاب فرمایا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جوں جوں آدمی کے نسب کا سلسلہ بڑھتا ہے، توں توں ان کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں، پھر قریب والے کا حق ادا کرنے کے بعد اس کے بعد والے کا، اور پھر اس کے بعد والے کا حق آتا ہے، اس لیے ان تمام کا خیال رکھا جائے۔

پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ، یعنی اگر تم اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو گے اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤ گے تب ہی جہنم کی آگ سے بچ سکو گے، مَیں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں یعنی اس معاملہ میں میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ویسے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی، لیکن اگر کوئی آدمی ایمان نہیں لائے گا تو اس کے حق میں شفاعت کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! البتہ تمہاری میرے ساتھ رشتہ داری ہے، مطلب یہ ہے کہ تم ایمان لے آؤ، اور اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے چھڑالو، اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر مَیں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا، اس کے باوجود چوں کہ تمہارے ساتھ میری رشتہ داری رہے گی، اس کے حقوق کی ادائیگی کا مَیں خیال کروں گا، اور اس کو تر کرتا رہوں گا یعنی تراوٹ اور نمی پہنچاتا رہوں گا، مطلب یہ ہے کہ تمہاری رشتہ داری کی حیثیت سے جو حقوق میرے اوپر عائد ہوتے ہیں ان کو تو یقیناً دنیا کے اندر مَیں ادا کروں گا، لیکن اگر ایمان قبول نہیں کیا اور اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے نہیں بچایا تو پھر مجھے آخرت میں تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں ہوگا۔

رشتہ داری کے حق کی ادائیگی میں کفر مانع نہیں

۳۳۰۔وعن أبی عبداللّٰہ عمروبن العاص رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم جِهَاراً غَيْرَ سِرٍّ يَقُولُ: اِنَّ آلَ بَنِىْ فُلَانٍ لَيْسُوْا بِأَوْلِيَآئِىْ، اِنَّمَا وَلِيِّىَ اللّٰهُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَلٰكِنْ لَّهُمْ رَحِماً أَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کھل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یعنی یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آل بنوفلان میرے دوست اور ساتھی نہیں ہیں، میرے ساتھی تو اللہ تعالیٰ اور نیک ایمان والے ہیں،لیکن ان کے ساتھ میری رشتہ داری ہے،مَیں اس کو نمی پہنچاتا رہوں گا۔

افادات: ''آل بنوفلان'' کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ جن کی رشتہ داریاں تھیں ان میں سے کسی کا تذکرہ کیا۔بعض شرّاح فرماتے ہیں کہ آپ نے ابوطالب کا تذکرہ کیا تھا۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فلاں خاندان والے اگرچہ ایمان نہیں لائے لیکن ان کے ساتھ میری رشتہ داری ہے،اوران کے حقوق کوادا کرنے کامَیں اہتمام کروں گا اوراس رشتہ کا خیال رکھوں گا،اس کو نمی پہنچاتا رہوں گا۔اس سے معلوم ہوا کہ رشتہ داری کی وجہ سے آدمی پر جو حق آتا ہے اس کی ادائیگی میں کفر بھی مانع نہیں ہے۔

جنت اور جہنم والے اعمال

۱۳۳:وعن أبی أیوب خالدبن زیدالأنصاری أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنِىْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِى الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِىْ مِنَ النَّارِ۔فَقَالَ النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم: تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً،وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِى الزَّكٰوةَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ.(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرادے اور جہنم سے دور کردے،اس کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو،اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔

اس صدقہ پر دوہرا اجروثواب ہے

٣٣٢: وعن سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ عن النَّبِیّ ﷺ قالَ: اِذَاأَفُطَرَأَحَدُکُمُ فَلُیُفُطِرُ عَلیٰ تَمُرٍفَاِنَّهُ بَرَکَةٌ، فَاِنُ لَّمُ یَجِدُتَمُراًفَالُمَآءُ، فَاِنَّهُ طَهُورٌ، وَقَالَ: اَلصَّدَقَةُ عَلیٰ الُمِسُکِیُنِ صَدَقَةٌ، وَعَلیٰ ذِی الرَّحِمِ ثِنُتَانِ: صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ. (رواه الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ: حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے، اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرے، اس لیے کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی غریب پر صدقہ کرنے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ہے اور کسی رشتہ دار پر صدقہ کرنے میں (صدقہ اور صلہ رحمی کا) دوہرا ثواب ہے۔

افادات: بتلانا یہ چاہتے ہیں اگر آدمی صدقہ کرنا چاہتا ہو تو پہلے اس کو دیکھ لینا چاہیے کہ اگر اس کے رشتہ داروں میں کوئی ایسا ہے جو اس صدقہ کا اہل ہے تو پہلے اسی پر صدقہ کرے۔ پہلے بھی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت گذر چکی ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ مَیں نے ایک باندی آزاد کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آزاد کرنے کے بجائے تم اپنے ماموؤں کو دے دیتیں، تو تم کو زیادہ ثواب ملتا، حالانکہ آزاد کرنے کا بڑا اجروثواب ہے لیکن چوں کہ وہاں ان کے ماموؤں کو ضرورت تھی اس لیے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بیٹے سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کا کہہ سکتا ہے؟

٣٣٣: وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَتُ تَحُتِیُ امُرَأَةٌ وَکُنُتُ أُحِبُّهَا

وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا، فَقَالَ لِيْ: طَلِّقْهَا، فَأَبَيْتُ، فَأَتَىٰ عُمَرُ رضی اللہ عنہ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: طَلِّقْهَا. (رواه أبوداود والترمذي وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی، مَیں اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ وہ عورت میرے نکاح میں رہے، اس لیے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مَیں اس کو طلاق دیدوں، لیکن مَیں نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو طلاق دیدو۔

افادات: ظاہر ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے آدمی طلاق کا حکم دے رہے ہیں تو بلاوجہ تو نہیں کہتے ہوں گے۔ شرّاح نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ تعلق ہونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ان کو کوئی دینی ضرر پہنچے۔ اسی حدیث کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ نے تو علی الاطلاق لکھا ہے کہ اگر والدین کسی بیٹے سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کے لیے کہیں تو اس کو طلاق دے دینی چاہیے یعنی اگر دین کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو اور والدین طلاق دینے کا کہیں تو طلاق دیدے۔ لیکن دوسرے حضرات لکھتے ہیں کہ اگر والدین کا یہ مطالبہ بے جا ہے اور ناانصافی سے وہ ایسا حکم دیتے ہیں، تو اس حکم کو ماننا ضروری نہیں ہے۔

زیادتیاں دونوں طرف سے ہوتی ہیں

اس سلسلہ میں حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کا ایک رسالہ ''تعدیلِ حقوقِ والدین'' کے نام سے بہشتی زیور کے ضمیمہ کے طور پر نویں حصہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ چوں کہ ہمارے معاشرہ میں زیادتیاں دونوں طرف سے ہوتی ہیں، کہیں تو صاحبزادے کو بیوی

کے ساتھ اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا، اور کہیں ماں باپ کے ساتھ اتنا زیادہ تعلق ہوتا ہے کہ بیوی کی حق تلفی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے اس رسالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں کو اعتدال کا خیال رکھنا چاہیے اور خاص کر والدین اگر پڑھے لکھے اور شریعت کے احکام سے واقف ہوں تو ان کو تو اعتدال کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

بہرحال! یہاں تو طلاق کا مطالبہ کرنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور ظاہر ہے کہ وہ تو شریعت کے احکام سے واقف تھے اور جن کی رائے کے موافق وحی نازل ہوا کرتی تھی۔ پندرہ مواقع ایسے ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق وحی نازل ہوئی ہے، اس لیے وہ کوئی ایسی نامناسب بات نہیں کہیں گے۔ لہٰذا والدین اگر شرعی احکام سے واقف ہیں اور وہ حکم دے رہے ہیں تو پھر یقیناً اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ احکامِ شرع سے واقف نہیں ہیں اور وہ ایسا حکم دے رہے ہیں تو پھر اس صورت میں اہلِ علم سے مشورہ کرلیا جائے۔

جنت کا سب سے عمدہ دروازہ

٣٣٤: وعن أبی الدرداء رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلًا أَتَاهُ فَقَالَ: اِنَّ لِیُ امْرَأَةً وَاِنَّ أُمِیّ تَأْمُرُنِیُ بِطَلَاقِهَا، فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَاِنْ شِئْتَ، فَأَضِعْ ذٰلِكَ الْبَابَ، أَوِ احْفَظْهُ. (رواہ الترمذی وقال: حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ)

ترجمہ: ایک آدمی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بیوی ہے اور میری والدہ حکم دیتی ہے کہ تم اس کو طلاق دیدو؛ تو مَیں کیا کروں؟ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کا سب اونچا اور عمدہ دروازہ ہے، اب اگر تو چاہے تو اس کو باقی رکھ، اور اگر تو چاہے تو اس کو ضائع کردے۔

افادات: والد یعنی جس سے پیدا ہوا ہے، ماں اور باپ دونوں کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اوران کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے حکم پر عمل کرتے ہوئے تو اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔

خالہ بھی ماں کے درجہ میں ہے

٣٢٥: وعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔

افادات: یعنی جس طرح ماں کی خدمت کرنی چاہیے اسی طرح خالہ کی بھی خدمت کرنی چاہیے، اور ماں کی عدمِ موجودگی میں خالہ کو ہی حضانت یعنی پرورش کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقع پر فرمایا تھا۔

شانِ ورود

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے ۷ھ میں تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کی صاحبزادی جو تقریباً چار سال کی تھی، دوڑتی ہوئی چچا چچا کہتی ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہولی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کو اُٹھا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ کردیا کہ اس کو سنبھالو۔ پھر جب مدینہ منورہ پہنچے تو اس بچی کی پرورش کے سلسلہ میں تین آدمیوں میں اختلاف ہوا، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، دوسرے ان کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور تیسرے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ ان تینوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعویدار تھا کہ اس بچی

کی پرورش کا حق ہمیں ملنا چاہیے اور ہم ہی اسے اپنے پاس رکھیں گے، اور ہم ہی اس کی پرورش کریں گے۔ یہ تینوں اپنا معاملہ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ فرماتے ہوئے کر دیا کہ ان کے نکاح میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہیں جو اس بچی کی خالہ ہیں اور خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔ حضور ﷺ نے یہ جملہ اسی موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

(بخاری شریف، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء۔ رقم ۴۲۵۱۔ ۲/ ۶۱۰۔ السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ۲/ ۴۶۵)

بہر حال! یہاں تو اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ خالہ کے ساتھ بھی آدمی کو وہی معاملہ کرنا چاہیے جو اپنی والدہ کے ساتھ کرتا ہے، خاص طور پر والدہ کی عدمِ موجودگی میں تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنے سے وہی سارا ثواب ملے گا جو والدہ کے ساتھ کرنے کی صورت میں ملتا تھا۔

صلہ رحمی کا حکم شروع ہی سے دیا جاتا تھا

٣٢٦۔وعن عمرو بن عبسة رضي الله عنه فی حدیثه الطویل قال فیه: دَخَلْتُ عَلیٰ النَبِیِّ ﷺ بِمَکَّةَ یَعْنِیُ فِیُ أَوَّلِ النُّبُوَّةِ، فَقُلْتُ لَهُ: مَاأَنْتَ؟ قَالَ: نَبِیٌّ۔ فَقُلْتُ: وَمَا نَبِیٌّ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ، فَقُلْتُ: بِأَیِّ شَیْءٍ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِیُ بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ، وَکَسْرِ الْأَوْثَانِ، وَأَنْ یُّوَحَّدَاللّٰهُ لایُشْرَكُ بِهِ شَیْءٌ.

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت میں منقول ہے کہ نبوت کے ابتدائی زمانہ میں مَیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مکہ میں حاضر ہوا، مَیں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مَیں نبی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ نبی کس کو کہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بندوں کی طرف (اپنا پیغام پہنچانے کے واسطے) بھیجا ہے، (اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے واسطے بھیجے اس کو نبی کہتے ہیں۔) پھر مَیں نے پوچھا

کہ اللہ تعالیٰ نے کیا حکم دے کر بھیجا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے صلہ رحمی اور بتوں کو توڑنے کا حکم اور یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

افادات: یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب نماز فرض نہیں ہوئی تھی، روزہ اور دوسری چیزیں تو بعد میں ہی فرض ہوئی ہیں، اُس وقت تو صرف توحید کا حکم دیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانو اور نبی کریم ﷺ کو اللہ کا رسول مانو، اُس موقع پر بھی جن چیزوں کا حکم دیا جاتا تھا ان میں سے یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔ اس سے صلہ رحمی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسلام کی کتنی بنیادی اور اہم تعلیمات میں سے ہے جس کا شروع ہی سے حکم دیا گیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ پوری امت کو اس کی اہمیت سمجھ کر اس کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔ آمین

تَحْرِيْمُ عُقُوْقِ الْوَالِدَيْنِ وَقَطِيْعَةِالرَّحِمِ

والدین کی نافرمانی
اور
رشتہ داری کے حقوق ادانہ کرنے کی حرمت

﴿مجلس ۱﴾

۲۸ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۵ر مئی ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہ اِلَّآاللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد:

أعوذ باللّٰہمن الشیطان الرجیم بسم اللّٰہالرحمن الرحیم:

فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوْافِی الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوْاأَرْحَامَکُمْ، أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَأَصَمَّھُمْ وَأَعْمٰی أَبْصَارَھُمْ(محمد)

وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاأَمَرَاللّٰہُ بِہٖ أَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِیْ الْأَرْضِ أُولٰئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ.(الرعد)

وَقَضٰی رَبُّکَ أَن لَّاتَعْبُدُوْااِلَّآاِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً،اِمَّایَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ أَحَدُھُمَا أَوْکِلاھُمَافَلا تَقُل لَّھُمَاأُفٍّ وَّلا تَنْھَرْھُمَاوَقُل لَّھُمَاقَوْلاً کَرِیْماً۔ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ۔وَقُل رَّبِّ ارْحَمْھُمَاکَمَارَبَّیَانِیْ صَغِیْراً.(الاسراء)

ماقبل سے ربط

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلا باب ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری اور صلہ رحمی کے سلسلہ میں قائم کیا تھا اور یہ باب قائم کررہے ہیں: ماں باپ کی نافرمانی، ان کو ایذاء وتکلیف پہنچانا اور رشتہ داری کے حقوق کو ادا نہ کرنا جس کو قطع رحمی کہتے ہیں؛ یہ حرام ہے۔اس لیے کہ جب ان کے حقوق ادا نہیں کئے جائیں گے تو تعلقات، رشتہ داری اور قرابت باقی نہیں رہے گی، بلکہ ٹوٹ جائے گی۔تو قطع رحمی کا مطلب ہوا رشتہ داری کو

توڑنا۔اور وہ حقوق کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس باب میں اس کا حرام ہونا بیان کریں گے۔پچھلے باب میں ماں باپ کی فرمانبرداری اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا ضروری ہونا بتلایا تھا اور اس باب میں ماں باپ کی نافرمانی کا اور رشتہ داری کے حقوق کو ادا نہ کرنے کا حرام ہونا بتلا رہے ہیں۔

اس باب کے شروع میں جو آیتیں پیش کی ہیں تقریباً سب وہی ہیں جو پچھلے باب میں آئی تھیں اور وہاں اس کی تفصیل بتلا چکا ہوں اس لیے ان کو چھوڑ کر آگے جو روایتیں پیش فرماتے ہیں ان کو شروع کرتا ہوں۔

ہر گناہ بڑا ہے

٣٣٦: وعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ نُفَيْعِ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: أَلا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟–ثَلاثاً–قُلْنَا: بَلىٰ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ، وَكَانَ مُتَّكِئًا فَجَلَسَ، فَقَالَ: أَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ۔ فَمَازَالَ يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا: لَيْتَهُ سَكَتَ.

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہ مَیں تم کو نہ بتلاؤں؟ تین مرتبہ یہ سوال کیا، تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یارسول اللہ! ضرور بتلایئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔اس وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ (آگے کہی جانے والی بات کی اہمیت بتلانے کے لیے) سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا: جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی دینا۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ارشاد فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش! حضور خاموش ہوجائیں۔

افادات: جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے ان کا ارتکاب کرنے کا

نام معصیت ہے، اوراسی کو ہم اردو زبان میں گناہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ویسے گناہ کے سلسلہ میں علماء نے ایک بحث یہ کی ہے کہ کیا گناہوں میں تقسیم ہے، بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ؟ تو بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جس کو ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ تمام بڑے گناہ ہی ہیں یعنی چھوٹے اور بڑے کی کوئی تقسیم نہیں ہے، اور وہ حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم جس ذات کی نافرمانی کررہے ہیں وہ ذات کتنی عظمت و کبریائی اور بڑائی والی ہے، کوئی شخصیت بہت بڑے مقام و عہدے اور بڑے منصب پر فائز ہو، تو چاہے اس نے چھوٹی سی بات ہی کہی ہو لیکن کوئی آدمی اگر اس کی بات کو نہ مانے اور اس کی خلاف ورزی کرے، تو اس کا یہ جرم وقصور بڑا گناہ شمار ہوتا ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور اس کے حکم کو توڑنا، چاہے وہ کیسا ہی حکم ہو، گناہ ہے۔ اس میں کوئی تقسیم نہیں ہے، اس کا ہر جرم اپنی جگہ پر بہت بڑی کوتاہی قرار دیا جائے گا۔

صغیرہ وکبیرہ اور ان کا حکم

لیکن قرآنِ پاک میں جو احکامات، اور حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ کے جو ارشادات ہیں ان کو سامنے رکھ کر محققین علماء نے گناہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، بڑے گناہ جن کو کبیرہ کہتے ہیں اور چھوٹے گناہ جن کو صغیرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ گناہ جن پر قرآنِ پاک میں یا احادیثِ مبارکہ میں کوئی وعید آئی ہے اور جس پر سخت سزا سنائی گئی ہے ایسے تمام گناہوں کو انہوں نے کبیرہ بتلایا اور جن گناہوں پر سخت وعید نہیں سنائی گئی ہے یعنی ان کی ممانعت تو ہے لیکن ان پر سخت وعید نہیں آئی ہے؛ ایسے گناہوں کو صغیرہ کہا گیا ہے۔
اور پھر دونوں کا حکم بھی بتلایا ہے کہ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ تو وہ ہیں کہ ان سے

اگر آدمی نے مستقل توبہ نہیں کی تب بھی آدمی جو نیک کام کرتا ہے ان کی وجہ سے چھوٹے گناہ آپ ہی آپ معاف ہو جاتے ہیں، مثلاً آدمی نماز کے واسطے وضو کرتا ہے تو حدیث میں آتا ہے کہ وضو کرنے کی وجہ سے اس کے وہ گناہ جو آنکھوں نے کیے، اور جو کان سے ہوئے، جو منھ سے سرزد ہوئے، ہاتھ پاؤں سے سرزد ہوئے؛ وہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث میں وضو کی وجہ سے جن گناہوں کے معاف ہونے کو بتلایا گیا ہے اس سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔ اسی طرح آدمی نماز کے لیے اپنے گھر سے چلتا ہے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے اس کے ہر قدم پر اس کا ایک گناہ معاف ہوتا ہے، ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ یہاں بھی جو گناہ معاف ہوا؛ وہ چھوٹا ہوا۔

ایک مثال

یوں سمجھئے کہ آپ کا کوئی ملازم کوئی چھوٹا موٹا معمولی قصور کر لے تو اس کی وجہ سے آپ کو ناگواری تو ہوتی ہے لیکن وہی ملازم جب آپ کی فرمانبرداری میں بہت مستعدی دکھائے اور کوئی ایسا کام کر لے جو آپ کو خوش کر دے، تو اس معمولی قصور کی وجہ سے آپ کو جو ناگواری ہوئی تھی وہ دور ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس نے کوئی بڑا قصور کیا ہے تو صرف آپ کے کام میں مستعدی دکھلانے سے اور آپ کی خدمت کرنے سے اس بڑے قصور کو معاف نہیں کریں گے، بلکہ وہ تو آپ کی نگاہوں میں باقی رہے گا، ہاں! جب اس بڑے قصور سے صاف صاف لفظوں میں باقاعدہ معافی مانگے گا تب ہی آپ اس کو معاف کریں گے۔ ایسے ہی چھوٹے گناہ نیکیوں اور مختلف عبادات کو انجام دینے کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن بڑے گناہ جب تک باقاعدہ ان سے توبہ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی نہ مانگے؛ وہاں تک وہ معاف نہیں ہوں گے۔

ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے

اور بڑے گناہ کون کون سے ہیں اس کے بارے میں علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "اَلزَّوَاجِرُ عَنِ اقْتِرَافِ الْکَبَائِرِ" ہے۔ اس میں انہوں نے تمام بڑے بڑے گناہ گنوائے ہیں اور اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں جو وعیدیں آئی ہیں وہ بھی شمار کرائی ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر ابھی تازہ ہی ایک رسالہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری دامت برکاتہم کا آیا ہے، جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، اس میں انہوں بڑے گناہ کون سے ہیں وہ جمع فرمائے ہیں۔ بہرحال! ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے ناطہ یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ کون کون سے گناہ بڑے ہیں اور کون کون سے گناہ چھوٹے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چھوٹے گناہ کرے، لیکن جب بڑے گناہ معلوم ہو جائیں گے تو ان سے بچنے کا خصوصی اہتمام کرے گا۔ ویسے تو ہر مسلمان کو اپنے آپ کو ہر گناہ سے بچانا ہے، چھوٹا ہو یا بڑا ہو، لیکن بڑے گناہ تو ایسے ہیں کہ اگر وہ ہو جاویں تو فوراً اس سے توبہ کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے، اس لیے کہ توبہ کے بغیر وہ معاف نہیں ہوتے۔

سب سے بڑے دو گناہ

بات یہاں سے چلی تھی کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آئی تھی، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑے گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے گناہ ہیں؛ وہ میں تم کو نہ بتلاؤں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہ سوال کیا، تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلایئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک

تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، چاہے اللہ کی ذات میں، یا اس کی صفات میں، یا اس کی عبادت میں؛ یا کسی بھی چیز میں اگر اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے گا تو یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ جب تک اس سے توبہ نہ کرے اور ایمان قبول نہ کرے؛ وہاں تک معاف نہیں ہوتا۔

دیکھو! پچھلے باب میں ایک روایت گذری کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ اعمال میں سب سے پسندیدہ عمل کون سا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز کو ادا کرنا اور والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا۔ اور اس روایت میں گناہوں میں سب سے بڑے گناہ کون سے ہیں وہ بتلائے ہیں، اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔ اور شرک ایک ایسا گناہ ہے کہ آدمی جب تک توبہ نہ کرے اور شرک کو چھوڑ کر توحید اختیار نہ کرے اور ایمان نہ لاوے وہاں تک وہ گناہ معاف نہیں ہوتا ﴿اِنَّ اللّٰه لَایَغْفِرُ اَن یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِكَ لِمَن یَّشَآءُ﴾ شرک کرنے والا کبھی بھی جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہے گا۔ اور شرک کرنے کی وجہ سے ایمان ختم ہو جاتا ہے، اس پر تمام کا اتفاق ہے لیکن اس کے علاوہ باقی جتنے بھی بڑے گناہ ہیں ان کی وجہ سے ایمان ختم نہیں ہوتا اگر اس نے توبہ کر لی تو وہ معاف ہو جائیں گے اور اگر توبہ نہیں کی تو اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو معاف کر دے اور بغیر سزا دیے ہی جنت میں بھیج دے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان گناہوں کی سزا دے، اور اس سزا کو بھگتنے کے بعد جنت میں بھیجے، چوں کہ ایمان ہے تو جنت میں جائے گا لیکن شرک کے ساتھ ایمان باقی نہیں رہتا۔

تو بڑے گناہوں میں ایک گناہ شرک ہے اور دوسرا بڑا گناہ بتلایا ہے "وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ" ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ دیکھو! وہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو پہلے نمبر پر رکھا

تھا اور ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کو دوسرے نمبر پر رکھا تھا۔ اور یہاں گناہوں میں شرک کو نمبر اول پر رکھا اور دوسرے نمبر پر ماں باپ کی نافرمانی کو رکھا یعنی کوئی ایسا کام کرنا جس کی وجہ سے ماں باپ کو تکلیف ہو۔

ہاں! اگر ماں باپ کسی ایسی چیز کا حکم کریں جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی، یعنی گناہ کے کام کا اگر وہ حکم کریں تو اس کو پورا کرنے کا وہ پابند نہیں ہے، جیسا کہ پہلے بھی بتلایا جا چکا ہے کہ اس صورت میں ان کی بات مانی نہیں جائے گی، بلکہ اگر ان کی بات مانے گا تو گنہگار ہوگا، اس لیے ماں باپ کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی چیز کا اپنی اولاد کو حکم نہ دیں، اور اگر انہوں نے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا حکم دیا تو اولاد کو چاہیے کہ اس پر عمل نہ کرے۔

ایک اور سب سے بڑا گناہ

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے پہلی دو باتیں ارشاد فرمائیں اس وقت آپ تکیہ سے سہارا لگا کر اور ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ آگے کہی جانے والی بات کی اہمیت بتلانے کے لیے سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا "أَلا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ" اور بڑے گناہوں میں جو سب سے بڑے گناہ ہیں ان میں جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی دینا بھی ہے۔ آپ ﷺ نے اس گناہ سے خاص طور پر تنبیہ کرنے کے لیے اس کو ایسے انداز سے بتلایا کہ آپ سہارا لگا کر بیٹھے تھے اس کو چھوڑ کر آپ سیدھے بیٹھ گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات آپ ﷺ بار بار ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم اپنے دل میں یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش! حضور خاموش ہو جائیں، یعنی نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کو جو محبت اور تعلق تھا اس کے پیشِ نظر ان کے دل میں یہ

خیال آنے لگا کہ ہمیں اس بات کی اہمیت کو بتلانے کے واسطے آپ ﷺ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں، ہم تو اس کی اہمیت سمجھ گئے ہیں، اب آپ خاموش ہو جائیں تو اچھا ہے۔ بتلانا یہ ہے کہ تیسرے گناہ کی اہمیت کو بتلانے کے لیے ایک تو آپ ﷺ ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور دوسرے یہ کہ بار بار اس جملہ کو آپ ﷺ دہراتے رہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ کتنا خطرناک ہے۔ بہرحال! اس روایت کو اس باب میں لاکر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ والدین کی نافرمانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔

چار بڑے گناہ

۳۳۷: وعن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: أَلِاشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہوں میں سے ایک یہ ہے اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، دوسرا بڑا گناہ ماں باپ کی نافرمانی کرنا، تیسرا بڑا گناہ کسی کو ناحق قتل کرنا، اور چوتھا بڑا گناہ جھوٹی قسم کھانا۔

افادات: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ خود یمینِ غموس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ سے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا اس کا نام یمینِ غموس ہے۔ اور اس کو غموس اس لیے کہتے ہیں وہ آدمی کو گناہ کے اندر ڈبا دیتی ہے، کسی بات پر جھوٹی قسم کھانے والا گناہ میں ڈوب جاتا ہے۔

قسم کھانے کے متعلق تفصیل

جھوٹی قسم کا تعلق گذشتہ زمانہ ہی سے ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی آئندہ کے متعلق قسم کھائے تو اس میں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ مَیں فلاں کام کروں گا، یا فلاں

کام نہیں کروں گا، لہٰذا اس میں تو جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! آئندہ جا کر کرنے کے کام کی قسم کھائی تھی اور موت تک نہیں کرے گا تو قسم ٹوٹے گی اور حانث ہوگا۔ اور اگر نہ کرنے قسم کھائی تھی اور وہ کام کرلیا تو قسم ٹوٹے گی، لیکن گذشتہ کسی کام کے متعلق اس سے کوئی بات پوچھی گئی مثلاً اس سے پوچھا گیا کہ فلاں کے پیسے تم نے لیے ہیں؟ اب اس نے لیے ہیں اس کے باوجود قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ اللہ کی قسم! مَیں نے نہیں لیے؛ تو جان بوجھ کر گذشتہ زمانہ سے متعلق جھوٹی قسم کھائی؛ اسی کا نام یمینِ غموس ہے۔

یمینِ لغو

ایک تو یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ کے کام متعلق قسم کھائے اور اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہوئے کھائے، مثلاً کسی نے پوچھا کہ آپ نے یہ بات کہی؟ اور اس بات کو ایک زمانہ گذر چکا ہے اور آپ نے وہ بات کہی تھی لیکن آپ کو یاد نہیں رہا کہ مَیں نے کہی تھی، اور آپ نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر یہ کہا کہ اللہ کی قسم! مَیں نے نہیں کہی۔ تو جس وقت آپ یہ قسم کھا رہے ہیں اس وقت آپ خود کو سچا سمجھ رہے ہیں یعنی آپ کو یہی یاد ہے کہ مَیں نے یہ بات نہیں کہی ہے، اور قسم کھالی، پھر بعد میں خیال آیا کہ مَیں نے تو یہ بات کہی تھی؛ تو ایسی قسم کو عربی زبان میں یمینِ لغو کہتے ہیں، اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا اور یہ کبیرہ گناہ بھی نہیں ہے، بس! ذرا سی کوتاہی ہوئی، اس لیے استغفار کرلینا چاہیے۔
لیکن دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ کے کسی کام سے متعلق جان بوجھ کر اپنے آپ کو غلط سمجھتے ہوئے قسم کھائے، یعنی اس کو یاد ہے کہ مَیں نے یہ بات کہی ہے لیکن قسم کھا کر کہتا ہے کہ مَیں نے نہیں کہی؛ تو یہ قسم یمینِ غموس کہلائے گی، اور یہ کبیرہ گناہ ہے، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آدمی سے بہت زیادہ ناراض ہوتے ہیں۔

اس روایت میں کل چار چیزیں کبیرہ گناہ میں شمار کرائی ہیں، ان میں والدین کی نافرمانی بھی ہے، اس لیے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں۔

والدین کو گالی دینا بڑا گناہ ہے

٣٣٨۔وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَهَلْ يَشْتُمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ؛ يَسُبُّ أَبَاالرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ۔(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔ حضراتِ صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آدمی اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دے، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے باپ کو گالی دی۔ یہی حال ماں کا بھی ہے کہ اِس نے اُس کی ماں کا نام لے کر گالی دی تو جواب میں اُس نے اِس کی ماں کا نام لے کر گالی دی۔

افادات: وہ زمانہ تو حضراتِ صحابہ کا تھا ان میں سے کسی کے تصور میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی بھی دے سکتا ہے آج ہمارے زمانہ میں یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں ہے، آج کل تو ماں باپ کو منھ در منھ گالی دینے والے بیسیوں موجود ہیں، لیکن اُس زمانہ میں اس چیز کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے، اس لیے حضراتِ صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے والدین کو گالی دے؟ تو حضور ﷺ نے اُس زمانہ کے اعتبار سے اس کی جو شکل ہوسکتی تھی وہ بتلائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دے، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے باپ کو گالی دی، اس طرح گویا اپنے باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ یہی بنا، یہ اگر اُس

کے باپ کو گالی نہ دیتا تو جواب میں وہ بھی اِس کے باپ کو گالی نہ دیتا۔ تو اپنے باپ پر گالی پڑنے کا سبب یہی بنا، اس لیے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ہی اپنے باپ کو گالی دی۔ یہی حال ماں کا بھی ہے کہ اِس نے اُس کی ماں کا نام لے کر گالی دی تو جواب میں اُس نے اِس کی ماں کا نام لے کر گالی دی۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ہے اس کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا۔ یعنی براہِ راست (direct) گالی دینا تو ان حضرات کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور یہ (in direct) گالی دینا ہے۔ باقی حضور ﷺ یہ بھی جواب دے سکتے تھے کہ اگر چہ یہ چیز ابھی آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اپنے ماں باپ کو (direct) گالی دیں گے، لیکن اس وقت کے ماحول کی وجہ سے یہ جواب بھی ان کے لیے بڑا قابلِ تعجب ہوتا، لیکن اس شکل سے تو بات بالکل صاف ہوگئی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی گناہ کا ذریعہ بنے تو وہ خود بھی گنہگار بنتا ہے۔

معاشرہ میں رائج ایک کبیرہ گناہ

بہر حال! اس روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کو چاہیے کہ کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی نہ دے، ورنہ وہ جب جواب میں گالی دے گا تو گویا یہ اپنے ماں باپ کے لیے گالی پڑنے کا ذریعہ بنا اور یہ اس کے لیے کبیرہ گناہ ہے۔ یہ سوچنے کی چیز ہے کہ جیسے (direct) ماں باپ کو گالی دیتا تو وہ کبیرہ گناہ تھا، اسی طرح اگر ماں باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ بنا تو یہ بھی اس کے حق میں کبیرہ گناہ ہو جائے گا، اور جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے وہاں تک یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ آج کل لوگ اس چیز میں بہت زیادہ مبتلا ہیں، اور اگر کوئی کہے کہ تو نے ایسا کہا تو اس نے تیرے ماں باپ کو گالی دی، تو یہ کہتا

ہے کہ مَیں نے تھوڑے ہی دی، اس نے دی تو وہ گنہگار ہے، لیکن اس کے گالی دینے کا ذریعہ تو تو بنا، اس لیے تو بھی گنہگار ہوا، اس کو اس کے فعل کا گناہ ہوگا لیکن یوں سمجھا جائے گا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا قصور اسی نے کیا، اور یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اور اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں جاتا، ہاں! اس کو برا تو سمجھتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے۔ لہٰذا اس سے خاص بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا

٣٣٩: وعن أبي مُحَمَّدِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: لا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ.

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی قطع رحمی کرنے والا اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

افادات: یہاں دیکھو کہ مطلقاً منع کردیا گیا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سزا بھگتنے کے بعد بھی جنت میں نہیں جائے گا؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جب اس نے اس گناہ کی سزا بھگت لی تو اب وہ قطع رحمی کرنے والا نہیں رہا، جب اس کا گناہ صاف ہوگیا تو اب گویا وہ اس لائق بن گیا کہ جنت میں جاسکتا ہے، لیکن جب تک کہ قطع رحمی کرنے والا جرم اور گناہ اس کے سر پر باقی ہے وہاں تک تو وہ جنت میں نہیں جاسکتا، اب یا تو توبہ کرکے اس گناہ کو دھلوالے، یا اللہ تعالیٰ سزا دے کر اور جہنم کی بھٹی میں ڈال کر اس کا گناہ صاف کردیں تو پھر وہ اس لائق ہوجائے گا کہ جنت میں جائے۔

ماں کے بارے میں خصوصی تاکید

٣٤٠: وعن أبي عيسى الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: اِنَّ

اللّٰہ َحـرَّمَ عَلَیُکُمُ عُقُوُقَ الُأُمَّهَاتِ،وَمَنُعاًوَّهَاتِ،وَوَأُدَ الُبَنَاتِ،وَکَرِہَ لَکُمُ قِیُلَ وَقَالَ،وَکَثُرَۃَ السُّؤَالِ، وَاِضَاعَۃَ الُمَالِ.(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ماؤوں کی نافرمانی کوتم پرحرام کیا ہے۔اورلوگوں کے حقوق کوادانہ کرنے سے،اور بلاحق کے مطالبہ کرنے سےاورلڑکیوں کوزندہ درگور کرنے سے بھی منع کیا ہے۔اوراللہ تعالیٰ نے قیل وقال،اور کثرت سےسوال کرنےاور مال ضائع کرنے کوتمہارے لیے ناپسندیدہ قراردیا ہے۔

افادات: یہ حدیثِ قدسی ہے۔''ماؤوں کی نافرمانی کوحرام کیا ہے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ کی نافرمانی حرام نہیں ہے، بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ عام طور پر اولاد باپ کے مقابلہ میں ماں کی نافرمانی پرجرأت جلدی کرتی ہے،باپ سے تو ڈنڈے کی پٹائی کاڈر رہتا ہے،اس لیےاولاداس کی نافرمانی پراتنی جرأت نہیں کرتی،جتنی وہ ماں کی نافرمانی کی جرأت کرڈالتی ہے،اس لیے ماں کی نافرمانی کوخاص طور پر بیان کیا گیا کہ ماؤوں کی نافرمانی کواللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ماں کے معاملہ میں ذرہ برابر بھی کوتاہی سے کام نہ لیا جائے،اور چوں کہ ماں عورت ذات ہے جوکمزورصنف ہے،اوراس میں شفقت بھی زیادہ ہوتی ہے،اس وجہ سے بہت سی مرتبہ آدمی اس کی بات کوجلدی سے عمل میں نہیں لاتااوراس طرح وہ اس کی نافرمانی کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

اولاد کو کسی کام کے لیے کس طرح کہیں؟

اسی لیے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ ماں باپ اگرکوئی کام اولاد سے کروانا چاہیں تو صاف صاف یوں نہ کہیں کہ بیٹا! فلاں کام کرو،اس لیے کہ اگروہ ناجائز کام نہیں ہے،تو وہ کام کرنا بیٹے کے لیے واجب اورضروری ہوجاتا ہے،اوراگرنہیں کرے گا

تو ماں باپ کا نافرمان بنے گا اور کبیرہ گناہ کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ ماں باپ کو اس طرح کہنا چاہیے کہ بیٹا! فلاں کام کرو تو مناسب ہے، یعنی صاف لفظوں میں حکم دے کر نہ کہیں کہ یوں کرو، اس لیے کہ صاف لفظوں میں کہا اور بیٹے نے نہیں کیا تو وہ کبیرہ گناہ کرنے والا بنا۔ اور جب ماں باپ جانتے ہیں کہ بیٹے کا مزاج اس قسم کا ہے تو ان کو چاہیے کہ بیٹے کو کبیرہ گناہ سے بچانے کے لیے صاف صاف لفظوں میں کہنے کے بجائے اس طرح کہیں کہ بیٹا! یوں کرو تو اچھا ہے، اگر ایسا کرو گے تو جی خوش ہو جائے گا۔ اب اگر اس نے نہیں کیا تو ماں باپ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے جو کبیرہ گناہ ہوتا تھا وہ تو نہیں ہوگا۔ اس لیے ماں باپ کو بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ کام ایسا ہے جو ضروری نہیں ہے تو حکم دینے والا انداز اختیار نہ کریں، بلکہ ترغیب والا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

یہ چیزیں بھی حرام ہیں

اور دوسری چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے وہ لوگوں کے حقوق کو ادا نہ کرنا اور روک لینا ہے، یعنی کسی کا کوئی حق جانی یا مالی تم پر ہے اور وہ تم کو ادا کرنا چاہیے لیکن اس کو ادا نہیں کرتے؛ تو یہ بھی حرام ہے۔

اور اپنا کوئی حق دوسرے پر نہیں ہے اس کے باوجود اس کا مطالبہ کرنا؛ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

"وَوَأْدَ الْبَنَاتِ" اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا بھی حرام قرار دیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان پہلے ایک باب میں گذر چکا ہے۔

فضول بحث میں پڑنا بھی ناجائز ہے

"وَكَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَقَالَ" اور اللہ تعالیٰ نے قیل اور قال کو تمہارے لیے ناپسندیدہ اور ناجائز قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چند آدمیوں کا کسی جگہ بیٹھ کر فضول بحثیں کرنا کہ فلاں نے یوں کہا، آج کل ایسی باتیں چل رہی ہیں، جس کو ہم گجراتی میں (પારકી પંચાત) کہتے ہیں، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس میں اپنا وقت فضول ضائع کرنا ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں دی ہے کہ آدمی اپنے وقت کو بے کار چیزوں میں ضائع کرے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيهِ" (مجمع الزوائد للہیثمی ۸/ ۱۸ بحوالہ احمد وطبرانی۔ مسند احمد، ۱/ ۲۰۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور بے کار چیزوں کو چھوڑ دے۔ لایعنی کا مطلب ہے ایسی چیز جس میں نہ دین کا کوئی فائدہ ہو اور نہ دنیا کا؛ ایسی چیزوں کو چھوڑ دے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ فضول بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اور اس میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا نام لے کر بات کہی جاتی ہے اس کو تو قال سے تعبیر کیا، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والے کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ یوں ہی کہا جاتا ہے کہ ایسی باتیں ہو رہی ہیں، اور خود اس کو بھی اس بات کے صحیح ہونے کا یقین نہیں ہوتا اس کو قیل سے تعبیر کیا ہے۔

اور حدیثِ پاک میں آتا ہے "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" (مقدمۂ مسلم۔ رقم ۵) آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ جو سنے وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔ بس جو کچھ کان میں پڑ گیا وہ دوسروں کے سامنے اُگل دیا کہ ایسا سنا ہے، اب اگر اس سے پوچھو کہ کس نے کہا؟ تو کہتا ہے کہ سنا ہے۔ اس کا مطلب

یہ ہوا کہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ اگر نام لوں گا تو لوگ کہیں گے کہ کہتا تو دیوانہ ہے ہی، سنتا بھی دیوانہ؟ یعنی ایسے آدمی کی بات پر بھروسہ کرلیا۔ اور اپنا مقام گر نہ جاوے اس لیے وہ اس کا نام تو لے گا ہی نہیں، بس یہ کہے گا کہ سنا ہے، حالانکہ خود بھی اس بات کو جھوٹ سمجھ رہا ہے۔ تو جس چیز کو آدمی خود جھوٹا سمجھ رہا ہے وہ کیوں دوسروں کے سامنے بیان کرے اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنی چیزیں سنے اس کا دوسروں کے سامنے بیان کردینا خود اس آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے۔

بہت زیادہ سوال کرنا حرام ہے

"وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ" اور کثرت سے سوال کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے بہت زیادہ سوال کرنے کا مطلب کیا ہے؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ لوگوں کے حالات کے متعلق بہت زیادہ کھود کرید کرنا جیسے کہ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے اندرونی حالات معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا اور ابھی کیا کر رہا ہے، حالانکہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ اپنے کام میں لگے رہیں، لوگوں کے حالات کی ٹوہ میں لگا رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو ناجائز کہا ہے۔

یا کثرۃ السوال کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جو ابھی تک پیش نہیں آئی ہے لیکن فرضی سوال قائم کرکے پوچھنا۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی معاملہ آپ کو پیش آیا اور آپ کسی عالم یا مفتی سے دریافت کریں کہ ایسا معاملہ مجھے پیش آیا ہے اس لیے اس سلسلہ میں پوچھنا چاہتا ہوں؛ تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعضوں کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بات پیش نہیں آئی، صرف ذہن میں ایک چیز گھڑ کر پوچھتا ہے، بعض مرتبہ تو اس

کا مقصد سامنے والے کا امتحان لینا ہوتا ہے۔ارے بھائی!مفتی صاحب اور مولوی صاحب کا امتحان لینے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ان کے اساتذہ نے ان کا امتحان لے لیا ہے، اور وہ کس درجہ کے ہیں وہ درجہ بھی ان کو دیدیا ہے،اب آپ کو تو یہ کام نہیں سونپا گیا ہے کہ ان کا امتحان لیں۔اس لیے یہ بھی غلط طریقہ ہے۔فرضی سوالات کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب تک ہمارے درمیان موجود تھے اس وقت اگر کوئی ایسا سوال کرتا تو اس کی ممانعت تھی،اس لیے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بہت برا ہے وہ آدمی جو کسی ایسی چیز کا سوال کرے جو پیش نہیں آئی اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز حرام قرار دیدی۔لیکن یہ اس وقت تھا جب نبیٔ کریم ﷺ دنیا میں تشریف فرما تھے،اب تو آپ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں اور جتنی چیزیں حلال ہونی تھیں وہ حلال ہوچکیں اور جو حرام ہونی تھی وہ حرام ہوچکیں،اب اس میں کوئی فرق آنے والا نہیں ہے۔

مال کو ضائع کرنا ناجائز ہے

"وَاِضَاعَةَ الْمَالِ" اور مال کو ضائع کرنا یعنی جہاں پر مال خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہاں خرچ کرنا، یا جتنا خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ خرچ کرنا؛ یہ دونوں ناجائز ہے۔مال کو بے جا استعمال کرنا اور بلاضرورت خرچ کرنا،شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ہاں!نیکی کے کاموں میں آدمی زیادہ سے زیادہ خرچ کرے تو وہاں اسراف نہیں ہوگا،اس لیے کہ نیکی کے کام میں تو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

آج ایک جگہ نکاح میں جانا ہوا، وہاں بات ہوئی تو میں نے ایک قصہ عرض کیا تھا، موقع کی مناسبت سے یہاں بھی وہ قصہ عرض کردوں: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کوئی ضرورت پیش کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ کوئی آدمی اپنی حاجت لے کر آتا تو آپ کبھی منع نہیں فرماتے تھے، اس کی حاجت پوری فرمادیتے تھے، لیکن اگر اس وقت اس کی حاجت پوری کرنے کے لیے کوئی چیز آپ کے پاس موجود نہیں ہوتی تو دو شکلیں ہوتی تھیں یا تو آپ وعدہ فرمالیتے تھے کہ دوسرے وقت آنا، یا اپنے صحابہ میں سے جو صاحبِ حیثیت ہوتے تھے ان کے پاس بھیج دیتے تھے کہ فلاں کے پاس جاکر میرا نام لے لینا، اور وہ اس کی حاجت پوری فرمادیتے تھے۔

تو ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی حاجت پیش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ یہ بڑے مالدار صحابی تھے اور خلفاء راشدین میں تیسرے نمبر پر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی ہوتے ہیں، ان کا لقب ذوالنورین ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں تھیں، پہلے حضرت ام کلثوم کا نکاح ان کے ساتھ ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد حضرت رقیہ کا نکاح ہوا، جب حضرت رقیہ کا انتقال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری اور بیٹی ہوتی تو میں ان کے نکاح میں دیتا۔

خیر! یہ آدمی ان کے پاس گئے، رات کا وقت تھا جب ان کے دروازہ پر پہنچے تو اس سے پہلے کہ ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں، ان کے کان میں آواز پڑی کہ حضرت عثمان اپنی اہلیہ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں زور سے کچھ کہہ رہے ہیں، تو یہ ٹھہر گئے۔

جب ان کے کان میں آواز آئی تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے چراغ کی لَو ذرا تیز کردی تھی جس کی وجہ سے تیل زیادہ جلتا ہے، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کو ڈانٹ رہے تھے کہ چراغ کی بتّی ضرورت سے زیادہ اونچی کیوں رکھی؟ اس سے معلوم ہوا کہ روشنی بھی اتنی ہی استعمال کرنی چاہیے جتنی ضرورت ہو، بلاضرورت زیادہ استعمال کرنا اضاعتِ مال میں شامل ہے۔ خیر! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کو اس پر تنبیہ کررہے تھے کہ چراغ کی بتّی زیادہ اونچی کیوں رکھی؟ جب اس آدمی کے کان میں یہ آواز پہنچی تو سوچنے لگا کہ آدمی اپنی بیوی کے لیے تو سب کچھ قربان کرتا ہے، اور یہ تو اپنی بیوی کو اور وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کو صرف اتنی سی بات پر ڈانٹ رہے ہیں، بھلا وہ مجھے کیا دیں گے۔ اس آدمی نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا اور حضور کے بھیجے ہوئے ہونے کے باوجود بھی اپنی بات حضرت عثمانؓ سے نہیں کہی اور واپس ہو گیا۔ دوسرے دن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تمہاری ضرورت پوری ہوئی یا نہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا منع کیا؟ تو اس نے کہا کہ مَیں نے اپنی ضرورت ان کے سامنے رکھی ہی نہیں۔ فرمایا کہ کیوں نہیں رکھی؟ تو اس نے پوری بات بتلائی کہ ایسا ایسا ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا مت سوچو، بلکہ جاؤ اور ان سے کہو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ تاکید فرمائی تو یہ گیا اور جب اپنی حاجت پیش کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امید سے بھی زیادہ دیا۔ بعد میں اس نے کہا کہ مَیں رات کو بھی آپ کے پاس آیا تھا لیکن مَیں نے سنا کہ آپ اپنی اہلیہ کو چراغ کی بتّی تیز رکھنے پر ڈانٹ رہے تھے، تو مَیں نے ایسا ایسا سوچا اور واپس چلا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے سمجھا ہی نہیں، ہم تو اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کے مطابق مال خرچ کرتے

ہیں، جہاں وہ کہیں وہاں سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہیں اور جہاں وہ منع کر دیں تو وہاں ایک پائی بھی خرچ کرنے کے لیے ہم تیار نہیں۔

حضراتِ صحابہ اور ہمارے نظریہ میں فرق

حضراتِ صحابہ کا یہی مزاج تھا کہ جہاں اللہ اور رسول نے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی وہاں خرچ کرنا، یا جتنی اجازت دی اس سے زیادہ خرچ کرنا اضاعتِ مال سمجھتے تھے اور جہاں خرچ کرنے کے لیے کہا ہے وہاں کتنا ہی خرچ کر ڈالو وہ اضاعتِ مال نہیں سمجھتے تھے اور ہمارے یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے، اگر کسی نے شادی میں دو لاکھ خرچ کر ڈالے تو اس کو کوئی اضاعتِ مال نہیں کہتا، لیکن اگر کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی نیکی کے کام میں پچاس ہزار دیدیئے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ تو لٹانے کے لیے بیٹھا ہے۔ ہمارا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے کہ سات دانے بوئے گئے اور ہر دانہ کے سات خوشے اور ہر خوشے کے اندر سو دانے ہوں گے گویا ایک کے سات سو دانے ملیں گے اور پھر وہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ ایک کا سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ دینا چاہے گا دے گا، اب وہاں خرچ کرنے کو ہم فضول سمجھیں۔ اور جہاں خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے، وعید اور دھمکی دی گئی ہے؛ وہاں ہم خرچ کر ڈالتے ہیں۔

بہر حال! یہ وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی ان چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٦ رصفر المظفر ١٤٢٠ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ٢٢ رمئی ١٩٩٩ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔أمابعد !

ماقبل سے ربط

ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا بیان چل رہا تھا، اس کے بعد والے باب میں ماں باپ کی نافرمانی اور رشتہ داروں کے حقوق کو نہ ادا کرنے پر کیا وعید ہے اس کو بیان کیا تھا۔ آج ماں باپ اور رشتہ داروں کے حقوق کے تتمہ اور تکملہ کے طور پر ہی ایک اور چیز بتلا رہے ہیں کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ماں باپ کی زندگی میں ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، جب ان کا انتقال ہو جاتا ہے تب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میری طرف سے ماں باپ یا رشتہ داروں کے حقوق کے معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے، اور اس کا جی چاہتا ہے کہ جو کوتاہی اور ان کی نافرمانیاں ہوئیں اور ان کے حق جیسے ادا ہونے چاہئیں مجھ سے ادا نہیں ہو پائے؛ اس کی تلافی کی کیا شکل ہوگی۔ یا اگر اس کی طرف سے ایسی کوئی نوبت نہیں بھی آئی تب بھی ان کے ساتھ مزید اطاعت و سلوک کا ایک حصہ یہ بھی ہے جس کو اس باب میں بیان کرتے ہیں۔

باب کا عنوان ہے: "فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَ الْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ وَسَائِرِ مَن يُّنْدُبُ اِكْرَامُهٗ" ماں باپ، رشتہ دار، بیوی اور جن جن لوگوں کا اکرام اس کے لیے ضروری ہے جیسے اساتذہ یا شیوخ یا خاندان کے بڑے؛ ان کے دوستوں اور

پہچان والوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔

سب سے بڑی نیکی یہ ہے

۳٤۱: عنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنَّ أَبَرَّالْبِرِّأَن یَّصِلَ الرَّجُلُ وُدَّ أَبِیْهِ۔

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے محبت والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

افادات: یعنی باپ کے ملنے والے، ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے، ان کے دوست واحباب کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا، ان کا اکرام کرنا، ان کی خدمت کرنا اور ان کو ہدیہ وغیرہ دینا، موقع بموقع ان کو دعوت دے کر اپنے گھر بلانا، مطلب یہ ہے کہ ان کو خوش رکھنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ اختیار کرنا بھی بہت بڑی نیکی ہے، اور باپ کے حقوق کی ادائیگی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ عربی کے ایک شاعر کا شعر ہے:

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى ❁ أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ ❁ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

مجنوں قیس جو لیلیٰ کا عاشق سمجھا جاتا ہے اس کی زبانی یہ شعر کہا گیا ہے کہ میں لیلیٰ کے شہر کے اس علاقہ سے جب گذرتا ہوں تو کبھی اِس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی اُس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں، اور ان دیواروں کے ساتھ میری محبت نہیں ہے، لیکن جو ذات اس آبادی میں آباد ہے یعنی لیلیٰ اس میں رہتی ہے اس لیے مَیں ان دیواروں کو بھی بوسہ دیتا ہوں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو اس کے تعلق والوں کے ساتھ بھی وہ محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔

دوست کا دوست

اور ہمارے معاشرہ میں ایک جملہ بولا بھی جاتا ہے کہ دوست کا دوست بھی دوست ہی ہوا کرتا ہے۔اسی طرح ماں باپ کے دوست واحباب اوران کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ ان کی زندگی میں بھی اوران کی وفات کے بعد بھی آدمی کو بھلائی کا سلوک کرنا چاہیے یہی ان کے حقوق کی ادائیگی ہے،اگران کی زندگی میں ایسا معاملہ کروگے اوران کومعلوم ہوگا کہ ہمارے دوستوں کے ساتھ بھی ہمارابیٹا محبت کا معاملہ کرتا ہےتو ان کا جی خوش ہوگا کہ اس کوان کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارے ملنے والے ہونے کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ یہ معاملہ کر رہا ہے۔اور مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اگر آپ کی نسبت سے کسی آدمی نے کسی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا اور آپ کو پتہ چلا کہ میری وجہ سے اس نے بھلائی کا سلوک کیا ہےتو آپ کے دل میں اس کی کتنی وقعت بڑھ جائے گی،اوریہی چیز محبت کو بڑھانے والی اورحقوق کی ادائیگی میں معاون ومددگار ثابت ہوتی ہے،اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس کی بھی تاکید فرمائی ہے۔

اسی سے ترقی ہوتی ہے

بزرگوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ اساتذہ اوران کی اولاد اوران کے خاندان والوں اسی طریقہ سے باپ کے دوست وغیرہ سب کا نہایت ہی اکرام محض اس وجہ سے کیا کرتے تھے کہ ان کو اپنے بڑوں کے ساتھ تعلق تھا۔ایک بہت بڑے محدث تھے،ایک مرتبہ وہ حدیثِ پاک کا درس دے رہے تھے،دورانِ درس وہ کھڑے ہوگئے،پھر بیٹھ گئے،تھوڑی دیر کے بعد پھر کھڑے ہوگئے،پھر بیٹھ گئے،دوچار مرتبہ ایسا ہی کیا۔تو کسی نے بعد میں ان سے پوچھا کہ آج درس کے دوران آپ نے عجیب وغریب معاملہ کیا کہ

کھڑے ہوئے، پھر بیٹھے اور اس طرح دو چار مرتبہ کیا، کیا بات تھی؟ تو انہوں نے بتلایا کہ مَیں جہاں بیٹھ کر درس دے رہا تھا وہاں سامنے کچھ بچے کھیل رہے تھے، ان میں میرے استاذ کا بھی ایک بچہ تھا، جب وہ سامنے آتا تھا تو اپنے استاذ کی تعظیم کے خیال سے مَیں کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور یہی چیز ہے جو آدمی کو آگے بڑھانے والی ہے اور اسی سے آدمی کی ترقی ہوتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے سب سے بڑی نیکی یہ بتلائی کہ آدمی اپنے باپ کے محبت والوں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرے؛ یہ بھی ماں باپ کا حق ہے۔

اور یہ صرف ماں باپ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے رشتہ دار، یہاں تک کہ بیوی کے جو محبت والے ہیں ان کے ساتھ بھی محبت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے محبت والوں کے ساتھ محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان کے محبت والوں کے ساتھ بھی محبت کا معاملہ کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ

چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک اور روایت پیش کرتے ہیں جس میں اوپر والی روایت کے ناقل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بتلاتے ہیں کہ اس بات پر ان کا کتنا زیادہ عمل تھا۔

۳۴۲: عَنْ عبدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عبدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْأَعْرَابِ لَقِيَهُ بِطَرِيْقِ مَكَّةَ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ عبدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ، وَحَمَلَهُ عَلىٰ حِمَارٍ كَانَ يَرْكَبُهُ، وَأَعْطَاهُ عِمَامَةً كَانَتْ عَلىٰ رَأْسِهِ، قَالَ ابنُ دِيْنَارٍ: فَقُلْنَالَهُ أَصْلَحَكَ اللّٰهُ! اِنَّهُمُ الْأَعْرَابُ وَهُمْ يَرْضَوْنَ بِالْيَسِيْرِ، فَقَالَ عبدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہ: اِنَّ أَبَا هٰذَا كَانَ وُدًّا لِعُمَرَ بنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ، وَاِنِّي سَمِعْتُ رَسولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الرَّجُلِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن دینارؒ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ کے راستہ میں ملا، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سلام کیا اور خود جس گدھے پر سوار تھے اس سے اتر گئے اور اس دیہاتی کو اس گدھے پر سوار کرایا اور ان کے سر پر جو عمامہ تھا وہ اتار کر اس کو دیا۔ حضرت عبداللہ بن دینارؒ (جو حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد ہیں وہ بھی سفر میں ساتھ تھے، انہوں) نے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حال درست رکھے، آپ کے ساتھ صلاح وفلاح کا معاملہ فرمائے، یہ تو دیہات کے رہنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو آپ احسان کا تھوڑا سا سلوک بھی کریں تو وہ خوش ہو جائیں گے، اگر کچھ تھوڑا سا بھی دیدیا ہوتا تو کافی تھا، لیکن آپ نے تو گدھا اور عمامہ اتنی بڑی بڑی چیزیں دیدیں؟ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا باپ میرے والد صاحب کا دوست تھا، اس لیے مَیں نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا، اور مَیں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھلائی اور محبت کا معاملہ کرے۔

افادات: دوسری روایت میں زیادہ وضاحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے، سواری کے لیے تو اصل ان کے پاس اونٹ تھا لیکن ساتھ میں ایک گدھا بھی اسی لیے رکھا تھا کہ اونٹ پر سواری کرتے ہوئے طبیعت اکتا جائے تو گدھے پر سوار ہو کر طبیعت کو ذرا فرحت دے لیں، راستہ میں ایک دیہاتی ملا تو اس کو وہ گدھا بھی دیدیا اور اپنے سر پر جو عمامہ باندھے ہوئے تھے وہ بھی دیدیا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ نے اس کو یہ دونوں چیزیں کیوں دیدیں؟ اگر تھوڑی سی کوئی چیز دیدیتے تب بھی یہ تو خوش ہو جاتا اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا باپ میرے والد صاحب کا دوست تھا، اس لیے مَیں نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا، اور مَیں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھلائی اور محبت کا معاملہ کرے، اور یہاں تو اس آدمی کی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی بلکہ اس آدمی کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوست تھے، تو گویا وہ اپنے والد کے دوست کا بیٹا تھا اس مناسبت سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔

آگے کی روایت کے الفاظ میں کچھ فرق ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دیہاتی ملا تو انہوں نے اس سے ازخود پوچھا کہ تو تو فلاں کا بیٹا ہے نا؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنا گدھا بھی دیا اور کہا کہ اس پر سوار ہو جاؤ، اور اپنا عمامہ بھی عنایت فرمایا اور کہا کہ اس کو اپنے سر پر باندھ لو۔

انہوں نے ازخود اس کو پوچھا کہ تم فلاں کے بیٹے ہو؟ اور آج کل ہمارے یہاں تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پہچان والا ملتا ہے اور اس کو خیال نہیں رہتا تو آدمی کہتا ہے کہ گزر جائے تو اچھا ہے، تاکہ اس کے ساتھ ملاقات کرنے اور کوئی سلوک کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہم تو صرفِ نظر اور چشم پوشی کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے دیکھو! حضرت ابن عمر نے سامنے چل کر اس سے پوچھا اور اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا۔

والدین کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے طریقے

٣٤٣: عَنْ أَبِى أُسَيْدٍ مَالِكِ بْنِ رَبِيْعَةَ السَّاعِدِيّ رضی اللہ عنہ قَالَ: بَيْنَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذْ جَآءَهُ رَجُلٌ مِّنْ بَنِىْ سَلَمَةَ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هَلْ بَقِىَ مِنْ بِرِّ أَبَوَىَّ شَىْءٌ أَبَرُّهُمَا بِهِ مِنْ بَعْدِمَوْتِهِمَا؟ فَقَالَ: نَعَمْ۔ اَلصَّلاةُ عَلَيْهِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمَا، وَاِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا، وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِىْ لَاتُوْصَلُ اِلَّا بِهِمَا، وَاِكْرَامُ صَدِيْقِهِمَا. (رواه ابوداود)

ترجمہ: حضرت ابو اسید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس

میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بنوسلمہ - جو انصار ہی کا ایک قبیلہ تھا - کے ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے ماں باپ وفات پا چکے ہیں، اب بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں کوئی چیز باقی رہ گئی ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک تو ان کے لیے دعاءِ خیر اور دعاءِ مغفرت کرتے رہنا، اور ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے عہد و پیمان اور وعدوں کو پورا کرنا۔ ان کے واسطہ سے جن کے ساتھ رشتہ داری لگتی ہے ان سارے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھنا، اور ان کے دوستوں کا اکرام کرنا۔

مرنے کے بعد بھی ثواب

افادات: ''کوئی چیز باقی رہ گئی ہے'' یعنی کوئی ایسا طریقہ ہے کہ ان کے دنیا سے جا چکنے کے بعد بھی مَیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرسکوں؟ دیکھو! ماں باپ کے لیے دعا کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے، آدمی جب تک زندہ ہے وہاں تک نیکی کے کام کرتا ہے، لیکن جب مرگیا تو اب اعمال کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی، زندگی میں وہ جو بھی نیک کام کرتا تھا اس کی وجہ سے اس کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھا جاتا تھا وہ سلسلہ اب بند ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''اِذَامَاتَ الِانْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّامِنْ ثَلَاثٍ'' (مسلم شریف، رقم ١٦٣١۔ ابوداود، رقم ٢٨٨٠) جب کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، البتہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اس کے مرجانے کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں ان کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

''صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ'' ایک تو صدقۂ جاریہ یعنی نیکی کا کوئی ایسا کام کرگیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس سے لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں، مثلاً کوئی کنواں کھدوادیا جس سے لوگ پانی حاصل کرکے پی رہے ہیں، یا کوئی مسافرخانہ بنوادیا، کوئی مدرسہ تعمیر کردیا یا مسجد تعمیر کردی، یا کوئی بھی ایسا کام کردیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی بنائی ہوئی

اس چیز سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کو ثواب ملتا رہے گا، اسی کو ہم اپنی زبان میں صدقۂ جاریہ کہتے ہیں۔

"أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ" دوسری چیز ہے: علم کی کوئی بات کسی کو سکھا دی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے جیسے آپ نے کسی کو نماز سکھا دی، اب آپ دنیا میں نہیں ہوں گے لیکن وہ آپ کی سکھائی ہوئی نماز پڑھ رہا ہے، یا پوری نماز نہیں، صرف سورۂ فاتحہ ہی سکھلائی اب جب تک وہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا رہے گا اس میں آپ کا حصہ لگا رہے گا اور آپ کو ثواب ملے گا، اور پھر اگر وہ کسی اور کو سکھائے گا اور وہ کسی اور کو سکھائے گا، اس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک جاری رہے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا جو مقام امت میں سب سے اونچا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دین پہنچانے کا ذریعہ یہی حضرات بنے، اب قیامت تک دین پر جتنا بھی عمل ہوتا رہے گا، سب میں ان کا حصہ رہے گا، ان کے ثواب کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟۔

اولاد کو ماں باپ کے لیے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے

اور تیسری چیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی "أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهُ" کوئی نیک بیٹا جو اس کے لیے دعاءِ خیر کرتا رہے۔ دیکھو! صرف یہ نہیں کہا کہ نیک بیٹا ہو، ویسے اگر بیٹا نیک ہے اور اس کو نیک بنانے پر ماں باپ نے محنت کی ہے، تو چاہے وہ ان کے لیے دعا نہ کرے، تب بھی اس کے نیک کام میں ماں باپ کا حصہ ہے، لیکن جب وہ نیک ہوگا تو یقیناً وہ ان کے لیے دعا بھی کرے گا ہی، گویا اس کی نیکی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ماں باپ

کو نہ بھولے۔ لیکن اس میں ”یَدْعُوْلَہٗ“ کے الفاظ موجود ہیں کہ وہ ان کے لیے دعا کرے، گویا اس میں اس صالح اولاد کو بھی اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ تمہاری نیکی وصلاح اس بات پر موقوف ہے کہ والدین کے لیے دعاءِ خیر کرتے رہو۔ قرآنِ کریم میں بھی باری تعالیٰ نے دعا کا تذکرہ فرمایا ہے ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْرًا﴾ اے اللہ! تو میرے ماں باپ کے ساتھ رحم کا معاملہ کر جیسا کہ بچپن میں جب کہ مَیں مہربانی اور شفقت کا محتاج تھا اس وقت انہوں نے میری پرورش کی، اب تو بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کے لیے یہ دعا کی جارہی ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے ان پوچھنے والے صحابی کو یہ بتلایا کہ اگر تمہارے ماں باپ دنیا سے جاچکے ہیں تو ان کے ساتھ بھلائی کرنے کی شکل ابھی باقی ہے، یوں نہ سمجھنا کہ وہ تو گذر چکے اب مَیں کیا کروں، ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیسے کروں، ابھی بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے، اور اس میں ایک بات یہ بتلائی کہ ان کے لیے دعا کرو، اس لیے ایصالِ ثواب کے ساتھ ساتھ دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کا طرزِ عمل

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو دیکھا کہ اپنے اساتذہ اور مشائخ کے لیے اور اسی طرح کسی کے ساتھ اگر ذرا سا بھی تعلق ہوتا تو اس کے لیے بھی ایصالِ ثواب اور صدقات کا کثرت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور حضرت قربانی کے بے شمار جانور رکھتے تھے، جس میں براہِ راست اپنے اساتذہ اور مشائخ کے لیے تو حصہ رکھتے ہی تھے، لیکن جس کے ساتھ ذرا سا تعلق ہوتا، اس کے لیے بھی ایک حصہ رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ قربانی کے

موقع پر ان کی طرف سے قربانی کریں، کبھی ان کی طرف سے نفلی حج کرلیا، طواف کا اہتمام کرلیا، قرآنِ پاک کی تلاوت کر کے ان کو ایصالِ ثواب کردیا، نیکی کے کام میں ان کی طرف سے خرچ کرلیا، کسی غریب کو کھلایا تو اس میں بھی ان کی نیت کرلی غرض یہ کہ نیکی کے مختلف کام ہیں ان کاموں میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔

ایصالِ ثواب سے زیادہ دعا کا اثر ہوتا ہے

دیکھو! دو چیزیں ہیں، ایک ایصالِ ثواب اور دوسری دعا۔ عام طور پر دیکھا گیا کہ بعض لوگ ایصالِ ثواب کا اہتمام بہت کرتے ہیں لیکن دعا کا نہیں کرتے، حالانکہ دعا کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعا کا اثر زیادہ ہوتا ہے، اوراس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! آپ کا کوئی دوست یا رشتہ دار ہے جس کو حکومت کا قصوروار ہونے کی وجہ سے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا، آپ اس کے لیے جیل میں دو وقت کھانا بنا کر بھیجتے ہیں تا کہ اس کو کھانے کی تکلیف نہ ہو، بس! آپ اتنا کر کے بیٹھ گئے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ آپ اس کو چھڑوانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں، اور جہاں جہاں تعلقات ہیں وہاں جا کر بڑوں کے ذریعہ سفارش کروارہے ہیں کہ کسی طرح وہ چھوٹ جائے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ دعاءِ مغفرت کرنا ایسا ہے جیسا کہ اس کو چھڑانے کی محنت کرنا۔ اور ایصالِ ثواب ایسا ہے کہ ٹفن بنا کر اس کے لیے کھانا بھیجنا۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ کس کی قدر زیادہ ہے۔

دعا آسان کام ہے

تو دعا کا اہتمام خاص ہونا چاہیے جس کی طرف سے عام طور پر لوگ غفلت

برتتے ہیں، حالانکہ دعا کرنا زیادہ آسان کام ہے، اور دعا کے لیے کوئی مخصوص حالت بھی ضروری نہیں ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہی دعا کی جائے، بلکہ چلتے پھرتے جہاں بھی ان کا خیال آ گیا ان کے لیے دعاءِ مغفرت کر دی، درجات کی بلندی کی دعا کر دی؛ یہ کافی ہے۔ دعا کے لیے تو کوئی وقت ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے دعا کے لیے کوئی شرط بھی نہیں لگائی ہے، باوضو ہونا بھی آداب میں سے ہے لیکن شرط اور ضروری نہیں ہے، ہر حال میں جب چاہیں آپ دعا کر سکتے ہیں۔

مغفرت کی دعا کا قاعدہ

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے ماں باپ کے دنیا سے تشریف لے جانے اور انتقال کر جانے کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک طریقہ یہ بتلایا کہ ان کے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا کی جائے۔ بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ مغفرت کی دعا کتنی مرتبہ کرتے رہیں گے جب کہ ایک مرتبہ مغفرت تو ہو چکی ہے؟ آپ نے فضائلِ رمضان میں سنا ہوگا، حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ مغفرت کی دعا کا قاعدہ یہ ہے کہ آپ نے جس کے لیے مغفرت کی دعا کی ہے اگر اس کے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ کی یہ دعا ضائع اور برباد جانے والی نہیں ہے، آپ کی یہ دعا اس کے لیے درجات کی بلندی کا سبب بنے گی۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی دوسری شکل

دوسری شکل یہ بھی بتلائی کہ ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے عہد و پیمان اور وعدوں کو پورا کرنا، انہوں نے کسی کے ساتھ بھلائی کا کوئی وعدہ کیا تھا اور اس وعدہ کو پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور وہ آ کر کہتا ہے کہ آپ کے والد نے مجھ سے یہ وعدہ

کیا تھا تو آپ کو چاہیے کہ ماں باپ نے جن جن سے وعدہ کر رکھا تھا ان کو بے رخی سے ایسا نہ کہہ دیں کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا، وہ تو دنیا سے گئے، مَیں نے تو وعدہ نہیں کیا تھا، بلکہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے ان شاء اللہ مَیں اس وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کروں گا، یہ بھی ان کے ساتھ بہت بڑی نیکی ہے۔

بڑوں کے یہاں یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کسی عزیز کے انتقال کے بعد جہاں وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ کسی کا کوئی قرضہ یا مطالبہ ہو تو مجھ سے مانگ لینا، کوئی حق ہو تو مجھ سے وصول کر لینا؛ وہیں یہ بھی اعلان کرتے تھے کہ انہوں نے کسی سے کوئی وعدہ کیا ہو تو مَیں اس کو پورا کروں گا۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کا جانشین بنایا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جو اعلان کیا وہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اگر کسی سے کوئی وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس آوے، مَیں اس وعدہ کو پورا کروں گا۔ (بخاری شریف، کتاب الشہادات۔ رقم، ۲۵۳۷)

اسی طرح ماں باپ نے بھی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے مثلاً کسی کا بچہ اسکول یا مدرسہ میں پڑھتا ہے اور اس کے ابا سے تمہارے والد نے کہا تھا کہ اس کی تعلیم کا پورا خرچہ مَیں برداشت کرتا رہوں گا، اب اس کی تعلیم کے چند سال ہی ہوئے تھے اور ابا کا انتقال ہو گیا، اب وہ آدمی آ کر کہتا ہے کہ آپ کے والد صاحب نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا، اب اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت دی ہے، اور آپ کے پاس دینے کی صلاحیت ہے تو کوشش کر کے اس وعدہ کو پورا کیجیے، ان شاء اللہ ان کی روح کو اس کا بہت ہی زیادہ فائدہ پہنچے گا اور ان کی درجات کی بلندی کا بڑا ذریعہ بنے گا۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تیسری شکل

اور تیسری شکل یہ بھی ہے کہ ان کے واسطہ سے جن کے ساتھ رشتہ داری لگتی ہے ان سارے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھنا، گویا یہ بھی ان کے ساتھ نیکی کا تعلق ہے۔ جیسے بھائی بہن۔ جیسا کہ مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ان کے ساتھ رشتہ باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ہی جڑتا ہے، اسی طرح چچا، ماموں، خالائیں، پھوپھیاں وغیرہ رشتہ داریاں وہ ہیں جن کے لیے ماں باپ واسطہ بنے ہیں، تو ان سب کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا بھی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک حصہ ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی چوتھی شکل

اور چوتھی شکل یہ ہے کہ ان کے دوستوں کا اکرام کرنا۔ دیکھو! صرف رشتہ داروں کا نہیں فرمایا، اس لیے کہ ان کے ساتھ تو رشتہ داری ہے، اس لیے ان کا تو خیال کرنا ہی ہے، لیکن والدین کے جو دوست تھے، ان سے محبت وتعلق رکھنے والے تھے ان کے ساتھ بھی حسبِ مرتبہ سلوک کرنا چاہیے، یعنی جس کے ساتھ زیادہ دوستی تھی تو اس کے ساتھ زیادہ سلوک کرنا چاہیے، کسی کے ساتھ کبھی کبھار اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا تو ان کے ساتھ اس کے مناسب معاملہ کرنا چاہیے؛ یہ بھی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک ہے، اور اس کا اہتمام کرنا چاہیے، اس کے نتیجہ میں آدمی ماں باپ کا فرمانبردار لکھا جاتا ہے۔ کسی نے اگر ماں باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ فرمانبرداری کا معاملہ نہیں کیا، گمراہی میں مبتلا تھا اور ماں باپ کے حق ادا نہیں کر سکا، جب ان کا انتقال ہو گیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور ہدایت نصیب ہوئی، اب پچھتا رہا ہے کہ مَیں کیا کروں؛ تو اس کے لیے ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کے یہ سارے طریقے ہیں، اگر ان سب کا اہتمام کرے

گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ماں باپ کا فرمانبردار لکھ دیں گے۔

حضرت عائشہ کو حضرت خدیجہ پر غیرت

٣٤٤: وعن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت: مَاغِرْتُ عَلىٰ أَحَدٍ مِّن نِّسَآءِ النَّبِيِّ ﷺ مَاغِرْتُ عَلىٰ خَدِيْجَةَ رضی اللّٰه عنها، وَمَارَأَيْتُهَاقَطُّ، وَلٰكِنْ كَانَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا، وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ، ثُمَّ يُقَطِّعُهَا أَعْضَآءً، ثُمَّ يَبْعَثُهَافِيْ صَدَائِقِ خَدِيْجَةَ، فَرُبَّمَاقُلْتُ لَهُ: كَأَنْ لَّمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا اِلَّا خَدِيْجَةُ! فَيَقُوْلُ: اِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِيْ مِنْهَاوَلَدٌ.

وفی رواية: وَاِنْ كَانَ لَيَذْبَحُ الشَّاءَ، فَيُهْدِيْ فِيْ خَلَائِلِهَامِنْهَا مَايَسَعُهُنَّ.

وفی رواية: كَانَ اِذَاذَبَحَ الشَّاةَ يَقُوْلُ: أَرْسِلُوْابِهَااِلىٰ أَصْدِقَآءِ خَدِيْجَةَ.

وفی رواية قَالَتْ: اِسْتَأْذَنَتْ هَالَةُ بِنْتِ خُوَيْلِدٍأُخْتُ خَدِيْجَةَعَلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَعَرَفَ اسْتِئْذَانَ خَدِيْجَةَ، فَارْتَاحَ لِذٰلِكَ فَقَالَ: أَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں کسی پر مجھے اتنی غیرت نہیں آئی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آئی، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے، اور کبھی آپ ﷺ بکری ذبح فرماتے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کے یہاں وہ گوشت بھیجتے تھے۔ تو میں کبھی یہ کہتی تھی کہ خدیجہ کے علاوہ دنیا میں کوئی عورت ہی نہیں ہے؟ حضور ﷺ فرماتے کہ وہ ایسی تھی، ایسی تھی، (یعنی ان کی خوبیوں کا تذکرہ فرماتے تھے) اور میری ساری اولاد انہیں سے ہے۔ ایک مرتبہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے یہاں تشریف لائیں اور انہوں نے اجازت طلب کی۔ آپ کو حضرت خدیجہ کا استیذان یاد آ گیا، آپ ﷺ کی طبیعت میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فرمایا کہ خدیجہ کی بہن ہالہ معلوم ہوتی ہے۔

افادات: کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان میں آپس میں رقابت کا

معاملہ چلتا ہے، اگر شوہر نے کسی ایک کی ذرا سی تعریف کردی تو دوسری کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اتنی تعریف کیوں کردی۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بیویوں میں کسی پر مجھے اتنی غیرت نہیں آئی جتنی حضرت خدیجہ پر غیرت آئی، حالانکہ مَیں نے ان کو دیکھا بھی نہیں، اس لیے کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے دو سال بعد نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت عائشہ سے ہوا اور پھر رخصتی تو مدینہ منورہ آکر ہوئی تھی۔ اب یہ غیرت کیوں آئی؟ اس کی وجہ وہ خود فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے کہ خدیجہ ایسی تھی، خدیجہ ایسی تھی، خدیجہ ایسی تھی۔ پھر فرماتی ہیں کہ کبھی آپ ﷺ بکری ذبح فرماتے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو تلاش کرکر کے ان کے یہاں وہ گوشت بھیجتے تھے۔

ہمارے معاشرہ کی ایک خرابی اور اس کا علاج

ہمارے معاشرہ میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اگر آدمی کبھی ماں باپ کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے تو بیوی بیچ میں آڑے آتی ہے، وہ یوں کہتی ہے کہ فلاں کو اتنا دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر بیوی کے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا چاہتا ہے تو ماں باپ اس کے آڑے آتے ہیں کہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ شریعت نے دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے، جس کا جیسا مقام ومرتبہ ہو اس کے مناسب، اور جس کی جیسی رشتہ داری ہو اس کی اسی حیثیت کے مطابق بھلائی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

ہاں! اگر اپنے ماں باپ کا حق ادا نہیں کرتا اور بیوی کے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرتا رہتا ہے تو یہ اس کے لیے عیب کی چیز ہے، لیکن یہ جو کام کر رہا ہے وہ

برا کام تو نہیں کر رہا ہے، اس لیے اس کو سمجھایا جائے گا کہ بیوی کے ماں باپ تو ایک نسبت کی وجہ سے آئے ہیں، براہِ راست تیرے ماں باپ کا حق تجھ پر زیادہ ہے۔ تو اُس سے بھی اس کو روکنا نہیں ہے بلکہ اِس پر بھی آمادہ کرنا ہے کہ جب تو اس سے کم درجہ کی چیز کا خیال رکھ رہا ہے تو اوپر کے درجہ کی چیز کا خیال تو تجھے بطریقۂ اولیٰ رکھنا چاہیے۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ وہ مت کر اور یہ کر۔

ہمارے معاشرہ کی اس خرابی کو دور کرنے کی آسان صورت یہی ہے کہ اگر وہ بیوی کے رشتہ داروں کے حقوق میں کوتاہی کرتا ہو تو ماں باپ خود کہیں کہ تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟ اور ان کا حق کیوں ادا نہیں کرتے؟ یا اگر وہ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے تو بیوی اور بیوی کے رشتہ داروں کو چاہیے کہ وہ کہیں کہ بھئی! تم ہمارے ساتھ تو اچھا معاملہ کرتے ہو اور اپنے ماں باپ، بھائیوں بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں نہیں کرتے؟ ان کے ساتھ تو زیادہ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر ایسا طریقہ اپنایا جائے تو آپ ہی آپ معاملہ سدھر جائے گا۔

کسی کی بدعملی تمہیں انصاف کے تقاضوں سے نہ ہٹاوے

اس کے برخلاف ہمارے یہاں تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ ہمارا اکیلے کا بن کر رہ جائے، جب ایسی کوشش کریں گے تو وہ آپ کا بھی نہیں بنے گا، اس لیے کہ جو اپنے ماں باپ کا نہیں بنا؛ وہ آپ کا کاہے کو بنے گا؟ سیدھی بات ہے۔ اس لیے یہ طریقہ غلط ہے اور شریعت اس چیز کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ کسی قوم کی خرابی اور بدعملی تمہیں انصاف کے تقاضوں سے نہ ہٹاوے یعنی مثلاً بیوی اور اس کے گھر والوں نے بدسلوکی کی ہے تو

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے یوں کہیں کہ ان کے ساتھ تعلق مت رکھو، یا ماں باپ نے بیوی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کیا ہے تو بیوی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شوہر سے کہے کہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی مت کرو؛ یہ انصاف کے تقاضہ سے ہٹنے والی بات ہے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر ایک کے حق کو ادا کیا جائے، اگر آپ کے ساتھ کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ انتقامی کارروائی شروع کر دیں، انتقامی کارروائی شروع کرنا یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کی حفاظت کرے کہ ایسی ہی بدلہ کی کارروائی اگر اللہ تعالیٰ ہم سے کرنے لگیں تو ہمارے لیے تو جینا دوبھر ہو جائے۔

بندہ طاقتِ انتقام نہ دارد

حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور جانشین اپنے مکتوبات میں اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ ''بندہ طاقتِ انتقام نہ دارد'' بندہ انتقام لینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ گویا یہ تو آدمی کو سوچنا ہی نہیں چاہیے، اگر کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا، انتقامی کارروائی کرنا تو گویا قانون اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ دنیا کی کوئی بھی حکومت یا مینجمنٹ اس بات کو برداشت نہیں کرے گا کہ اس کے ماتحتوں میں سے کوئی آدمی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے۔ ہم بھی اگر انتقامی اور بدلہ کی کارروائی پر اتر آتے ہیں تو در حقیقت ہم بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشے نہیں جائیں گے۔ اور پھر کسی نے اگر غلطی کی تو اپنا مزاج معاف کرنے کا بنایا جائے، یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس کو ہم معاف

کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف کرے گا، ہم نے بھی تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نافرمانیاں کی ہیں۔ خیر! بات دور نکل گئی۔

بیوی کی سہیلیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا

یہاں بات یہ چل رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ اگر بکری ذبح فرماتے تھے، تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں میں تقسیم فرماتے تھے، حالانکہ ان کے انتقال کو کئی سال ہو چکے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حضرت خدیجہ کا تذکرہ فرماتے تو مَیں کبھی یہ کہتی تھی کہ خدیجہ کے علاوہ دنیا میں کوئی عورت ہی نہیں ہے؟ حضور ﷺ جواب میں فرماتے کہ وہ ایسی تھی، ایسی تھی، یعنی ان کی خوبیوں کا تذکرہ فرماتے تھے، اور کبھی حضور ﷺ خاص یہ چیز فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری اولاد انہیں سے ہے سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے، کہ وہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے تھے، باقی حضرت خدیجہ کے علاوہ کسی ازواجِ مطہرات سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے یہاں تشریف لائیں اور انہوں نے گھر میں آنے کے لیے باہر سے اجازت طلب کی، ان کی آواز حضرت خدیجہ کی آواز سے ملتی جلتی تھی، اس آواز کو سن کر نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فرمایا کہ خدیجہ کی بہن ہالہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا ان کی آواز اور لہجہ نے حضرت خدیجہ کے لہجہ کی یاد دلا دی تو یہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کے لیے خوشی کا باعث بن گئی۔

نسبت اور تعلق کی وجہ سے چھوٹوں کا اکرام کرنا

٣٤٥: عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ رضی اللہ عنہ فِيْ سَفَرٍ، فَكَانَ يَخْدُمُنِيْ فَقُلْتُ لَهُ: لا تَفْعَلْ، فَقَالَ: اِنِّيْ قَدْ رَأَيْتُ الْأَنْصَارَ تَصْنَعُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم شَيْئًا آلَيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ أَنْ لَّا أَصْحَبَ أَحَداً مِّنْهُمْ اِلَّا خَدَمْتُهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سفر میں تھا، اور وہ میری خدمت کرتے تھے۔ مَیں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! آپ ایسا نہ کریں، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے حضراتِ انصار کو دیکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ مدد اور بڑا اکرام کیا کرتے تھے جب سے مَیں نے ان کو ایسا کرتے دیکھا اس وقت سے قسم کھا رکھی ہے کہ ان انصار کے خاندان کا کوئی بھی آدمی ہوگا، مَیں اس کی خدمت کیا کروں گا۔

افادات: حضرت جریر رضی اللہ عنہ بڑے صحابہ میں سے ہیں، عمر میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے۔ اور وہ سفر میں حضرت انس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی خدمت کرتے تھے، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ تو بڑے ہیں، آپ میرا کام کرتے ہیں تو مجھے بھی شرم آتی ہے، مَیں آپ کا کام کیا کروں گا۔ تو حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ مَیں نے مدینہ منورہ کے رہنے والے حضراتِ انصار کو دیکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ مدد اور بڑا اکرام کیا کرتے تھے۔ جب سے مَیں نے ان کو ایسا کرتے دیکھا اس وقت سے قسم کھا رکھی ہے کہ ان انصار کے خاندان کا کوئی بھی آدمی ہوگا، مَیں اس کی خدمت کیا کروں گا۔ چوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ انصاری تھے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو جو نسبت اور تعلق تھا اس کا حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے کتنا زیادہ خیال کیا کہ بڑے ہونے اور منع کرنے کے باوجود حضرت انس کی - جو چھوٹے تھے-

خدمت کرتے تھے۔ ہمارے اکابر کی یہی تعلیم ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی ہدایت اور آپ کے ارشادات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

آج کل یہ ساری چیزیں ہم نے چھوڑ رکھی ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے، گھروں اور خاندانوں میں اور قبیلوں میں کوئی تعلقات باقی نہیں ہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑے اور ایک دوسرے کے ساتھ بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ اگر ان ساری تعلیمات پر عمل کا اہتمام کیا جائے تو کبھی بھی آپس کے جھگڑے اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اِكْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَبَيَانِ فَضْلِهٖ

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

۱۳ر صفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۲۹ر مئی ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِینُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰـہ اِلَّااللّٰہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَـہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تَعَالیٰ عَلَیْـہِ وَعَلیٰ اٰلِـہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد:

أعوذباللّٰہمن الشیطان الرجیم، بسم اللّٰہالرحمن الرحیم اِنَّمَایُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ أَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً.

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے "اِکْرَامُ أَھْلِ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَبَیَانُ فَضْلِہٖ" نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت، آپ کے خاندان والوں کا اکرام اور اس کی فضیلت کا بیان۔ بیت کا معنٰی گھر، اہلِ بیت یعنی گھر والے۔ اہلِ بیت کا مصداق کون ہیں؟ اس سلسلہ میں اہلِ سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور آپ کی اولاد اور آپ کے خاندان بنو ہاشم والے؛ سب اہلِ بیت میں داخل ہیں۔

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی دو آیتیں پیش فرمائی ہیں، پہلی آیت سورۂ احزاب کی ہے، اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو خطاب کر کے بہت ساری چیزیں بطورِ ہدایت بتلائی گئی ہیں اور بہت سارے احکام دیے گئے ہیں، انہیں کے درمیان یہ آیت بھی ہے ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰہ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ أَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً﴾ اے نبی کے گھر والو! اللہ

تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گناہ اور نافرمانی کی گندگیوں کو دور کردے اور تم کو اس قسم کی چیزوں سے- چاہے وہ اعتقادی ہوں یا عملی، قولی ہوں یا اخلاقی، ہر قسم کی گندگیوں سے- مکمل طور پر پاک کردے، اس لیے تمہیں یہ احکام دیئے جارہے ہیں۔

اہلِ بیت سے کون مراد ہے؟

اس آیت میں اہلِ بیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا مصداق کون ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد وعکرمہ وغیرہ حضرات سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہلِ بیت سے مراد تو ازواجِ مطہرات ہی ہیں، اور اس کی دلیل میں وہ یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے والی اور اس کے بعد والی آیتوں میں صراحتاً عربی کا صیغہ جمع مؤنث حاضر استعمال کیا گیا ہے، اس لیے درمیان میں بھی یہی مراد ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کی تفسیر کرنے والے خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے صاحبزادے ہیں، اور وہ خود بھی اہلِ بیت میں سے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ویسے حدیث سے دیگر حضرات کا بھی اہلِ بیت میں سے ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالوں کی بنی ہوئی کالی چادر زیب تن فرما کر باہر تشریف لائے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ نے اس چادر میں ان کو بھی سمولیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو بھی سمولیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو بھی لے لیا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے ان کو بھی لے لیا، اور پھر فرمایا کہ اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں (مسلم شریف،٦٤١٤) اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات بھی

اہلِ بیت میں سے ہیں۔ یہاں تو یہ بات چل رہی تھی کہ اس آیت میں اہلِ بیت کا جو لفظ استعمال کیا گیا اس سے کون مراد ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے تو یہ ہے کہ اس آیت میں تو صرف ازواجِ مطہرات ہی مراد ہیں۔

البتہ دوسری جماعت اس بات کی طرف بھی گئی ہے کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور اولاد اور آپ کے خاندان والے سب ہی مراد ہیں، اور اس کی دلیل میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے پہلی آیتوں میں جہاں ازواجِ مطہرات کو خطاب ہے وہاں جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ''کُنَّ'' استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے بعد کی آیتوں بھی وہی صیغہ ''کُنَّ'' استعمال کیا گیا، لیکن اس آیت میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ''کُمْ'' استعمال کیا گیا ہے، اس کی مصلحت ہی یہ ہے۔ گویا یہ بتلانا ہے کہ صرف ازواجِ مطہرات ہی نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کے دوسرے اہلِ خاندان بھی اس میں داخل ہیں، اسی مصلحت کے پیشِ نظر اس آیت میں صیغہ بدلا گیا ہے۔

اگرچہ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ چوں کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو بھی ازواجِ مطہرات کے ساتھ شامل کرنا مقصود تھا، اس لیے آپ کے مذکر ہونے کی وجہ سے آپ کو غلبہ دیتے ہوئے جمع مذکر حاضر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

بہرحال! یہ ایک علمی بحث ہے جو پیش کر دی گئی، باقی اتنی بات ضرور ہے کہ اہلِ سنت الجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہلِ بیت میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور آپ کے اہلِ خاندان، آپ کی صاحبزادیاں اور ان کی اولاد؛ سب ہی داخل ہیں۔

ہر سید علوی ہے، لیکن ہر علوی کا سید ہونا ضروری نہیں

ویسے آپ ﷺ کی صاحبزادیوں میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نسل

چلی ہے،اس معنیٰ کرا گر دیکھا جائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کی اولا داس وقت دنیا کے اندر ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیدا ہوئیں، ویسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اور بیویاں بھی تھیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور بھی کئی نکاح کئے اوران بیویوں سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولا د ہوئی ،لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ اولا د جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوئی؛ان کو سادات کہا جاتا ہے،اور ہمارے یہاں اصطلاح میں لفظِ سید عام طور پر صرف اُنہیں کے لیے بولا جاتا ہے،وہ علوی بھی ہیں اور سید بھی ہیں۔ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے جو اولا د پیدا ہوئی وہ علوی تو کہلائے گی لیکن ان کا سید ہونا ضروری نہیں ہے،اس لیے ہر سید علوی تو ہے لیکن ہر علوی کا سید ہونا ضروری نہیں۔

مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خاندان بنو ہاشم بھی اہلِ بیت کا مصداق ہیں۔اب ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولا د بھی شامل ہے،حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نسل نہیں چلی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر گذرا۔ان کے ایک بھائی حضرت جعفر اور حضرت عقیل کی اولا د بھی اہلِ بیت میں داخل ہے۔

دلوں کے تقویٰ کی بات

﴿وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَاللّٰهِ فَاِنَّهَامِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ﴾ یہ آیت پہلے بھی گذر چکی ہے،اس کا ترجمہ بتلایا گیا تھا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور جن چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا نام لگا ہوا ہے،ان چیزوں کی جو آدمی تعظیم کرتا ہے اور ان کا ادب و احترام کرتا ہے؛ یہ دلوں کے تقویٰ کی بات ہے،ان چیزوں میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور آخری پیغمبر ہیں،تو شعائر اللہ میں سب

سے اونچا مقام آپ ہی کا ہے، اس نسبت سے آپ ﷺ کی جو آل و اولاد ہے وہ بھی شعائر اللہ کا مصداق بن سکتی ہے، اس معنٰی کر اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔ بہرحال! یہ باب قائم کر کے اہلِ بیت کا اکرام اور ان کی فضیلت کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی محبت ایمان کا جزو ہے

نبی کریم ﷺ کی محبت ایمان کا جزو ہے، آپ ﷺ کی محبت کے بغیر کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا بلکہ آپ ﷺ کی محبت آدمی کو اپنی، اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور تمام لوگوں کی محبت پر غالب رہنی چاہیے، جب تک کہ یہ محبت غالب نہیں ہوگی تب تک اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا۔ ویسے نفسِ ایمان کے لیے محبتِ رسول تو ضروری ہے، البتہ باقی تمام محبتوں کے مقابلہ میں نبی کریم ﷺ کی محبت کا غالب ہونا؛ یہ ایمان کے کمال کے واسطے ضروری ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ" (سنن دارمی۔۲۷۴۱) تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ مَیں (نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس) اس کی نگاہوں میں اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اور جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں ان کو الحمد للہ فی الجملہ یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہونے کی دلیل

بعض مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ یہ کیفیت مجھے حاصل نہیں ہے، حالانکہ یہ کیفیت فی الجملہ ہر اہل ایمان کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ہیں اور ہمارے اکابر میں تقویٰ کے اعتبار سے ان کا بڑا اونچا مقام

ہے، وہ ایک جگہ تشریف لے گئے وہاں کے نواب صاحب نے اس حدیث پر یہ سوال کیا کہ حضرت! نبی کریم ﷺ کی محبت اپنی، اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے، لیکن بہت سے لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ حضرت مفتی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس حدیث پر بیان شروع کیا اور حضورِ اکرم ﷺ کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کیے، اور بیان کرتے ہوئے درمیان میں کہا کہ اچھا! اس بات کو چھوڑو، اور نواب صاحب آپ کے بڑوں کا کچھ تذکرہ ہوجائے۔ فوراً نواب صاحب کہنے لگے کہ حضرت! نعوذ باللہ من ذالک۔ اللہ کی پناہ! نبی کریم ﷺ کا تذکرہ ہورہا تھا اور درمیان میں آپ میرے خاندان کے بڑوں کی بات کہاں لائے؟ حضرت مفتی صاحب نے کہا کہ اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کو یہ بات گوارہ نہیں ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کا تذکرہ چل رہا تھا، اس کو درمیان میں چھوڑ کر آپ کے ماں باپ یا آپ کے خاندان کے بڑوں کا تذکرہ کیا جائے؛ تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی محبت آپ کے دل میں ان تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔

یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اشکال رہتا ہے۔ کسی کی بیوی یا بیٹا نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں ذرا سی ادنیٰ گستاخی کا کوئی لفظ بول دے تو کیا وہ آدمی اس کو برداشت کرے گا؟ بالکل نہیں کرے گا۔ کیسا ہی گیا گذرا آدمی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات پر کوئی نہ کوئی ایکشن ضرور لے گا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں نبی کریم ﷺ کی محبت موجود ہے۔

محبوب سے متعلق چیزوں کی محبت

خیر! نبی کریم ﷺ کی محبت جب تک سب کی محبت پر غالب نہ ہو وہاں تک آدمی

مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اور مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جس کے ساتھ بھی آدمی کو محبت ہوتی ہے تو اپنے محبوب کا تعلق جن جن چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان تمام چیزوں کے ساتھ بھی آدمی کے دل میں محبت و تعظیم وعقیدت ہوتی ہے۔ اگر آج اس مجلس میں کوئی آدمی ایک کرتہ لے کر آئے اور یوں کہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا کرتہ مبارک ہے، تو آپ اور مَیں اس کرتہ کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ یا اگر حلف کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا بال مبارک ہے تو اس کے ساتھ تعظیم کا جو معاملہ مَیں اور آپ کریں گے وہ ظاہر ہے، مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے ان چیزوں کی محبت و تعظیم اور ان کے ساتھ اکرام کا سلوک ہم اپنے ایمان کا ایک حصہ اور جزو سمجھتے ہیں۔ اسی طریقہ سے جو لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاندانی رشتہ و تعلق رکھتے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ہیں ان کے ساتھ کس طرح کی تعظیم و اکرام کا سلوک کرنا چاہیے؛ یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ایک دو روایتیں پیش کرتے ہیں۔

مقامِ غدیرِ خُم کا خطبہ

٣٤٦: عن يزيدبن حَيَّانَ قَالَ: اِنْطَلَقْتُ أَنَاوَحُصَيْنُ بْنُ سَبْرَةَ وَعَمْرُو بْنُ مُسْلِمٍ اَلىٰ زَيْدِبْنِ أَرْقَمَ رضی اللہ عنہ، فَلَمَّاجَلَسْنَااِلَيْهِ، قَالَ لَهُ حُصَيْنٌ: لَقَدْلَقِيْتَ يَازَيْدُ خَيْراً كَثِيْراً، رَأَيْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، وَسَمِعْتَ حَدِيْثَهُ، وَغَزَوْتَ مَعَهُ، وَصَلَّيْتَ خَلْفَهُ، لَقَدْلَقِيْتَ يَازَيْدُ خَيْراً كَثِيْراً۔ حَدِّثْنَايَازَيْدُمَاسَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ قَالَ: يَاابْنَ أَخِيْ! وَاللّٰهِ لَقَدْ كَبُرَتْ سِنِّيْ، وَقَدُمَ عَهْدِيْ، وَنَسِيْتُ بَعْضَ الَّذِيْ كُنْتُ أَعِيْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَمَاحَدَّثْتُكُمْ؛ فَاقْبَلُوْا وَمَالَا؛ فَلَا تُكَلِّفُوْنِيْهِ۔ ثُمَّ

قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَوْماً فِیْنَا خَطِیْباً بِمَآءٍ یُدْعیٰ خُمّاً بَیْنَ مَکَّۃَ وَالْمَدِیْنَۃِ، فَحَمِدَ اللّٰہَ وَأَثْنیٰ عَلَیْہِ، وَوَعَظَ، وَذَکَّرَ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ: أَلَا أَیُّھَا النَّاسُ، فَاِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ؛ یُوْشِکُ أَنْ یَأْتِیَ رَسُوْلُ رَبِّیْ فَأُجِیْبُ، وَأَنَا تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ۔ أَوَّلُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ؛ فِیْہِ الْھُدیٰ وَالنُّوْرُ، فَخُذُوْا بِکِتَابِ اللّٰہِ، وَاسْتَمْسِکُوْا بِہٖ۔ فَحَثَّ عَلیٰ کِتَابِ اللّٰہِ، وَرَغَّبَ فِیْہِ۔ ثُمَّ قَالَ: وَأَھْلُ بَیْتِیْ، أُذَکِّرُکُمُ اللّٰہَ فِیْ أَھْلِ بَیْتِیْ أُذَکِّرُکُمُ اللّٰہَ فِیْ أَھْلِ بَیْتِیْ۔ فَقَالَ لَہٗ حُصَیْنٌ: وَمَنْ أَھْلُ بَیْتِہٖ یَا زَیْدُ؟ أَلَیْسَ نِسَآؤُہٗ مِنْ أَھْلِ بَیْتِہٖ؟ قَالَ: نِسَآؤُہٗ مِنْ أَھْلِ بَیْتِہٖ، وَلٰکِنْ أَھْلُ بَیْتِہٖ مَنْ حُرِمَ الصَّدَقَۃَ بَعْدَہٗ۔ قَالَ: وَمَنْ ھُمْ؟ قَالَ: ھُمْ آلُ عَلِیٍّ، وَآلُ عَقِیْلٍ، وَآلُ جَعْفَرَ، وَآلُ عَبَّاسٍ۔ قَالَ: کُلُّ ھٰؤُلَآءِ حُرِمَ الصَّدَقَۃَ؟ قَالَ: نَعَمْ. (رواہ مسلم)

وفی روایۃ: أَلَا وَإِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ، أَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ، مَنِ اتَّبَعَہٗ کَانَ عَلَی الْھُدیٰ وَمَنْ تَرَکَہٗ کَانَ عَلیٰ ضَلَالَۃٍ.

ترجمہ: یزید بن حیان کہتے ہیں کہ مَیں اور حصین بن سبرہ اور عمرو بن مسلم (یہ تینوں تابعین میں سے ہیں) حضرت زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو حصین بن سبرہ نے ان سے کہا: اے زید! آپ نے تو بہت بڑی سعادت اور بھلائی پائی ہے، نبی کریم ﷺ کا دیدار کیا، آپ کے ارشادت کو سنا، نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شرکت کا موقع ملا، نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کی سعادت وخوش بختی حاصل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت ساری بھلائیوں سے نوازا، گویا آپ تو بڑے صاحبِ قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری فضیلتیں آپ کو عطا فرمائیں، اس لیے اے زید! آپ نے نبی کریم ﷺ سے جو چیزیں سنی ہیں ان میں سے کوئی بات سنائیے۔ (اس وقت حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے) فرمانے لگے کہ اے بھتیجے! اللہ کی قسم میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے، اور نبی کریم ﷺ کی صحبت کا زمانہ بھی بہت طویل ہوگیا ہے اور نبی کریم ﷺ کے جو ارشادات مجھے یاد تھے ان میں سے بہت کچھ مَیں بھول چکا ہوں، اس لیے حضورِ اکرم ﷺ کی زبانِ

مبارک سے سنے ہوئے ارشادات میں سے جو مجھے یاد ہیں وہ مَیں تمہارے سامنے پیش کروں گا، ان کو سنکر قبول کرلو، اور جو پیش نہ کرسکوں ان کو پیش کرنے کا مجھے پابند نہ بناؤ۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا: ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ پانی کے ایک چشمہ کے پاس جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان میں واقع ہے، جس کا نام ''خُم'' ہے، ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا: اے لوگو سنو! مَیں ایک انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہنا مقدر نہیں فرمایا، ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا میرے پاس آجائے اور مَیں اللہ تعالیٰ کی اس طلب پر لبیک کہوں۔ اس لیے مَیں تمہارے درمیان دو وزنی اور مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، پہلی تو قرآنِ پاک ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور اس میں نور اور روشنی بھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر جمے رہو، اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قرآنِ پاک پر عمل کرنے کی ترغیب دی اور اُبھارا۔ اس کے بعد فرمایا کہ دوسری چیز جو تمہارے درمیان چھوڑ کر جارہا ہوں وہ میرے خاندان والے اور اہلِ بیت ہیں، مَیں تم کو میرے گھر والوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں، ان کے ساتھ اکرام اور محبت کا معاملہ کرنا۔ مَیں تم کو اہل بیت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔ اس پر حضرت حصین بن سبرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے زید! نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! آپ کی پاکیزہ بیویاں اہلِ بیت میں سے ہیں، اور جن لوگوں پر زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے یعنی بنو ہاشم؛ وہ سب حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ وہ کون کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت علی، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی اولاد؛ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کیلیے زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے، اور وہی نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت ہیں۔

افادات: یہ واقعہ حجۃ الوداع سے واپسی کا ہے، نبی کریم ﷺ نے ۱۰ سنہ ھ میں حج فرمایا تھا اور وہاں سے واپسی کے بعد تقریباً اسّی (۸۰) سے نوے (۹۰) دن کے درمیان نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔ تو واپسی میں مقامِ ''خم'' میں پانی کا ایک چشمہ تھا اور وہاں پانی جمع ہو گیا تھا اس لیے اس کو تالاب اور ''غدیرِ خم'' بھی کہتے ہیں،

مقامِ جُحفہ جوشام والوں کی میقات ہے اسی کے قریب یہ علاقہ واقع ہے، وہاں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ دیا۔

خطبۂ غدیر خم کا پس منظر

سیر اور تاریخ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی ایک وجہ ہوئی تھی۔ حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری شریف میں بھی موجود ہے، ان کو کسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بدگمانی ہوگئی تھی، اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کے متعلق کچھ کدورت اور معمولی سا میل تھا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت کا خُمس وصول کرنے کے لیے یمن بھیجا تھا، اور جس لشکر کے پاس سے یہ مالِ غنیمت کا خُمس وصول کرنا تھا اس کے سپہ سالار حضرت خالد رضی اللہ عنہ تھے، اسی لشکر میں حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو خُمس وصول کیا اس مال میں جو باندیاں تھیں ان میں سے ایک باندی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے استعمال کے لیے رکھ لی ویسے مالِ غنیمت کا جو خُمس ہوتا ہے اس میں اہلِ بیت کا بھی حصہ ہے ﴿وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى﴾ (الأنفال-٤١) اس خُمس کا پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کے خاندان والوں کا بھی ہے، اسی نسبت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس باندی کو اپنے حصہ میں لیا تھا، لیکن چوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسروں کے سامنے اس کی وضاحت نہیں کی تھی اس لیے کچھ حضرات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بدگمانی ہوئی۔ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بھی کہا کہ وہ باندی انہوں نے رکھ لی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! تم حضورِ اکرم ﷺ سے اس کا تذکرہ کرنا۔ خیر! وہیں سے پھر وہ لوگ حجۃ الوداع میں پہنچے تھے اور وہاں سے واپسی میں مدینہ منورہ جاتے ہوئے حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں کہ مَیں نے موقع دیکھ کر نبی کریم ﷺ سے حضرت علی کی شکایت کی، اس پر نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے بریدہ! کیا تمہارے دل میں ان کے لیے میل وکدورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! انہوں نے ایسا کیا ہے اس لیے میل ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ ان کے متعلق اپنے دل میں میل مت رکھو، اس لیے کہ ان کا (حضرت علی کا) حق مالِ غنیمت کے خُمس میں اس سے زیادہ ہے جو انہوں نے لیا ہے۔ انہوں نے یہ جو باندی لی ہے وہ تو اپنے حق سے بہت کم ہے، اس سے زیادہ لیتے تب بھی ان کے لیے تو اجازت تھی۔ ان کے اس فعل پر تم اپنے دل میں کدورت کیوں رکھتے ہو؟ اس کو دور کرو۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، مَیں نے دور کردی۔ جب بات صاف ہوگئی تو وہاں اب دیر کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ (بخاری شریف،۴۳۵۰)

مَیں جس کا دوست، علی بھی اس کے دوست

اس لیے کہ ایسی باتیں تو معاشرہ کے اندر پیش آتی ہی رہتی ہیں، اور آئندہ اپنے اہلِ خاندان اور اپنے اہلِ بیت کے ساتھ لوگوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے، اور آنے والی اُمت کو بھی آگاہ کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اسی مقام ''غدیرِ خُم'' پر ایک خطبہ دیا، اور اسی تقریر میں نبی کریم ﷺ نے یہ باتیں بھی ارشاد فرمائیں، اور وہ جملہ بھی فرمایا جو روایتوں میں آتا ہے ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ، فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ'' (ترمذی۔۳۷۱۳) حضور ﷺ نے فرمایا کہ مَیں جس کا دوست؛ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ یعنی جو آدمی مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہے اس کو چاہیے کہ حضرت علی کو بھی اپنا دوست بنائے۔

شیعوں کی تردید

اس جملہ کی وجہ سے اہلِ سنت اور شیعہ کے درمیان میں ایک مسئلہ پیدا ہوگیا۔

شیعہ لوگ نعوذ باللہ یوں کہا کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے اولین حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے آکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق مارا۔ اور وہ لوگ ان حضراتِ خلفاءِ ثلاثہ کو برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ فضیلت اور خلافت کی ترتیب وہی ہے۔

شیعہ اسی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں کہ دیکھو! ''غدیرِ خُم'' میں نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ، فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ'' مَیں جس کا دوست؛ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ حالانکہ اسی روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی کہ تمہارے متعلق حضورِ اکرم ﷺ نے بہت اونچی بات ارشاد فرمائی۔ لیکن اہلِ سنت و الجماعت کا موقف یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ مَیں جس کا دوست، علی بھی اس کے دوست ہیں، اور پھر آپ نے اپنے اہلِ بیت کی فضیلت اور اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی؛ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے اولین حق دار حضرت علی ہیں؟ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو مجھ سے محبت کا دعویٰ رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی محبت کرے، چوں کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ والا واقعہ پیش آیا تھا، اسی مناسبت سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کے متعلق دل میں کسی طرح کا میل نہیں رہنا چاہیے، چاہے کچھ بھی بات پیش آجائے، اس لیے اس روایت سے شیعوں کا یہ دلیل پکڑنا درست نہیں ہے۔ بلکہ اس خطبہ میں تو تمام صحابہ موجود تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آخری بیماری میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کی طبیعتِ

مبارکہ کچھ ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن اس سے بے فکر مت ہو جانا، آپ کا وقتِ موعود اب قریب آچکا ہے، اس لیے چلو! چل کر پوچھ لیں کہ آپ کے بعد حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں رہے گی، اس لیے کہ ہوتا یہ ہے کہ جو حاکم ہوتا ہے اس کے بعد اس کی اولاد ہی آتی ہے، اس لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ چل کر پوچھ لیں، اگر وہ بنوہاشم ہی میں ہے تب تو چل جائے گا، اور اگر وہ دوسروں کے پاس ہے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کریں گے کہ ان کو ذرا ہدایت دیدیجئے کہ وہ ہم بنوہاشم کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو نہیں آؤں گا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا کہ بنوہاشم میں نہیں ہے تو پھر کبھی کوئی نہیں دے گا۔ (بخاری شریف، ۴۱۸۲)

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر اس خطبہ کا یہی مقصد ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے کہ پوچھنے جانے کی کیا ضرورت ہے، آپ کو تو معلوم ہی ہے، آپ خود بھی اس وقت موجود تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ، فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ" اس سے ہمارا حق بنتا ہے۔ جب یہ حضرات خود اس جملہ سے اپنا حق نہیں سمجھے تو پھر دوسرے لوگ اس سے ان کا حق کیسے ثابت کرتے ہیں؟ اور بھی باتیں ہیں۔ ضمناً یہ بات آگئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ باتیں پیش کر دوں۔

اہلِ بیت کے بارے میں تاکید

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ حجۃ الوداع سے واپسی میں مقام "غدیرِ خُم" میں دیا، اسی خطبہ کے کچھ اجزاء کو حضرت زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ نقل کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ اے لوگو سنو! میں ایک انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ نے کسی

انسان کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہنا مقدر نہیں فرمایا، ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا میرے پاس آجائے اور مَیں اللہ تعالیٰ کی اس طلب پر لبیک کہوں، گویا آپ ﷺ نے پہلے ہی اس بات سے باخبر کر دیا کہ میرا دنیا سے رخصت ہونے کا زمانہ قریب آگیا ہے، چنانچہ حجۃ الوداع سے واپسی ہی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ کو بتلا دیا تھا کہ اب آپ کی وفات کا وقت قریب آچکا ہے۔

اور فرمایا کہ مَیں تمہارے درمیان دو وزنی اور مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں پہلی تو قرآنِ پاک ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور اس میں نور اور روشنی بھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر جمے رہو، مطلب یہ ہے کہ اس میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان پر پورے طور پر عمل کرو، اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قرآنِ پاک پر عمل کرنے کی ترغیب دی اور اُبھارا اس کے بعد فرمایا کہ دوسری چیز جو تمہارے درمیان چھوڑ کر جارہا ہوں وہ میرے خاندان والے اور اہلِ بیت ہیں، مَیں تم کو میرے گھر والوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں یعنی ان کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، ان کے حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی مت کرنا، ان کے ساتھ اکرام اور محبت کا معاملہ کرنا، مَیں تم کو اہلِ بیت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔

اہلِ بیت کا مصداق

اس پر حضرت حصین بن سبرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے زید! نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! آپ کی پاکیزہ بیویاں اہلِ بیت میں سے ہیں، اور جن لوگوں پر زکوٰۃ

لینا حرام قرار دیا گیا ہے یعنی بنو ہاشم؛ وہ سب حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہیں پھر انہوں نے پوچھا کہ وہ کون کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت علی، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی اولاد؛ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے لیے زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے اور وہی نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت ہیں۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اپنے اہلِ بیت کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت کا معاملہ کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔

اگر نبی کریم ﷺ کی روحانی توجہات چاہئیں

٣٤٨: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنْ أَبِي بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ رضی اللہ عنہ مَوْقُوْفاً عَلَيْهِ أَنَّهُ قَالَ: أُرْقُبُوْا مُحَمَّداً ﷺ فِيْ أَهْلِ بَيْتِهِ. (رواہ البخاری)

معنیٰ أُرْقُبُوْا: رَاعُوْهُ وَاحْتَرِمُوْهُ وَأَكْرِمُوْهُ.

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اہلِ خاندان اور آپ کے اہلِ بیت کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کا خیال رکھیو۔

افادات: یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ یعنی حضور ﷺ کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے خاندان والوں کے ساتھ محبت و اکرام کا، خدمت اور بھلائی کا سلوک کرتے رہیو، ان کے حقوق کو ادا کرتے رہیو۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے جو اہلِ بیت، خاندانِ بنو ہاشم اور سادات ہیں ان کے ساتھ نہایت ہی اکرام و احترام کا معاملہ کرنا چاہیے اور جیسا کہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ سادات کا لفظ تو نبی کریم ﷺ کی اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے چلی ہے اسی کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن اہلِ بیت کا مفہوم زیادہ عام ہے،

اس میں ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے جو اولاد ہیں، اسی طرح حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں ان کی اولاد یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کی اولاد بھی داخل ہے، اور یہ سب اہلِ بیت کہلاتے ہیں، ان تمام کے حقوق ادا کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، ان کے ساتھ آدمی جتنا بھلائی اور احسان کا سلوک کرسکتا ہو، اس میں اپنی طرف سے کمی نہ کرے، بلکہ ان کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جتنا بھی محبت و اکرام کا معاملہ کیا جائے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی توجہات اتنی ہی زیادہ اس کو حاصل ہوں گی۔ آج بھی جو لوگ اس قسم کا معاملہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھلائی اور برکت کی شکل میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خواب میں بشارت کی صورت میں محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ''سفینۃ الخیرات'' ہے، اصل تو اردو میں تصنیف فرمائی تھی، گجراتی میں بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوچکی ہے، اس کتاب میں انہوں نے اس قسم کے کئی واقعات ذکر کئے ہیں۔ ویسے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اس سلسلہ میں کئی کتابیں ہیں، اور اب تو اس موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں اس قسم کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔

آج ہم تمہاری عزت افزائی کرتے ہیں

اسی کتاب میں ایک واقعہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے ہمارے تمام سلسلوں میں آتے ہیں، بزرگوں میں

ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کو ''سید الطائفہ'' کہا جاتا ہے، یعنی صوفیوں کی جماعت کے سردار ہیں، تصوف کے ہر سلسلہ میں چاہے وہ چشتیہ ہو، قادریہ ہو، سہروردیہ ہو، یا نقشبندیہ ہو؛ تمام سلسلوں میں ان کا نام آتا ہے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ پہلے شاہی پہلوان اور کشتی باز تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ شاہی پہلوان کے لیے تنخواہ تو ہوتی ہی ہے اور ساتھ ہی ساری سہولتیں اور ہر طرح کی فیسلیٹی بھی مہیا ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک اجنبی مسافر عام جسمانی بناوٹ کا آیا، دبلا پتلا آدمی تھا، اس نے آکر چیلنج کیا کہ مَیں شاہی پہلوان کو چت کرسکتا ہوں۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم نے جنید کو دیکھا بھی ہے؟ وہ تو بڑے ہٹے کٹے، اور بڑے مضبوط وتنومند اور بڑے ڈیل ڈول والے آدمی ہیں تم تو ان کی ایک انگلی سے ہی چت ہوجاؤ گے، ان کو چت کرنے کا دعویٰ کہاں کرتے ہو، اس نے کہا کہ مَیں چیلنج کرتا ہوں۔ یہ بات خوب پھیلی اور بادشاہ تک بھی پہنچی، جب اس نے شاہی پہلوان کو چیلنج کیا تو اس کو کیسے برداشت کیا جاسکتا تھا، لوگوں نے اس کو بہت ہی سمجھایا کہ یہ حماقت کہاں کرتے ہو؟ لیکن اس نے کہا کہ نہیں! مجھے تو مقابلہ کرنا ہی ہے، چنانچہ مقابلہ طے ہوا، اور تاریخ اور وقت طے ہوگیا، اطراف بستی اور دارالسلطنت کے تمام لوگ، اور جن جن لوگوں کو پتہ چلا؛ سب ہی وقت پر پہنچ گئے اور بہت بڑا مجمع جمع ہوگیا، حضرت جنید جو پہلوان تھے وہ بھی مقابلہ کے لیے آئے، اور ادھر سے یہ آدمی بھی آئے، جب دونوں اکھاڑے کے میدان میں آمنے سامنے پہنچے تو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے حضرت جنید کے کان میں اس آدمی نے یوں کہا کہ مَیں آلِ رسول ہوں اور قسمت کا مارا ہوا پریشان حال ہوں، اور مَیں نے یہ سب اس لیے کیا ہے کہ اس مقابلہ کے بہانے سے میری عزت بڑھے اور مجھے کچھ انعام ملے، اب سارے معاملہ کو سنبھالنا تمہارے ہاتھ

میں ہے۔بس!اس گفتگو کے بعد مقابلہ شروع ہوا تو حضرت جنید چت پڑ گئے، لوگوں میں شور مچ گیا کہ ایسے شاہی پہلوان جس کو آج تک کوئی چت نہ کر سکا، آج کیسے چت ہو گئے؟ اور ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بات خلافِ توقع پیش آتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ پھر سے مقابلہ ہو، جیسے بچے جب کھیلتے ہیں اور پہلی بال پر جب اسٹامپ اُڑ جائے تو کہتے ہیں کہ ٹرایل بال تھی، ایسی بات ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔اسی طرح یہاں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے کہا کہ پھر سے مقابلہ ہو۔چنانچہ پھر سے مقابلہ ہوا تو دوبارہ وہ چت ہو گئے، تیسری مرتبہ مقابلہ ہوا تو تیسری مرتبہ بھی چت ہو گئے، اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، حالانکہ شاہی پہلوان کا اس طرح چت ہو جانا بڑی ذلت کی بات تھی۔خیر!اس آدمی کی جیت کا اعلان ہو گیا اور اس کو بڑا انعام دیا گیا اور شاہی جوڑا دیا گیا اور بڑی عزت ہوئی۔بعد میں بادشاہ نے حضرت جنید سے پوچھا کہ کیا بات تھی، آپ پر ایسی کیا افتاد پڑی تھی کہ تین تین مقابلے اور راؤنڈ ہوئے اور تینوں ہی میں آپ ہار گئے اور چت ہو گئے؟ اس پر انہوں نے جو حقیقت تھی وہ بتلائی کہ اس نے مجھے یہ کہا تھا اور میری غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ اس کے سامنے مَیں مقابلہ جیت جاؤں۔بادشاہ کو بھی بڑا تعجب ہوا کہ ایسی بے نفسی کا معاملہ کیا کہ اتنے بڑے مجمع کے سامنے چت ہو کر نبی کریم ﷺ کی آل کے احترام کے لیے اپنی ذلت کو گوارہ کر لیا۔اور یہ بہت بڑی بات تھی۔

خیر!اسی رات کو حضرت جنید نے خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے فرمایا کہ اے جنید! آجاؤ، جس طرح تم نے میری آل کا اکرام کیا ہے، اور ان کی عزت افزائی کی ہے؛ آج ہم تمہاری عزت افزائی کرتے ہیں۔اور پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے سینے سے ملا لیا۔اس کے بعد جب صبح کو اٹھے تو پھر ان کا رجحان اس پہلوانی سے ہٹ کر

اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف ہوا، اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے، اور وہ اونچا مقام حاصل کیا کہ آج تمام سلسلوں میں بڑے قرار دیئے جاتے ہیں۔ تو دیکھئے! ان کو یہ مقام آخر کیسے حاصل ہوا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک اچھے جذبہ سے کیا ہوا کوئی معمولی سا کام آدمی کی زندگی کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔

سادات کا خیال رکھنے کا انعام

ایک اور واقعہ لکھا ہے: ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ حج کے ارادے سے مَیں نے پانچ سو درہم جمع کئے تھے، ویسے فرض حج تو ادا کر چکا تھا، نفلی حج کے لیے جانا چاہتا تھا اور ہمارے علاقہ کے لوگ اسی دن روانہ ہونے والے تھے، وہ پانچ سو درہم لے کر مَیں بازار میں کچھ ضروری سامان خریدنے کے لیے نکلا، راستہ میں ایک عورت ملی، اس نے کہا کہ مَیں سادات میں سے ہوں، میری بچیاں گھر پر بھوکی ہیں اور مَیں ضرورت مند ہوں، آپ میری ضرورت پوری کر دیجئے۔ انہوں نے اسی وقت پانچ سو درہم کی وہ تھیلی اس کے حوالہ کر دی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں بھی ایسا اطمینان و سکون عطا فرمایا کہ حج کا وہ جذبہ بھی دور ہو گیا اور مجھے اسی پر سکون مل گیا اور وہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ پھر جب میرے شہر کے وہ لوگ حج سے واپس آئے تو مَیں ان کے استقبال کے لیے گیا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ لوگ حاجیوں کو دعا دیتے تھے: "بَارَكَ اللّٰهُ فِيْ حَجِّكُمْ، وَتَقَبَّلَ اللّٰهُ سَعْيَكُمْ" اللہ تعالیٰ تمہارے حج میں برکت دے، تمہاری کوشش کو قبول فرمائے۔ تو مَیں ان کو یہ دعا دیتا تھا تو وہ بھی جواب میں مجھے یہی دعا دیتے تھے، مَیں جتنے بھی حاجیوں سے ملتا سب مجھے یہی دعا دیتے تھے، آخر مَیں نے ایک سے کہا کہ کیا بات ہے؟ آخر تم مجھے یہ دعا کیوں دیتے ہو؟ تو وہ کہنے لگا کہ تم تو وہاں حج کے اندر

ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سارا ماجرا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ رات کو نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے میری اولاد کے ساتھ جو معاملہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ایک فرشتہ تمہاری شکل کا پیدا کر دیا ہے جو قیامت تک ہر سال تمہاری طرف سے حج کرتا رہے گا۔

شریف زادی سیدانی کا دردانگیز واقعہ

ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک سیدزادے تھے، وہ بلخ میں رہتے تھے، ان کا انتقال ہوگیا اور میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ان کی بیوی بھی سیدانی تھی، اور ان کی چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی تھیں۔ اس شہر میں مالی غربت کی وجہ سے کوئی رسوائی نہ ہو، اس خیال سے وہ اس شہر کو چھوڑ کر سمرقند چلی گئیں کہ شاید وہاں اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکالے۔ جب وہاں پہنچی تو نیا شہر تھا، سردی کا موسم تھا اور اس کے ساتھ بچیاں بھی تھیں، بڑی مفلوک الحال تھی، سردی سے بچاؤ کے لیے لباس بھی پورا نہیں تھا، کھانے پینے کی بھی محتاج اور بھوکی تھی۔ وہ عورت اپنی بچیوں کو ایک مسجد میں بٹھا کر تنہا نکلی۔ دیکھا کہ ایک آدمی رئیسانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور آس پاس لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کسی نے بتایا کہ یہ اس شہر کا حاکم ہے۔ اس کے سامنے پیش ہو کر کہا کہ مَیں شریف زادی سیدانی ہوں، مسافر ہوں، میرے ساتھ بچیاں بھی ہیں جو بھوکی ہیں، سردی سے بچاؤ کے لیے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے، آپ میری مدد کیجئے۔ اس حاکم نے جواب میں یوں کہا کہ کیا کوئی گواہ ہے کہ تم سیدانی ہو؟ یا کوئی شہادت ہے؟ اس نے کہا کہ یہ نیا شہر ہے، اور مَیں پردیسی ہوں، یہاں مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں ہے، تو مَیں کوئی گواہ لاکر کیسے پیش کروں گی؟ اس حاکم نے کہا کہ اس کے بغیر کوئی مدد

نہیں مل سکتی۔ وہ وہاں سے نکلی، راستہ میں ایک مجوسی، اگنی پوجک، آتش پرست ملا، جس کو ہم پارسی کہتے ہیں، وہ اس شہر کا کوتوال تھا، پولیس کا ہیڈ (ڈی آئی جی) سمجھ لو۔ اس عورت نے اپنی بات اس کے سامنے رکھی کہ مَیں حاکم کے پاس گئی تھی، اس نے تو مجھے یہ جواب دیا، اور میرا ایسا ایسا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کوتوال کے ساتھ خیر منظور تھی، اس نے اسی وقت اپنے نوکر کے ذریعہ اپنی بیوی کے پاس یہ کہلوایا کہ ابھی اسی وقت فوراً یہاں آؤ اور ان سیدانی کے ساتھ ان کی بچیوں کے پاس جاؤ، اور وہاں سے ان بچیوں کو لے کر آؤ اور اپنے مکان میں الگ کمرہ میں ان کو عزت کے ساتھ رکھو، اور ان کا پورا اکرام کرو۔ چنانچہ اس کے حکم کے مطابق اس کی بیوی اس عورت کے ساتھ گئی، بچیوں کو لے کر آئی، ان کو کھلایا پلایا اور پھر ان کے لیے نئے کپڑے سلوائے، اور ان کے لیے رہنے کا بہترین انتظام کیا۔

اِدھر یہ ہوا کہ رات کو وہ حاکم جب سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر قائم ہے اور نبی کریم ﷺ کے لِواءُالحمد کے نیچے تمام مسلمان جمع ہو رہے ہیں، یہ حاکم بھی اس جھنڈے کے نیچے جانا چاہتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اس نے یہ کہا کہ یارسول اللہ! مَیں تو آپ کا امتی ہوں اور مسلمان ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تیرے مسلمان ہونے کی کیا شہادت ہے؟ کوئی گواہ ہے؟ شہادت لیکر آؤ، یا کسی کو بلاؤ جو یہ گواہی دے کہ تم مسلمان ہو۔ یہ کہتا ہے کہ مَیں میدانِ حشر میں مارا مارا پھر رہا ہوں کہ کوئی یہ گواہی دینے والا مل جائے، لیکن کوئی گواہ نہیں ملا، تو پریشان اور عاجز ہو کر واپس آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی گواہ نہیں مل رہا ہے جو میرے اسلام و ایمان کے متعلق گواہی دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو شہر کا حاکم تھا، اور سب شہر والے

تجھے پہچانتے تھے،اس کے باوجود تجھے ایمان کے متعلق گواہی دینے والا کوئی گواہ نہیں ملتا؛تو اس بے چاری پردیسی عورت کے پاس تو اس بات کی گواہی مانگ رہا تھا کہ وہ میری اولاد میں سے ہے؟ پردیس میں اس کے لیے کون گواہی دے گا؟اور اُسی خواب میں یہ بھی دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی شاندار محل کی طرف اشارہ کیا کہ یہ محل اُس کوتوال کا ہے جس نے اس عورت کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا ہے۔

بس! یہ جواب آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔اب وہ پریشان ہوگیا اور سر پیٹنے لگا اور اپنے رخسار پر طمانچے مارنے لگا۔پھر اس نے اپنے لوگوں کو کہا کہ جلدی سے جاؤ اور اس عورت کو ڈھونڈو،اور یہ خود بھی اس عورت کو تلاش کرنے کے لیے نکل پڑا کہ وہ عورت کہاں ہے،بے چینی میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا، کسی نے بتلایا کہ وہ تو فلاں کوتوال کے گھر پر ہے۔وہ حاکم اس کوتوال کے گھر پر گیا اور کہا کہ ان سیدانی کو اس کی بچیوں کے ساتھ میرے حوالہ کردو،مَیں تجھے ایک ہزار اشرفیاں دیتا ہوں اس کوتوال نے کہا کہ تو ایک ہزار کی بات کرتا ہے؟اگر ایک لاکھ بھی دے تو مَیں ان کو تیرے حوالہ نہیں کروں گا۔جو خواب تو نے دیکھا ہے؛وہی خواب مَیں نے بھی دیکھا ہے۔اور حضورِ اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تو نے میری اولاد کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا ہے اس لیے یہ محل تیرے واسطے ہے۔اور تجھے میرے اوپر اتنی ہی تو فضیلت حاصل تھی کہ تو مسلمان ہے،لیکن یہ شریف زادی سیدانی جب سے میرے گھر میں آئی ہے میرا پورا خاندان اس کے ہاتھ پر اسلام لا چکا ہے،اس لیے اب تجھے میرے اوپر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے،مَیں ان کو تیرے حوالہ نہیں کروں گا۔

اور درحقیقت یہ ایک طبعی اور فطری چیز ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ ہماری اولاد کے ساتھ اگر ہماری وجہ سے کوئی آدمی اکرام اور محبت وعزت کا معاملہ کرتا ہے، تو اس کی کتنی قدر ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تو اسی طرح نبی کریم ﷺ کی نگاہوں میں اس آدمی کی قدر کتنی ہوگی جو آپ ﷺ کی آل واولاد کے ساتھ اکرام ومحبت کا معاملہ کرتا ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کا تقاضہ ہے کہ آپ کی آل واولاد جتنی بھی ہے اور جہاں بھی ہے ان کے ساتھ محبت واکرام کا اور بھلائی کا معاملہ کیا جائے، اس میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سادات کے اکرام کے لیے نسبت ہی کافی ہے

اب ایک اشکال کی چیز ہے کہ بعض سادات کو دیکھا جاتا ہے کہ بدعملی میں مبتلا ہوتے ہیں، نماز کے پابند نہیں ہوتے، کسی اور برائی میں مبتلا ہوتے ہیں؛ تو کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ کو معلوم ہے اور یقین ہے کہ یہ سادات خاندان (بنو ہاشم) سے تعلق رکھتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کا خاندانی رشتہ ہے؛ تو آپ کے لیے تو ان کے ساتھ محبت واکرام اور عزت کا معاملہ کرنے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے، اب رہی یہ بات کہ اس کی بدعملی کا کیا؟ تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، اس کی اس بدعملی کی وجہ سے آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس کے ساتھ اکرام ومحبت کا سلوک نہ کریں۔

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ بھائی دیکھو! ہیرا اگر پاخانہ میں گر جائے تو پاخانہ میں گرنے کے بعد بھی وہ ہیرا ہونے سے نکل نہیں جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ وہ پاخانہ میں پڑا ہوا ہے، اور اس پر پاخانہ لگا ہوا ہے، لیکن جہاں اس ہیرے کو وہاں سے نکال کر دھوڈالو گے تو پھر اس ہیرے کی

قیمت میں کوئی کمی نہیں آئیگی۔

یا یوں سمجھئے کہ کسی بچہ کو پاخانہ ہو گیا اور اس میں وہ ایسا لت پت ہو گیا کہ اس نے ہاتھ میں لے کر اپنے منہ پر بھی پھیر لیا، جیسا کہ بعض بچوں کی عادت ہوتی ہے تو کیا اس کی وجہ سے اس بچہ سے نفرت کی جائے گی؟ بالکل نہیں۔ ہاں! اب وہ بچہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو پانی سے غسل دے کر پاک صاف کرنے کی ہم کوشش کریں، اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتے ہوئے اس کو اس حالت سے نکالنے کی محنت کریں، لیکن اس حالت کی وجہ سے اس سے نفرت نہیں کی جائے گی۔ جیسے بچہ ایسی حالت میں بھی ہوتا ہے تو ماں اس سے نفرت نہیں کرتی، اسی طریقہ سے ہمیں بھی اس سے نفرت نہیں کرنی ہے۔ ہاں! اس کی بدعملی سے اس کو نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔

اگر سید بدعمل ہو

بعض لوگ پھران کے ساتھ محبت کے اندر غلو کرتے ہیں اور اس محبت کی وجہ سے ان کی اس بدعملی کو بھی سراہتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے۔ ان کی بدعملی میں ان کی اطاعت نہیں کرنی ہے۔ اطاعت وفرمانبرداری تو ہمیں صرف اللہ اور اس کے پاک رسول ﷺ ہی کی کرنی ہے، اگر وہ ایسا کام کرنے کے لیے کہہ رہا ہے کہ جو اللہ ورسول کے حکم کے خلاف ہے تو ہمیں اس کی اس بات کو نہیں ماننا ہے، لیکن اس کا اکرام ومحبت، اور اس کے ساتھ احسان وبھلائی کا سلوک کرنا ہے جو ایک الگ چیز ہے۔

اب سادات خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بعض سادات عملی کوتاہیاں کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بھی کتابوں میں تفصیل موجود ہے۔ لکھا ہے کہ بھائی دیکھئے! جب نبی کریم ﷺ کے اوپر قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ

الْأَقْـرَبِيْنَ ﴾ اور بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی تھا ﴿وَأَخِصَّ مِـنْهُـمَ الْـمُـخْـلَـصِـيْـنَ﴾ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اور ان میں بھی خاص اپنے خاندان والوں کو ڈرائیے۔ اس وقت آپ ﷺ نے جہاں اور خاندانوں کو دعوت دی، وہیں بنو ہاشم کو خاص دعوت دی اور ان میں بھی اپنے خاص لوگوں کو الگ سے نام لے کر دعوت دی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "يَـافَـاطِـمَـةُ بِنْتَ رَسُـوْلِ اللّٰهِ! أَنْـقِـذِيْ نَـفْسَكِ مِنَ النَّارِ، فَإِنِّيْ لاأَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً" اے رسول اللہ کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیو میں اللہ کی پکڑ سے تم کو کچھ بھی بچا نہیں سکتا، تم کو خود ہی عمل کرنا پڑے گا "يَاصَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ!" اپنی پھوپھی حضرت صفیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ تو حضور ﷺ نے اپنے خاندان کے الگ الگ لوگوں کا نام لے کر خطاب فرمایا کہ بدعملی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معاملہ کیا جائے گا، اس کا مَیں ذمہ دار نہیں ہوں۔

نورٌ علیٰ نور

اور اگر نیک اعمال کے ساتھ سیادت کا شرف حاصل ہے تو پھر نورٌ علیٰ نور ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ دو آدمیوں نے کوئی ڈگری حاصل کی، ان میں سے ایک تو وہ ہے جس کے خاندان کا حکومت کے ساتھ پرانا تعلق ہے اور اس کا خاندان پہلے سے حکومت کا وفادار چلا آرہا ہے، اس خاندان کے کسی لڑکے کے پاس جو ڈگری ہے، وہی ڈگری کسی دوسرے لڑکے کے پاس بھی ہے، لیکن جب نوکری دینے کی بات آئے گی تو ترجیح اسی کو دی جائے گی جس کا خاندان حکومت کا وفادار

چلا آرہا ہے۔ اور اگر اس منصب وملازمت کے لیے جس ڈگری کی ضرورت ہے اس ڈگری کا سرٹیفکٹ ہی اس نے حاصل نہیں کیا ہے؛ تو پھر کون کیا کرسکتا ہے؟ اس لیے اگر دونوں چیزیں ہوں گی تو فضیلت، درجات کی بلندی اور کامیابی جلدی مل جائیگی۔

تبرکات کب کام آسکتے ہیں؟

اس موقع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے بات کو سمجھایا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عبداللہ بن اُبی جو منافقوں کا سردار تھا، اس کا غزوۂ تبوک سے واپسی میں انتقال ہوا۔ اس کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مخلص مؤمن تھے، جب اُس کا انتقال ہوا تو انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ! میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے، آپ اپنا کرتہ عنایت فرمایئے، تاکہ اس کرتہ میں مَیں اس کو کفن دوں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے کفن کے لیے اپنا مبارک کرتہ عنایت فرمایا، اور حضور ﷺ نے اس کی جنازہ کی نماز پڑھی بلکہ اس کے منھ میں اپنا لعابِ دہن بھی رکھا اور اس کو قبر میں اتارا۔ (بخاری شریف، ۱۳۵۰) یہ سب کچھ ہوا، اس کے باوجود اس کی نجات نہیں ہوئی۔

ویسے آپ نے اپنا کرتہ کیوں عنایت فرمایا اس بارے میں کتابوں میں دو باتیں لکھی ہوئی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بیٹے جو درخواست لے کر آئے تھے، وہ مخلص مؤمن تھے، ان کی دل جوئی کے لیے آپ نے کرتہ عنایت فرمایا۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب قریش کے سردار قید پکڑے گئے تھے، اس میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے؛ وہ بھی قید پکڑے گئے تھے، جب ان کو قید پکڑ کر لایا گیا تو ان کے جسم پر کرتہ نہیں تھا، حضور ﷺ نے صحابہ سے

فرمایا کہ ان کو کرتہ پہناؤ۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بڑے قد آور آدمی تھے، جب ان کے لیے کرتہ ڈھونڈا گیا تو سوائے عبداللہ بن ابی کے کرتہ کے کوئی اور کرتہ ان کے ناپ کا ملا نہیں اس کا کرتہ ان کو فٹ آتا تھا، اس لیے اس نے ان کو کرتہ دیا تھا۔ روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ اس کے اس احسان کا بدلہ بھی اس کے دنیا سے جاتے جاتے چکا دیا جائے، اس لیے آپ نے اپنا کرتہ دیا تھا۔ (مسند الصحابۃ فی الکتب الستۃ۔ ۲۳/۱۳۳)

خیر! اس کے بعد اس کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ میرے ابا کی جنازہ کی نماز پڑھائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے، اور آپ نماز شروع کرنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر حضور کا کرتہ پکڑ لیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ہیں؟ اس نے تو یہ یہ حرکتیں کی ہیں، اس لیے کہ اس نے تو زندگی بھر اسلام و مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچایا تھا، فلاں موقع پر اس نے یوں کیا، فلاں موقع پر یوں کیا، فلاں موقع پر یوں کیا اور آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں؟ اور قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ﴾ اے نبی! اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا ہے تو پھر آپ کیوں اس کے لیے دعا کرتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! میرا کرتہ چھوڑو، اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ مرتبہ دعاءِ مغفرت کرنے سے اس کی معافی ہو جائے گی تو میں اس کے لیے ستر سے زیادہ مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت کروں گا۔ پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، اور اس کو قبر میں بھی رکھا اور اپنا لعابِ دہن اس کے منہ میں رکھا۔ اور ابھی قبر بند کر کے وہاں سے ہٹے

نہیں تھے کہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَلا تُصَلِّ عَلیٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ أَبَداً وَّلاتَقُمْ عَلیٰ قَبْرِهِ﴾ اے نبی! آئندہ اگران منافقوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو کسی کی نماز جنازہ مت پڑھیو۔ (بخاری شریف،۱۳٦٦) ایسی پابندی لگ گئی۔ لیکن آپ ﷺ نے اس سے پہلے پڑھی تھی۔

تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں، لیکن یہاں تو نبی کریم ﷺ آنے والی اُمت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ جو آدمی دنیا سے اس حال میں جا رہا ہے کہ اس کے کفن میں اللہ کے آخری پیغمبر اور سارے پیغمبروں کے سردار کا کرتہ ہے، اس کے منھ میں حضور ﷺ کا لعابِ دہن ہے، اور اس کے جنازہ کی نماز اللہ کے پاک رسول نے پڑھی ہے؛ لیکن اس کے پاس ایمان نہیں ہے تو یہ سارے تبرکات اس کے لیے بے کار ہیں۔ تبرکات اسی وقت کام آسکتے ہیں جب کہ ساتھ میں اعمال بھی ہوں، صرف تبرکات سے کام نہیں چلتا ہے، تبرکات معین ضرور ہیں لیکن ایمان جو شرطِ اول ہے، اگر وہی نہ ہو تو پھر تبرکات کچھ کام نہیں دیں گے۔ گویا حضور ﷺ نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ آنے والی امت کو یہ سبق مل جائے کہ صرف تبرکات سے کچھ نہیں ہوگا جب تک کہ ساتھ میں ایمان وعملِ صالح نہ ہو، اس لیے اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا فرمائے، اور اس محبت کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی اور اس محبت کی نسبت سے جو اعمال انجام دینے چاہئیں ان اعمال کو انجام دینے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

تَوۡقِيۡرُ الۡعُلَمَآءِ وَالۡكِبَارِ وَأَهۡلِ الۡفَضۡلِ

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

۲۰ر صفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۵ر جون ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ۔ (الزمر۔۹)

باب کا عنوان

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا "تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ" علماء، عمر رسیدہ اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا، اور دوسروں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح دینا اور ان کی مجلس و بیٹھک کو اونچا کرنا اور ان کے مقام ومرتبہ کو ظاہر کرنا۔ یعنی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کے مقام ومرتبہ کی بلندی ظاہر ہو۔ اس باب میں انہوں نے تین چیزیں شامل کی ہیں۔ پہلی چیز ہے علماء کی تعظیم وتکریم کرنا، دوسری چیز ہے جو بڑی عمر والے لوگ ہیں ان کی تعظیم وتکریم کرنا، اور تیسری چیز ہے، جن میں کوئی فضل وکمال ہو ان کی تعظیم وتکریم کرنا۔ پہلی چیز کے تحت علمی کمال کا تذکرہ آ گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ اور بھی ایسے اوصاف ہیں جن کو حاصل کرنے کی شریعت میں تاکید کی گئی ہے۔ جیسے کسی آدمی میں سخاوت ہے، شجاعت و بہادری ہے، اعمالِ صالحہ کا اہتمام ہے، لوگوں کی خدمت اور لوگوں کو راحت پہنچانے کا مزاج وجذبہ ہے، اس طرح کے اوصاف وخوبیاں جس میں ہوں ان خوبیوں وکمال کی وجہ سے اس

کے ساتھ احترام و تعظیم کا معاملہ کرنا چاہیے۔

معاشرہ میں خوبیاں اس طرح پھیلتی ہیں

گویا شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی کے اندر جو خوبی موجود ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ اس کے ساتھ اکرام و تعظیم و توقیر کا معاملہ کیجئے، اور جن میں یہ خوبی نہیں ہے ان کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دو، ان کی اس خوبی کی وجہ سے ان کے ساتھ خصوصی اور امتیازی سلوک کرو، اس لیے کہ اگر آپ ان کے ساتھ ان کی خوبیوں کی وجہ سے اکرام و تعظیم کا معاملہ کریں گے تو یہی چیز دوسروں کے لیے بھی ترغیب کا سبب بنے گی، جیسے اگر آپ اہلِ علم کی تعظیم ان کے علم کی وجہ سے کریں گے تو یہی چیز دوسروں کے لیے بھی علم حاصل کرنے کی ترغیب کا ذریعہ بنے گی۔ جو لوگ سخاوت اور شجاعت والے ہیں اچھے اوصاف و خوبیوں کے مالک ہیں ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ اکرام و احترام کا معاملہ کیا جائے گا تو دوسرے لوگوں کو ترغیب ہوگی کہ یہ خوبیاں ایسی ہیں جن کو حاصل کیا جانا چاہیے، ورنہ اگر یہ سلسلہ امت کے اندر نہیں رہے گا تو پھر لوگ ان کمالات کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے، اور خوبیوں کو خوبیاں نہیں سمجھیں گے اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

معیار بدل گیا

آج کل پیمانے، معیار اور قدریں بدل گئیں ہیں، وہ بچے جن کا زمانہ کمال اور خوبیوں کے حاصل کرنے کا ہوتا ہے، اس وقت اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں کے ساتھ لوگ ایسا اچھا معاملہ کرتے ہیں کہ ان کے پیچھے لٹّو بنے ہوئے پھرتے ہیں اور ان کا نام بہت عزت کے ساتھ لیتے ہیں؛ تو آپ ہی اندازہ لگائیے کہ

اس بچے کا ذہن کیا بنے گا؟ مَیں اور آپ اس کو چاہے کتنا ہی برا سمجھتے ہوں لیکن ایک بچہ اپنے اس بچپن کے زمانہ میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ان کے ساتھ عزت کا معاملہ کر رہے ہیں، لوگ ان کا نام عزت سے لیتے ہیں، ان کو سر پر بٹھاتے ہیں، ان کے پیچھے پیچھے لٹّو بنے ہوئے پھرتے ہیں، ان کے نام سے اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمال والی کوئی شخصیت ہے، اس لیے ہمیں بھی یہ کمال حاصل کرنا چاہیے۔

ایک کرکٹر اچھا بیٹسمین (Batsman) ہے، اس کا نام چھوٹے بڑے، عورتیں مرد، بوڑھے نوجوان، پڑھے لکھے اوران پڑھ؛ سب کے منھ پر ہے، اور جب سب ہی اس کے ساتھ عزت والا معاملہ کریں گے، اپنی مجلسوں میں اسی کے نام کا تذکرہ بہت خوبیوں کے ساتھ کریں گے، تو آپ ہی بتلائیے کہ وہ بچہ جو اس مجلس میں بیٹھا ہوا یہ سب دیکھے گا اور سنے گا تو وہ کیا سمجھے گا؟ وہ تو یہی سمجھے گا کہ یہ ایسی چیز ہے جو حاصل کرنی چاہیے تاکہ مَیں بھی بڑا ہونے کے بعد جب ایسا بنوں گا تو میرے ساتھ بھی سب لوگ اسی طرح کا معاملہ کریں گے، لوگوں کی مجلسوں میں میرے بھی چرچے ہوں گے، میرے نام سے لوگ اپنے بچوں کا نام رکھیں گے۔

اکرام کس کا کیا جائے؟

اس لیے شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ اکرام کس کا کیا جائے؟ عزت و احترام کا معاملہ کس کے ساتھ کیا جانا چاہیے؟ اپنی مجلسوں میں کن لوگوں کا تذکرہ ہونا چاہیے؟ کس کا نام لینے میں اور کس کے ساتھ سلوک کرنے میں آگے بڑھنا چاہیے؟ جن اوصاف کو حاصل کرنے کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور سراہا ہے، قرآن وحدیث

میں ان کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، اور اسلام نے جن خوبیوں کی تعلیم دی ہے وہ خوبیاں جس آدمی میں جس درجہ میں پائی جاتی ہوں، اس آدمی کے ساتھ اسی درجہ میں اکرام ومحبت کا اور تعظیم وحسنِ سلوک کا معاملہ کرنا چاہیے، جیسے ایک آدمی میں علم بھی ہے، اخلاق بھی ہیں، عمل بھی ہے، سخاوت وشجاعت بھی ہے، اور بھی بہت ساری خوبیاں ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اسی درجہ عزت واحترام اور اکرام کا اور مجلسوں میں اس کو بڑا بنانے کا معاملہ کیا جائے گا۔

ایک آدمی ایسا ہے جو لوگوں کی خدمت کرتا ہے اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دیتا ہے اور بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، بیماروں کی خدمت کرتا ہے، مظلوموں کی مدد کرتا ہے، لوگوں کو مصیبت کے وقت کام آتا ہے، تو یہ سب وہ خوبیاں ہیں جن کی اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ یہ کام کرنے چاہئیں۔ تو اب انہیں اوصاف کی بنیاد پر پورے معاشرہ کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ اس آدمی کا اکرام کرے، اور اس کے ساتھ احترام کا امتیازی سلوک کرے، جب یہ ہوتا ہوا دیکھا جائے گا تو یہی چیز معاشرہ میں بچوں کی تربیت کا ذریعہ بنے گی۔

بچوں کا مزاج کیسے بنتا ہے؟

آج کل ہمارے بچوں کا مزاج کیوں نہیں بنتا؟ ہم ان بچوں کے سامنے کتنی تقریریں کریں کہ نماز کی پابندی کرو، اچھے اخلاق سیکھو، اپنے اندر تواضع پیدا کرو، لیکن جب وہ بچے دیکھتے ہیں کہ جو نمازوں کا اہتمام کرنے والا ہے، جو علم سیکھے ہوئے ہے اور جس میں تواضع اور اخلاق ہیں، اس کے ساتھ تو بڑائی کا کوئی معاملہ کیا ہی نہیں جاتا، تو اب اس بچے کے سامنے ہم روزانہ ایک گھنٹہ تقریر کریں، تب بھی اس کے دل میں ان

خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں بیٹھے گی، وہ بچہ تو معاشرہ وسماج کو دیکھتا ہے کہ جو اوصاف وخوبیاں مجھے بتلائی جارہی ہیں، اور جن کو سیکھنے کے لیے مجھے آمادہ کیا جارہا ہے، اور جس کے لیے مجھ پر اتنی محنت کی جارہی ہے؛ ان خوبیوں اور اوصاف کا ہمارے معاشرہ میں ویلیو اور قیمت ہی کیا ہے؟ ان خوبیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟

آج کل ہمارے بچے جو دوسری لائنوں پر پڑرہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ ہم چاہے مجلسوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر اور دیندار لوگ اپنے گھروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بچے اِدھر کیوں نہیں آتے؟ اس لیے نہیں آتے کہ وہ معاشرہ اور سماج میں دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔

ایک عمدہ مثال

آپ تاجر لوگ ہیں، آپ تجارت کے لیے اسی چیز کا انتخاب کریں گے جس کی ڈیمانڈ ہو، اور جس چیز کی ڈیمانڈ زیادہ ہوگی اسی کو آپ اپنا سبجیکٹ (Subject) بنائیں گے کہ آج کل اس کا چلن ہے۔ جیسے آپ ڈائنگ مل والے ہیں تو جس ڈیزائن کا زیادہ چلن ہوگا اسی کو بنانے کی آپ زیادہ کوشش کریں گے۔ معاشرہ کا بھی یہی حال ہے، ہم لوگ آج اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے باوجود جو ناکام ہورہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اپنے معاشرہ میں ان اوصاف کو وہ مقام نہیں دیا جس کی شریعت نے ہمیں تعلیم دی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جن لوگوں میں یہ خوبیاں ہوا کرتی تھیں، ان کو لوگوں کے درمیان ایک مقام حاصل ہوا کرتا تھا، لوگوں کے دلوں میں ان کے واسطے عزت واحترام کے جذبات ہوا کرتے تھے، جب وہ لوگوں کی مجلسوں میں پہنچ جاتے تھے تو لوگ ان کو اونچا بٹھاتے تھے، ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، ان کے ساتھ ادب

واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔ آج اس قسم کے لوگ ہمارے سماج اور کمیونٹی میں موجود ہوتے ہیں اور ہم ان کو جانتے ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا، تو پھر دوسرے لوگ ان اوصاف کو کیوں حاصل کریں گے؟ اور جو نئی نسل آرہی ہے وہ ان خوبیوں کی اہمیت کو کیا سمجھے گی؟ نئی نسل تو یہی سمجھے گی کہ ہاں! ایک کرکٹر کا اتنا مان پان ہے تو میں بھی کرکٹر ہی بنوں گا۔ آپ کسی بھی بچے کو پوچھ لیجئے کہ تو کیا بننا چاہتا ہے؟ تو وہ اپنی آنکھوں سے جو ہوتا ہوا دیکھتا ہوگا، اسی کے متعلق کہے گا کہ میں یہ بننا چاہتا ہوں۔ اصل بات یہی ہے۔

اچھائیوں میں تنزلی کی وجہ

تو اسلام نے جو یہ تعلیم دی ہے کہ علماء اور عمر رسیدہ جنہوں نے اپنی عمریں اسلام کے اندر پوری کیں جیسا کہ آگے آرہا ہے، یا جس میں کوئی ایسا کمال اور خوبی ہے جس کو سیکھنے اور حاصل کرنے کی اسلام نے تعلیم دی ہے، اس خوبی کی وجہ سے آپ اس کا اکرام کیجئے، جب اسلام اس خوبی کو حاصل کرنے کی تلقین وتعلیم دے رہا ہے تو ساتھ میں یہ بھی تاکید کررہا ہے کہ جس میں یہ خوبی پائی جارہی ہے اس کے ساتھ آپ ادب اور تعظیم وتکریم کا معاملہ کیجئے، اس لیے کہ اگر یہ دونوں باتیں ہوں گی تب ہی اس خوبی کو بڑھاوا ملے گا، ورنہ یہ خوبی پنپنے والی نہیں ہے، کوئی بھی اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا آج کل اچھائیوں میں جو کمی آرہی ہے وہ ہمارے طرزِ عمل کی وجہ سے ہی آرہی ہے۔ جب ایک بچہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی کے پاس اچھی موٹر کار ہے یا دولت اور بینک بیلنس ہے تو چاہے اس نے وہ دولت حرام طریقہ سے کمائی ہو، تب بھی معاشرہ میں اس کا ایک مقام ہے، اس چیز کو دیکھ کر بچے کا ذہن یہی بنے گا کہ جس طرح بھی ہو؛ یہ دولت حاصل کرو،

اب اگر دو چار کو گرا کر بھی دولت ملتی ہوگی تو وہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، پھر حلال وحرام کی تمیز بھی وہ نہیں دیکھے گا۔ حالانکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ کوئی کیسا ہی دولت مند ہو، اگر اس نے غلط طریقہ سے وہ دولت کمائی ہوتی تو معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا تھا، اس کے یہاں کھانا کھانے کے لیے بھی لوگ تیار نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو بوڑھے لوگ جانتے ہیں، لیکن آج کل وہ معاملہ نہیں رہا، ہمارے یہاں معیار بدلتے جارہے ہیں۔ اسی لیے علامہ نوویؒ الگ سے مستقل ایک باب قائم کر کے ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کررہے ہیں کہ قرآنِ پاک اور حدیث شریف میں ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے وہ بھی ہمیں بتلایا گیا ہے، اور ہمیں قرآن وحدیث کی اسی تعلیم کے مطابق ایسے لوگوں کے ساتھ برتنا چاہیے، اور ان کے ساتھ اعزاز وتکریم کا معاملہ کرنا چاہیے، جب تک معاشرہ میں یہ بات نہیں پائی جائے گی وہاں تک کوئی بھی آدمی ان خوبیوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جب یہ سب صورتیں ہوں گی تو ان شاء اللہ ایسی خوبیاں معاشرہ کے اندر پیدا ہوں گی اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔

کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّـذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (الزمر۔٩) اے نبی! آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جو علم والے ہیں وہ اور جو علم والے نہیں ہیں؛ کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ دونوں کا مرتبہ و مقام برابر نہیں ہوسکتا، جو مرتبہ ومقام اللہ تعالیٰ کے یہاں اہلِ علم کو حاصل ہے، جو لوگ اس کمال سے خالی ہیں ان کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ کسی خاص چیز کے

حاصل کرنے پر جو انعام ملا کرتا ہے وہ چیز اگر ہوگی تب ہی انعام ملے گا، اور اگر وہ چیز نہیں ہوئی تو نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی علم کے حاصل کرنے پر جو فضیلتیں قرآنِ پاک اور احادیث میں بتلائی گئی ہیں، اگر آپ علم حاصل کریں گے تو وہ فضیلتیں حاصل ہوں گی، ورنہ نہیں ﴿إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ جو عقلمند اور سوجھ بوجھ والے ہیں وہی نصیحت حاصل کیا کرتے ہیں۔

منصبِ امامت کی تفصیل

۳۴۸: عن أبي مسعود عُقبة بن عمرو البدريّ الأنصاريّ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَآءً، فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَآءً، فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَآءً فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا، وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ سُلْطَانِهٖ، وَلَا يَقْعُدُ فِيْ بَيْتِهٖ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهٖ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو البدری الانصاریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی امامت وہ آدمی کرائے جو اللہ کی کتاب کو پڑھنا سب سے زیادہ اچھا جانتا ہو۔ اگر وہ قرآن کے علم کے اندر برابر اور یکساں ہیں تو ان میں جو آدمی سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ اگر وہ اس میں بھی برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر وہ ہجرت میں بھی یکساں ہوں تو پھر جو ان میں عمر میں بڑا ہو۔ اور اگر کوئی آدمی ایسی جگہ پہنچے جہاں کسی دوسرے کی امارت اور اختیارات چلتے ہوں تو وہ وہاں امامت نہ کرائے۔ اور اگر کسی کے گھر میں جائے تو صاحبِ خانہ کی جگہ پر نہ بیٹھے الا یہ کہ وہ اجازت دیدے۔

افادات: امامت دینی مناصب میں بہت اونچا منصب سمجھا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں اور آپ کے بعد خلفاءِ راشدین نے یہ سلسلہ

جاری رکھا، یعنی حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور کے علاوہ کوئی آدمی امامت نہیں کراتا تھا، آپ کے بعد خلفاءِ راشدین؛ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جو امت میں اسی ترتیب سے سب سے افضل ہیں، وہی حضرات اپنے زمانہ میں حکومت کا کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور یہی حضرات نمازوں میں امامت بھی کراتے تھے۔

لفظ امامت عربی میں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، نماز کے اندر جو آدمی امامت کراتا ہے اس کے لیے بھی، اور اسلامی حکومت کا جو بادشاہ ہوا کرتا ہے، اس کے لیے بھی لفظ امام استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے امامت کی دو قسمیں لکھی ہیں، امامتِ کبریٰ اور امامتِ صغریٰ۔ امامتِ کبریٰ یعنی پورے ملک کی سربراہی۔ اس لیے جو سربراہِ اعلیٰ ہوتا ہے وہ بھی امام کہلاتا ہے۔ اور جو نماز پڑھانے والا ہوتا ہے اس کو بھی امام کہتے ہیں۔

پھر بعد کے زمانوں میں ایسے لوگ حکومت کی کرسی پر آنے لگے کہ جو علم سے کورے ہوتے تھے، اور ان میں مسجد میں نماز کی امامت کی صلاحیت نہیں ہوتی تھی، تو مجبوراً یہ دونوں منصب ڈِوائڈ (Divide) اور تقسیم ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی تو امامت نہیں کرا سکتا تھا تو ایسے لوگوں کو آگے بڑھانا پڑا جو علم والے ہوتے تھے۔ اس لیے بغیر علم کے آدمی کرسی پر تو بیٹھ سکتا ہے لیکن مصلے پر تو بغیر علم کے آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ تقسیم ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے، ورنہ اسلام میں اصل تو یہی ہے کہ جو سربراہِ اعلیٰ ہو، وہ علم کے اعتبار سے بھی سب سے فائق ہو اور منصب کے اعتبار سے بھی بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔

امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون؟

خیر! تو حضور ﷺ فرماتے ہیں جو آدمی قوم میں سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہو، وہ امامت کرائے۔ اور اگر دو آدمی قرآن کے علم کے اندر برابر اور یکساں ہیں تو ان میں جو

آدمی سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو وہ امامت کا زیادہ حق دار ہے۔ ویسے ائمہ میں امام ابوحنیفہ امام شافعی اور امام مالکؒ اور امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے، یہ سب حضرات اس طرف گئے ہیں کہ جو آدمی مسائل کا زیادہ جاننے والا ہو، بشرطیکہ قرآنِ پاک بھی صحت کے ساتھ پڑھنا جانتا ہو، تو پھر وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔

چوں کہ فقہاء نے کتابوں میں لکھا ہے کہ نماز میں کئی ارکان ہیں۔ تو علم اور مسائل کی ضرورت تو پوری نماز میں پڑتی ہے۔ اور حسنِ قراءت یعنی قرآنِ پاک کے اچھا پڑھنے کی ضرورت صرف ایک رکن میں پڑتی ہے، اس لیے جس چیز کی ضرورت نماز کے تمام ارکان میں پڑتی ہو، وہ چیز جس کے پاس ہو، وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کے مقابلہ میں جس کے اندر ایک ہی چیز زیادہ پائی جاتی ہو یعنی حسنِ قراءت؛ اس کا نمبر بعد میں ہے۔ اس لیے فقہاء نے بھی ترتیب یہی لکھی ہے کہ جو آدمی مسائل کا زیادہ جاننے والا ہے اور ساتھ میں قراءت کی صحت بھی ہو تو وہ سب سے زیادہ حقدار ہے۔

اس کے بعد اگر دو امام ایسے ہیں کہ مسائل نماز جاننے میں دونوں کی سطح برابر ہے تو پھر ان دونوں میں جو اچھا پڑھنے والا اور ماہر ہو؛ اس کو ترجیح دی جائے گی۔

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جو سنت کے اعتبار سے زیادہ ہو، یعنی فقہاء نے جو ترتیب بتلائی ہے اس میں قراءت کے بعد یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہجرت بھی ایک چیز تھی تو ہجرت کے اندر جو پرانا ہو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لیے کہ جو لوگ مکہ مکرمہ میں اسلام لاتے تھے ان کے لیے یہ فرض تھا کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائیں، جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں وہاں تک ان کا ایمان مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا، بعد میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو پھر یہ حکم باقی نہیں رہا۔ تو ان میں بھی

جو پہلے ہجرت کر کے مدینہ آیا ہو وہ اس وصف میں پرانا ہوا۔ اور اگر ہجرت کے اعتبار سے بھی دونوں برابر ہیں تو پھر جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہو۔ کیوں کہ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اسلام کے اندر گذارا ہے، اس لیے اس کو ترجیح دی جائے گی۔

مہمان ازخود امامت نہ کرائے

اور اگر کوئی آدمی ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں کسی دوسرے کی امارت اور اختیارات چلتے ہوں تو وہ وہاں اس کی امامت نہ کرائے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کسی کے یہاں مہمان ہو کر گئے، اور اس کے گھر میں نماز پڑھنے کی نوبت آئی، تو صاحبِ خانہ اگر امامت کرانے کی اہلیت رکھتا ہے تو مہمان کو چاہیے کہ امامت نہ کرائے، بلکہ صاحبِ خانہ ہی امامت کرائے، اس لیے کہ وہ اپنے دائرۂ حکومت میں ہے، جہاں وہ رہتا ہے وہ وہاں کا سربراہ ہے، اور وہاں کے رہنے والے سب اس کے ماتحت ہیں، اب اس کی موجودگی میں اگر دوسرا آدمی امامت کرائے گا تو اس کے منصب پر زد پڑے گی۔

دیکھو! اسلام نے لوگوں کے جذبات کی کتنی رعایت کی ہے کہ دوسرے کی جگہ پر جا کر آپ اپنا حکم مت چلاؤ، وہاں تو اسی کا حکم چلے گا، اس لیے وہاں تو وہی امامت کرائے گا۔ ہاں! اگر وہ مہمان کے اکرام کے طور پر درخواست کرے، اور کہے کہ آپ نماز پڑھائیے اور اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے مہمان نماز پڑھائے تو پھر بات دوسری ہے، لیکن اصل تو یہی ہے کہ مہمان کو ازخود آگے نہیں بڑھنا چاہیے، ورنہ یہ چیز اس آدمی کے دائرۂ اختیار پر زد ڈالنے، اور اس کو مجروح کرنے والی ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی۔

کسی کی خاص بیٹھک پر مت بیٹھو

اور اگر کسی کے گھر میں جائے تو صاحبِ خانہ کی جگہ پر نہ بیٹھے۔ کبھی ایسا ہوتا

ہے کہ صاحبِ خانہ اپنے گھر میں اپنی بیٹھک کے لیے کوئی مخصوص جگہ بناتا ہے جیسے آپ جانتے ہیں کہ دفتر اور آفس میں سیٹھ کے لیے کرسی متعین ہوتی ہے، اور بھی بہت ساری کرسیاں ہوتی ہیں لیکن سیٹھ کی اپنی ایک الگ کرسی ہوتی ہے، تو اگر آپ کسی کی آفس اور دفتر میں جائیں تو سیٹھ کی کرسی پر ہرگز نہ بیٹھیں، ہاں اگر وہ اجازت دے یا وہ خود بٹھائے تو بیٹھیے۔ ہمارے اکابر تو اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ اس کے بٹھانے کے باوجود بھی کوشش یہی کرتے تھے کہ وہاں نہ بیٹھیں، اس لیے کہ یہ اس کی مخصوص جگہ ہے، آپ اگر اس پر بیٹھیں گے تو اس کے دل پر اثر پڑے گا۔ اسی طرح مکان میں بھی اگر اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی مخصوص جگہ بنائی ہے تو اس پر نہ بیٹھیے دوسری جگہوں پر بیٹھیے۔

یہاں تو اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک اور سنت کا علم اور ہجرت کی وجہ سے امامت جیسے منصب کے لیے ترجیح دی۔ جیسا کہ اس باب کے عنوان میں ایک بات بتلائی تھی ”وتقديمهم علىٰ غيره“ جن میں جو جو کمالات ہیں، ان کی وجہ سے ان کو دوسروں کے مقابلہ میں فوقیت اور ٹوپ پوزیشن دی جائے گی اور آگے رکھا جائے گا، جس میں جتنے زیادہ کمالات ہیں اسی حساب سے اس کو آگے بڑھایا جائے گا، اور اسی مناسبت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

صفوں کی درستگی کا ایک بڑا دنیوی فائدہ

٣٤٩: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِى الصَّلَاةِ وَيَقُوْلُ: اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا، فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ۔ لِيَلِنِىْ مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ.

ترجمہ: حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے لیے ہمارے کندھوں

کو چھوتے، اور فرماتے تھے صفیں درست کرو آگے پیچھے مت کھڑے رہو، ورنہ تمہارے دلوں میں کجی آجائے گی۔ تم میں جو لوگ بالغ اور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں اور پھر اسی مناسبت سے اور لوگ رہیں۔

افادات: نماز سے پہلے نبی کریم ﷺ صفوں کو درست کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ شروع میں جب لوگ اس بات کے عادی نہیں بنے تھے تو نبی کریم ﷺ باقاعدہ پوری صف میں جا کر لوگوں کے کندھوں کو ملا ملا کر درست کرتے تھے، اور جب لوگ اس کے عادی بن گئے، اور آپ کے بار بار اس طرح کرنے کی وجہ سے لوگ جب سیکھ گئے اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگوں کے پاس جا جا کر کندھوں کو ملانے کی ضرورت نہیں ہے، تو آپ زبانی تاکید فرما دیا کرتے تھے "اِسْتَوُوْا" سیدھے کھڑے رہو، صفیں درست کرو۔ اس لیے امام کو بھی چاہیے کہ صفوں کی درستگی کا اہتمام کرے۔ ہاں! اگر لوگ خود اپنے طور پر درستگی کا اہتمام کرتے ہیں تو پھر امام کے لیے ضروری نہیں ہے، پھر بھی زبان سے کہہ دینا کہ صفیں درست کرو، یہ مستحب قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر مقتدی صفیں درست نہ رکھتے ہوں تو امام کے لیے صفیں درست کروانا ضروری ہے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر صفیں درست نہیں ہوں گی اور آگے پیچھے کھڑے رہو گے تو اس کا اثر دلوں پر پڑے گا اور تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا، گویا صفوں کی درستگی دلوں کو درست کرتی ہے، اگر لوگ اس کا اہتمام کریں صفیں سیدھی کر کے کھڑے رہیں تو اس کا قدرتی اثر یہ پڑے گا کہ دلوں کے اندر بھی محبت، اتفاق و اتحاد پیدا ہوگا اور اگر آگے پیچھے کھڑے رہیں گے تو اس کا اثر دلوں پر پڑے گا۔ اور دلوں میں اختلاف پیدا ہوگا۔

امام کے قریب کون کھڑا رہے؟

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں جو لوگ بالغ اور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب

رہیں اور پھر اسی مناسبت سے اور لوگ رہیں یعنی نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز کی پہلی صف میں وہ لوگ حضور سے قریب رہیں جو زیادہ سمجھ دار اور پڑھے لکھے ہوں، اس کا آپ ﷺ نے بڑا اہتمام کیا۔ اور ترتیب یہی ہونی چاہیے کہ جو زیادہ پڑھے ہوئے لوگ ہوں وہ امام کے قریب ہوں۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کبھی امام کو ضرورت پیش آجاتی ہے مثلاً امام کا وضو ٹوٹ گیا تو مسئلہ یہ ہے کہ امام اشارہ سے کسی کو اپنا نائب بنا کر وضو کے لیے چلا جائے اور وہ آدمی نماز کو جاری رکھے گا۔ اب اگر پیچھے ایسے لوگ ہیں جو مسائل سے واقف ہیں تو امام اپنی اس ذمہ داری کو پوری کر سکے گا۔ کبھی قراءت میں غلطی ہوتی ہے تو لقمہ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم لوگ تو صرف رمضان میں امام کے پیچھے سامع بنا کر حافظ کو کھڑا کرتے ہیں، باقی دنوں میں وہ کہیں بھی کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حدیثِ پاک کی تعلیم یہ ہے کہ جو جانکار لوگ ہیں ان کو پہلے موقع دیا جائے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔

بزرگوں کی مجلس کے آداب

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز کے لیے تشریف لائے تو ایک نوجوان آگے کھڑا تھا، انہوں نے اس کو وہاں سے ہٹا دیا اور خود کھڑے ہو گئے، نماز کے بعد اس سے کہا کہ برا نہ مانیو، نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ بزرگوں اور اہلِ علم کی مجالس میں بھی جو بڑے اور سمجھ دار اہلِ علم ہوں، جو ان کی باتوں کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں، ان کو آگے بیٹھنے کا موقع دیا جائے، اور اسی کے ساتھ ان کو بھی آگے بیٹھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اب یہ ہے کہ جب مجلس لگنے جا رہی ہے اس وقت تو وہ پیچھے رہیں اور جب مجلس لگ چکی اس

کے بعد آگے آنے لگیں تو یہ بھی برا ہے۔ اسی لیے آگے ایک روایت میں آنے والا ہے "وَاِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْأَسْوَاقِ" تم بازاروں کے شور وشغب سے بچو، اس کی ایک وجہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ جو آدمی اپنے آپ کو بازاروں میں گھومنے پھرنے کے اندر مشغول رکھے گا تو اس کو آگے رہنے کا موقع نہیں ملے گا۔

تو دیکھئے! یہاں علامہ نوویؒ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ جو بالغ، عقل منداور سمجھ دار لوگ ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں اور نبی کریم ﷺ نے ان کے مقام ومرتبہ کی وجہ سے خاص تاکید یہ فرمائی کہ نماز میں بھی وہ میرے قریب رہیں، دیگر مجالس کا بھی یہی حکم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان اوصاف کی وجہ سے جب ان کو مجالس میں آگے جگہ ملے گی، تو پھر چھوٹے بھی ان اوصاف کو حاصل کرنے کا اہتمام کریں گے۔

سمجھ دار مجھ سے قریب رہیں

۳۵۰: وعن عبدِاللّٰهِ بْنِ مسعودٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: لِيَلِنِيْ مِنْكُمْ أُوْلُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔ ثلاثاً۔ وَاِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْأَسْوَاقِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں جو بالغ، عقل منداور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں، پھر جن کی سوجھ بوجھ ان سے ذرا کم ہے، وہ ان کے قریب رہیں، اسی طرح ترتیب رہے گی۔ اور اپنے آپ کو بازاروں کے شور وشغب سے بچاؤ۔

افادات: گویا اس میں بھی ترتیب اور کیٹیگری ہے، جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ آگے رہیں، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم اور اسی اعتبار سے آگے سلسلہ رہے گا۔

زمین کا سب سے پسندیدہ ٹکڑا

اور اپنے آپ کو بازاروں کے شور و شغب سے بچاؤ یعنی آدمی کو بازاروں میں زیادہ وقت گذارنا نہیں چاہیے، ہاں! یہ ایک ضرورت کی چیز ہے۔ ایک کاروباری آدمی ہے جب تک کاروبار کا معاملہ ہے وہاں تک بازار میں رہے، جب کاروبار کا سلسلہ ختم ہو تو وہاں سے ہٹ جائے۔ یا جو کاروباری نہیں ہے، اور کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت پیش آئی تو جہاں تک یہ ضرورت ہے وہاں تک بازار جائے، لیکن خریدنے سے فارغ ہونے کے بعد پھر اپنا وقت بازار میں لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں ویسے بھی تاکید آئی ہے، نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ ایک آدمی نے آ کر سوال کیا "أَيُّ الْبِـقَاعِ أَحَبُّ" اے اللہ کے رسول! زمین کے خطوں میں سب سے زیادہ محبوب اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں، حضرت جبرئیل آویں تو مَیں پوچھ کر بتاؤں۔ چنانچہ حضرت جبرئیل آئے تو ان سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، مَیں باری تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں۔ چنانچہ وہ گئے اور آ کر کہا کہ آج تو مَیں اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب ہوا کہ کبھی اتنا قریب نہیں ہوا تھا اور مَیں نے یہی سوال کیا تو باری تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا "أَحَبُّ الْبِقَاعِ اِلیٰ اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا وَأَبْغَضُ الْبِقَاعِ اِلیٰ اللّٰهِ أَسْوَاقُهَا" زمین میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ حصے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں مسجدیں ہیں، اور زمین میں سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ حصے بازار ہیں۔ (کشف الخفاء ١٢٠)

اب ہمیں اپنے متعلق فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارا جی کہاں زیادہ لگتا ہے، مسجدوں میں یا بازار کے اندر؟؟

فارغ وقت گذارنے کی جگہ

بہرحال! بازار کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں جانا جائز ہی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ایک ضرورت کی چیز ہے، جس طرح بیت الخلاء ہوتے ہیں، کوئی آپ کو یہ نہیں کہے گا کہ بیت الخلاء جانا جائز نہیں ہے، ایک فطری تقاضہ کے لیے وہاں جانا ہی پڑتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ کوئی آدمی بیت الخلاء کو اپنی بیٹھک کے طور پر پسند کرتا ہو کہ چلو! فارغ وقت ہے تو وہاں جا کر بیٹھتے ہیں۔ تو جس طرح فارغ وقت کو وہاں گذارنا کوئی پسند نہیں کرتا، اسی طریقہ سے یہ سوچ بھی بدلنے کی ضرورت ہے کہ فارغ وقت ہے اس لیے چلو! بازار میں جا کر بیٹھتے ہیں، دوکان پر جا کر ٹائم پاس کرتے ہیں۔ یہ جگہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، یہ ایک ضرورت کی چیز ہے، کاروبار کی نسبت سے جانا ہے تو جائیے، کوئی چیز خریدنے کے لیے جانا ہو تو جائیے، لیکن اگر نہ کاروباری ضرورت ہے، نہ کوئی چیز خریدنے کی ضرورت ہے، نہ کوئی اور کام ہے؛ تو پھر وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کہیں جا کر بیٹھنا ہے تو مسجد سب سے زیادہ اچھی جگہ ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بازاروں کے شور وشغب سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اور خاص طور پر یہ تاکید اسی لیے فرمائی گئی کہ جو آدمی بازاروں کے اندر مشغول رہے گا اس کو کبھی پہلی صف میں آنے کی توفیق نہیں ہوگی، پہلی صف میں آنے کی عادت تو اسی وقت پڑے گی جب بازاروں سے دل کم لگا ہوا ہو۔ حضور ﷺ کی پہلی بات پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جب کہ بازاروں کے ساتھ تعلق ونسبت ضرورت کے درجہ میں کم سے کم رکھی جائے۔

غزوۂ خیبر کا پس منظر

۳۵۱۔وَعَنْ أَبِی یَحْیٰی وَقِیلَ أَبِی مُحَمَّدٍ سَهْلِ بْنِ أَبِی حَثْمَةَ الْأَنْصَارِی رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنْطَلَقَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ وَمُحَيِّصَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ اِلیٰ خَيْبَرَ وَهِیَ يَوْمَئِذٍ صُلْحٌ، فَتَفَرَّقَا،فَأَتیٰ مُحَيِّصَةُ اِلیٰ عبدِاللّٰهِ بْنِ سَهْلٍ وَهُوَ يَتَشَحَّطُ فِیْ دَمِهٖ قَتِيْلاً فَدَفَنَهُ،ثُمَّ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ، فَانْطَلَقَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ سَهْلٍ وَمُحَيِّصَةُ وَحُوَيِّصَةُ اِبْنَامَسْعُوْدٍ اِلیٰ النَّبِیِّ ﷺ، فَذَهَبَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ يَتَكَلَّمُ، فَقَالَ: كَبِّرْ كَبِّرْ،وَهُوَأَحْدَثُ الْقَوْمِ،فَسَكَتَ،فَتَكَلَّمَا فَقَالَ: أَتَحْلِفُوْنَ وَتَسْتَحِقُّوْنَ قَاتِلَكُمْ؟وَذَكَرَتَمَامَ الْحَدِيْثِ۔(متفق علیه)

ترجمہ: حضرت سہل بن ابوحثمہ ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعود (یہ دونوں صحابی ہیں ان دونوں کے باپ آپس میں چچازاد بھائی تھے، گویا یہ دونوں دو چچازاد بھائیوں کے بیٹے ہیں۔) ایک مرتبہ خیبر گئے۔ یہ صلح حدیبیہ کا زمانہ تھا۔ پھر دونوں الگ ہوئے۔ حضرت محیصہ جب عبداللہ کے پاس پہنچے تو وہ اپنے خون میں لت پت ہو رہے تھے (کسی نے خون کر دیا تھا) ان کو دفن کیا، اور مدینہ آئے۔ عبدالرحمٰن، حویصہ اور محیصہ حضور ﷺ کی خدمت میں گئے، عبدالرحمٰن بولنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا بڑے کو بولنے دو۔ یہ چھوٹے تھے اس لیے چپ ہوگئے۔ تب ان دونوں نے بات کی، تو حضور ﷺ نے دریافت کیا: کیا تم قسم کھاتے ہو اور قاتل سے حق کا مطالبہ کرتے ہو؟ اور پوری حدیث ذکر کی۔

افادات: خیبر؛ یہ مدینہ منورہ سے بارہ فرسخ کی دوری پر واقع ایک جگہ ہے جو یہودیوں کی آبادی تھی اور وہاں کھجوروں کے باغات بہت زیادہ تھے۔ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی اور وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ فتح نازل کی گئی جس میں خیبر کی فتح کی بشارت سنائی گئی اور پھر صلح حدیبیہ کے دو تین مہینہ بعد ہی ۷ھ میں ماہِ محرم میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضراتِ صحابہ کرام کی ایک فوج لے

کر وہاں گئے اور اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح کرایا اور سارا خیبر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا، بہت سے یہودی مارے گئے اور پھر انہوں نے خیبر حوالہ کر دیا۔ یہودیوں کی شرارتیں بھی بہت زیادہ تھیں اس لیے نبی کریم ﷺ نے فیصلہ یہ فرمایا کہ تمام یہودی خیبر چھوڑ کر چلے جائیں، لیکن ان لوگوں نے درخواست دی کہ یہ تو آپ نے فتح کر ہی لیا ہے اور یہاں کی زمینیں اور باغات آپ لوگوں کی ملکیت میں آ گئے ہیں، اب اگر آپ ہمیں یہاں سے نکال دیں گے تو یہاں کے باغات اور زمینوں کی کھیتی باڑی آپ لوگوں ہی کو سنبھالنا پڑے گی، اس لیے ہماری طرف سے درخواست یہ ہے کہ ہم لوگوں کو یہیں رہنے کا موقع دیا جائے، ہم یہ باغات اور زمینوں کو سنبھالیں گے، اس میں کھیتی باڑی کریں گے اور جو پیداوار ہوگی اس میں سے آدھا حصہ ہم کو دیجیو اور آدھا آپ لینا، اس طرح ان زمینوں کی دیکھ بھال اور ذمہ داریوں سے آپ لوگ سبکدوش اور آزاد رہیں گے اور آمدنی کا حصہ بھی ملتا رہے گا۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے یہ بات پیش کی گئی تو آپ نے بھی اس کو منظور فرمالیا، اس لیے کہ وقت کا تقاضہ بھی یہی تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ایک فیصلہ یہ بھی فرمادیا کہ جب تک ہم چاہیں گے وہاں تک تم کو رہنے دیں گے، پھر جب ہم یہ فیصلہ کریں کہ اس جگہ کو چھوڑ دو تو چلے جانا پڑے گا۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان لوگوں کو وہاں سے نکالا تو وہ لوگ شام کے علاقہ میں آ کر آباد ہوئے۔

خیر! جب یہ صلح ہوئی تو یہاں کی زمینیں اور باغات نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان میں مالکانہ حیثیت سے تقسیم فرمادیئے، اور جس کا جیسا جیسا حصہ تھا ہر ایک کے حصہ میں وہاں کی اتنی زمینیں آئیں، اور تمام مسلمانوں نے اپنی زمینیں کھیتی باڑی کرنے اور سنبھالنے کے واسطہ یہودیوں کے حوالہ کی تھیں۔ جب کھجوروں کی یا دوسری

کھیتی کی پیداوار ہوتی تھی تو آدھا حصہ ان کو دیتے تھے، اور آدھا مسلمان لیتے تھے، اسی کو بٹائی پر دینا کہتے ہیں اور اسی کو عربی زبان میں ''مُزَارَعَة'' کہتے ہیں اور خیبر کی نسبت سے اس کا نام ''مُخَابَرَة'' بنا ہے اس لیے اس کو ''مُخَابَرَة'' بھی کہتے ہیں۔

خیر! تو جن حضرات کے باغات اور زمینیں وہاں تھیں وہ حضرات کبھی کبھار ان باغات کو دیکھنے اور خبر گیری کے لیے جایا کرتے تھے۔ زمین والے اپنی زمین کسی کو حوالہ کرتے ہیں تو وہ سال کے درمیان کبھی کبھار وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ زمین کا کیا حال ہے، خاص کر کے جب پیداوار کا زمانہ قریب آیا ہو تو وہاں جا کر اندازہ لگاتے ہیں کہ اس سال پیداوار کیسی ہے۔ حضراتِ صحابہ بھی اسی غرض سے خیبر جایا کرتے تھے۔

ایک واقعہ

خیر! تو یہ دونوں چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعودؓ بھی ایک مرتبہ اپنے باغات کی خبر لینے کے واسطے خیبر گئے، جب وہاں پہنچے تو ان میں سے ایک کی زمین اِدھر تھی اور دوسرے کی زمین اُدھر تھی، دونوں کا راستہ جہاں سے الگ ہوتا تھا وہاں دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ تم اُدھر سے جاؤ، مَیں اِدھر سے جاتا ہوں، آگے جا کر ملتے ہیں، دونوں اپنی زمین کی طرف گئے، بعد میں حضرت محیصہ جب وعدے کے مطابق اس جگہ پر آئے تو حضرت عبداللہ کو وہاں نہیں پایا، وہ ان کے باغ پر پہنچے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور خون میں لت پت پڑے تھے اور بہت خون بہہ رہا تھا اور انتقال ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی اور آدمی بھی نہیں تھا اور کس نے قتل کیا ہے وہ حضرت محیصہ کو معلوم بھی نہیں تھا۔ حضرت عبداللہ تو اکیلے گئے تھے، اتنی بات تو ضرور تھی کہ وہاں آبادی یہودیوں ہی کی تھی، ان میں سے ہی کسی نے قتل کیا ہوگا،

لیکن قاتل کون تھا یہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے قتل کرتے ہوئے تو دیکھا نہیں تھا۔ بھائی کی لاش لے کر مدینہ منورہ پہنچے، اس کے بعد حضرت محیصہ اپنے بھائی حضرت حویصہ، اور مقتول حضرت عبداللہ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن سہل؛ یہ تینوں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر پہنچے اور بتلایا کہ ہم وہاں گئے تھے اور ایسا ایسا واقعہ ہوا۔

ایک فقہی مسئلہ

اب یہاں ایک لمبا چوڑا فقہی مسئلہ آتا ہے کہ اگر کسی آدمی کا قتل ہو جائے اور قاتل معلوم نہ ہو۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو لوگوں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں تو اس کا جرم اور قصور ثابت ہو جائے گا، لیکن اگر کسی کی قتل کی ہوئی نعش کسی محلّہ میں ملی لیکن اس کا قاتل معلوم نہیں ہے، تو مسئلہ یہ ہے کہ اس سارے محلّہ والوں کو بلایا جائے گا، اور مقتول کا ولی اس محلّہ والوں میں سے پچاس آدمیوں کا انتخاب کرے گا، اور ان میں سے ہر ایک کو یہ قسم کھلائی جائے گی کہ اللہ کی قسم! نہ تو میں نے اس کو قتل کیا اور نہ میں اس کے قتل کرنے والے کو جانتا ہوں۔ یہ اس لیے کیا جائے گا کہ اگر ان میں سے کوئی قاتل ہے تو وہ قسم کھانے سے انکار کرے گا، اور اگر وہ کسی کو جانتا ہوگا تو اس کو بتانا پڑے گا، یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس طرح قاتل کا پتہ لگ جائے، لیکن اگر اس کے باوجود بھی پتہ نہیں لگا، یعنی وہ پچاس آدمی سب کے سب یہ قسم کھا رہے ہیں کہ نہ تو میں نے اس کو قتل کیا اور نہ میں اس کے قتل کرنے والے کو جانتا ہوں، تو پھر اس پورے محلّہ والوں پر مقتول کی دیت یعنی خون کی جو قیمت مقرر کی گئی ہے وہ عائد کر دی جائے گی۔

کسی کے سامنے بات پیش کرنے کا ادب

خیر! تو یہ تینوں بھائی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان تینوں میں

سب سے بڑے حویصہ تھے، اس کے بعد محیصہ اور سب سے چھوٹے عبدالرحمٰن بن سہل تھے اور یہی مقتول کے سگے بھائی تھے اس لیے انہوں نے ہی واقعہ بتانا شروع کیا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "کَبِّرْ کَبِّرْ" بڑے کو بولنے دو، بڑے کو بولنے دو۔ یعنی جب تم تینوں مل کر میرے پاس بات پیش کرنے کے لیے آئے ہو تو اب تم میں سے جو بڑا ہوگا وہی بات پیش کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑے کے سامنے بات پیش کرنا بھی ایک فضیلت کی چیز ہے تو اس میں بھی ترجیح اسی کو دی جائے گی جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہوگا، چنانچہ حضرت حویصہ ہی نے نبی کریم ﷺ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا۔

اب مسئلہ کی اور تفصیلات ہیں، اس میں ہم نہیں جاتے۔ یہاں تو علامہ نوویؒ اس روایت کو صرف اسی بنیاد پر لائے ہیں کہ اس واقعہ میں حضورِ اکرم ﷺ نے بولنے والے اگرچہ مقتول کے سگے بھائی تھے لیکن چوں کہ وہ چھوٹے تھے اس لیے ان کو بولنے کی اجازت نہیں دی، اور فرمایا کہ جو بڑا ہے وہی بات پیش کرے۔ ہاں! اگر بڑا ہی چھوٹے کو یوں کہے کہ تو بات پیش کر، تو پھر بات دوسری ہے، لیکن بڑے کے کہے بغیر چھوٹے کو اپنی طرف سے بات شروع کرنی نہیں چاہیے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات پیش کرنے کی صلاحیت اور طریقہ بڑے کے مقابلہ میں چھوٹے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ چھوٹا بات پیش کرے، اس صورت میں بڑا چھوٹے سے کہے کہ تم بات کرو، تو وہ پیش کرے، لیکن بڑے کے کہے بغیر چھوٹے کو سلسلۂ کلام اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔

تدفین میں بھی اہلِ قرآن کو فضیلت حاصل ہے

۳۵۲: وعن جابرٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى

أُحُدٍ يَعْنِي فِي الْقَبْرِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: أَيُّهُمَا أَكْثَرُ أَخْذاً لِلْقُرْآنِ؟ فَإِذَا أُشِيْرَلَهُ اِلىٰ أَحَدِهِمَا، قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اُحد کے شہداء میں سے دودو آدمیوں کو قبر کے اندر جمع کرتے تھے، پھر پوچھتے تھے کہ ان دونوں میں سے کسے قرآن پاک زیادہ یاد ہے؟ جب دونوں میں کسی ایک کے بارے میں بتلایا جاتا تو اسی کو قبر میں آگے رکھتے۔

افادات: غزوۂ احد دوسری بڑی جنگ ہے جو اسلام میں پیش آئی، غزوۂ بدر میں تو مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی لیکن غزوۂ احد میں مسلمانوں کے ستر سے زیادہ آدمی شہید ہوئے، اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے، جب جنگ ختم ہوگئی اور شہیدوں کو دفن کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور قبریں کھودنا شروع کیں تو حضرات صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس وقت جب کہ ہم زخمی، تھکے ہوئے اور بیمار بھی ہیں، ہمارے لیے ہر ایک کے لیے الگ الگ قبر کھودنا مشکل ہے۔ اس لیے دودو، تین تین، چار چار آدمیوں کے برابر بڑی قبریں کھودی گئیں، اور ایک ایک قبر کے اندر دودو تین تین چار چار آدمیوں کو دفن کیا گیا، ایک کو دفن کرنے کے بعد بیچ میں کچھ گھاس وغیرہ آڑ کر دیتے تھے، پھر دوسرے کو اور پھر اسی طرح تیسرے کو دفن کرتے تھے اور قبر بند کردی جاتی تھی۔

ایک قبر میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو دفن کرنا بھی جائز ہے، اور اس موقع پر یہی کیا گیا تھا۔ جب قبر میں رکھنے کا وقت آتا تھا تو دونوں کو ایک ساتھ ایک پر ایک کو تو رکھ نہیں سکتے اس لیے قبلہ کی طرف ایک کو رکھا جاتا اور اس کے پیچھے پھر دوسرے کو رکھا جاتا۔ اور یہی صحیح طریقہ ہے۔ تو جب قبر میں رکھنے کا وقت آتا تھا تو نبی کریم ﷺ حضرات صحابہ سے پوچھتے کہ ان دونوں میں قرآن کریم کا زیادہ پڑھا ہوا کون ہے؟ کس کے پاس قرآن کا علم زیادہ ہے؟ جب کہا جاتا کہ یہ ہے، تو پہلے اس کو قبر میں رکھواتے تھے،

اور قبلہ کی طرف اس کو لٹاتے تھے، پھر دوسرے کا نمبر آتا تھا۔

یہاں تو علامہ نوویؒ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ دیکھو! ایک قبر میں دفن کرتے وقت بھی قبلہ والی جہت جو افضل جہت ہے اس کا حق دار اس کو آدمی کو قرار دیا گیا جو دوسرے کے مقابلہ میں قرآن زیادہ پڑھا ہوا ہو، اور دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ علم رکھتا ہو، حضور ﷺ نے بھی اس کا بات لحاظ کیا۔

تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ

علماء، عمر رسیدہ اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

۲۷/صفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۱۲/جون ۱۹۹۹ء

یہ باب چل رہا ہے جس میں علماء اور سن رسیدہ اور فضل وکمال والے لوگوں کی تعظیم وتوقیر کا بیان ہے، اور ان کو دوسرے ایسوں کے مقابلہ میں جن میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے آگے رکھنا، ان کے لیے اچھی اور اونچی بیٹھک تجویز کرنا، ان کے مرتبہ کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جس سے دیکھنے والوں کو ان کے مرتبہ کا خیال آئے۔ اسی سلسلہ کی روایتیں پیش فرمارہے ہیں ایک اور روایت پیش کی ہے۔

جو عمر میں بڑا ہو اس کا لحاظ کیجئے

۳۵۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللّٰہ عنہما أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: أَرَانِیُ فِی الْمَنَامِ أَتَسَوَّکُ بِسِوَاكٍ، فَجَآءَ نِیُ رَجُلانِ، أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ، فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْأَصْغَرَ، فَقِيلَ لِیُ كَبِّرْ، فَدَفَعْتُهُ اِلَی الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا. (رواہ مسلم مسنداً والبخاری تعلیقاً)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں نے اپنے آپ کو خواب میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی خواب کے دوران یہ بھی دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، ان میں ایک دوسرے سے عمر میں بڑا تھا، مَیں اپنی مسواک چھوٹے والے کو دینے لگا تو خواب ہی میں مجھ کو کہا گیا ''کَبِّـــرْ'' بڑے کو دیجئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ مسواک بڑے کو دی۔

افادات: اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ کو خواب میں بھی اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ جو عمر میں بڑا ہے اس کا لحاظ کیجئے۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ مثلاً دو آدمی ایسے ہیں جو اپنے کمالات وخوبیوں میں برابر ہیں، علم وفضل کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں لیکن ان میں سے ایک عمر کے اعتبار سے

دوسرے سے بڑا ہے، تو اس صورت میں بڑے کا لحاظ کیا جائے گا۔ اور اگر فضل وکمال دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں، اور کوئی امتیازی وصف اور خوبی بھی کسی میں نہیں پائی جاتی، تب بھی جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہے اس کا لحاظ کیا جائے گا۔

اس روایت میں کوئی تفصیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں آدمی جو خواب میں نظر آئے تھے علم وفضل اور کمال کے اعتبار سے یکساں ہوں اور پھر نبی کریم ﷺ نے ان میں جو عمر میں چھوٹا تھا اس کو مسواک دینا چاہا، تو آپ ﷺ کو خواب ہی میں تلقین کی گئی کہ آپ بڑے کو دیجئے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے

۳۵٤: عَنْ أَبِیْ مُوسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰہِ تَعَالیٰ اِکْرَامَ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ، وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَیْرَ الْغَالِیْ فِیْہِ، وَالْجَافِیْ عَنْہُ۔ وَاِکْرَامَ ذِی السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ. (حدیث حسن، رواہ ابوداود)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں سے یہ بھی ہے کہ جو مسلمان سفید بال والا ہو اس کا اکرام کیا جائے۔ اور جو حاملِ قرآن یعنی حافظ یا عالمِ قرآن ہے، اور وہ اس میں غلو کرنے والا نہیں ہے اور نہ وہ اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، تو اس کا بھی اکرام کیا جائے۔ اور ایسا بادشاہ جو انصاف کرنے والا ہے اس کا بھی اکرام کیا جائے۔

افادات: اس روایت میں تین طرح کے آدمیوں کا تذکرہ ہے، اس میں پہلا تو وہ ہے جس کی عمر اسلام کی حالت میں بوڑھاپے تک گذری اور اس کے بال مسلمان ہونے کی حالت میں سفید ہوئے تو وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کا اکرام وادب کیا جائے۔

دوسرا وہ جو قرآنِ پاک کا حامل ہے یعنی حافظ یا عالم ہے اور قرآن کے معاملہ

میں غلو اور حد سے آگے بڑھ کر کوئی کام نہیں لے رہا ہے۔

خاص دینی مزاج؛ اعتدال

بعض مرتبہ بعض لوگ اپنے کسی عمل کے اندر غالی ہوتے ہیں اور وہ جس چیز کو لے کر چل رہے ہیں اسی کو دوسری تمام چیزوں سے اہم سمجھتے ہیں، حالانکہ دین کی تعلیم میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جو باتیں شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہیں ان کے اندر بھی آدمی اعتدال اور میانہ روی سے کام لے، غلو نہ کرے اور حد سے آگے نہ بڑھے، قرآنِ پاک میں حکم دیا گیا ہے ﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ﴾ دین کے معاملہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے۔ غلو کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے اس کی اس مقررہ حد میں رہ کر آدمی نہ چلے۔

مَیں اس کی ایک مثال دے کر آپ کو یہ بات سمجھاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا جو ادب بجالانا چاہیے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اگر تنہائی میں ہو تب بھی اپنا ستر نہ کھولے۔ لوگوں کے سامنے اپنے ستر کو چھپانا تو ضروری اور واجب ہے، اگر کوئی آدمی لوگوں کے سامنے اپنا ستر کھولے گا تو وہ حرام کام کا ارتکاب کرنے والا قرار دیا جائے گا اور گنہ گار ہوگا، لیکن اگر کوئی آدمی کسی بند کمرہ میں تنہا ہے وہاں اس کو انسانوں میں سے کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے، اب وہاں تو کسی غیر کے سامنے ستر کھولنا لازم نہیں آتا، لیکن ایسے مواقع میں آدمی کو چاہیے کہ بلا ضرورت ستر نہ کھولے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی ضرورت ہوتی ہے جیسے کسی کو غسل کی ضرورت ہے، استنجاء اور پیشاب پاخانہ کی ضرورت ہے، یا اپنی بیوی سے اپنی حاجت پوری کرنے کی ضرورت ہے، ان مواقع پر تو ستر کھولنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اور جب تک آدمی ستر نہیں کھولے گا وہاں

تک وہ اپنی ان ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا، لیکن اس میں بھی شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ ضرورت کی مقدار ہی ستر کھولا جائے۔

چنانچہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب قضاءِ حاجت کے لیے جاتے تھے، تو جب بیٹھنے کے لیے زمین سے بالکل قریب ہوتے تھے تب ستر کھولتے تھے۔ (ابوداود،۱۴) اس لیے اگر کوئی آدمی باہر سے ستر کھول کر جاتا ہے، یا چند قدم دور ہے اور ستر کھول دیتا ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے، ستر کھولنا تو اس لیے ہے کہ پیشاب پاخانہ کا تقاضہ پورا کرنا ہے، اس لیے اس جگہ پر پہنچ کر بھی بیٹھنے کے لیے جتنا زمین سے قریب ہوتا جائے اسی وقت بقدرِ ضرورت ستر کھولے۔ یہی اس کا ادب ہے۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ تنہائی میں جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو، تو اگرچہ وہاں ستر چھپانا فرض تو نہیں رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادب یہ ہے کہ آدمی تنہائی میں بھی اپنے ستر کو چھپانے کا اہتمام کرے اس لیے کہ ہر مسلمان کا یہ تصور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہم اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں، ہمارا ہر حرکت وسکون اس کے علم میں ہے، تو اس کا ادب یہ ہے کہ تنہائی میں بھی ہم بلاضرورت اپنا ستر نہ کھولیں۔ شریعت کا یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ کے آداب میں سے ہے، اگرچہ تنہائی کی حالت میں یہ فرض اور واجب نہیں ہے۔ اور لوگوں کے سامنے تو یہ فرض اور واجب ہے۔

اب حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی یہ چیز تھی، ان میں سے بعض حضرات کے دل ودماغ پر یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے اتنا غالب آیا کہ جب وہ حضرات قضاءِ حاجت اور پیشاب پاخانہ کے لیے بیٹھتے تھے اس موقع پر بھی انہوں نے سوچا کہ اس وقت بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہیں، اور اپنا ستر کھول رہے

ہیں، تو حیاوشرم کی زیادتی کی وجہ سے ان میں سے بعض حضرات یہ کرتے تھے کہ قضاءِ حاجت کے لیے بیٹھتے وقت وہ اپنے سینے کو موڑ دیتے تھے اور دوہرا کر دیتے تھے، جیسے کوئی اوپر سے دیکھ رہا ہو تو ہم اپنے آپ کو کیسے جھکا دیتے ہیں اس طرح جھک جاتے تھے، اور اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے تھے۔ اس پر ان حضرات کی تنبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں یہ آیت نازل کی گئی ﴿أَلا اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ﴾ جب وہ پیشاب پاخانہ کے وقت قضاءِ حاجت کے لیے جاتے ہیں اور اس وقت ستر کھولنے کی نوبت آتی ہے تو وہ لوگ اپنے سینوں کو موڑ لیتے ہیں، اور ایسا اس لیے کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے چھپ سکیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَلا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ، یَعْلَمُ مَایُسِرُّوْنَ وَمَایُعْلِنُوْنَ﴾ جس وقت وہ کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور اس وقت جس چیز کو وہ چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ تو وہ سب بھی جانتا ہے (روح المعانی، ۲۱۰/۱۱) اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ سب جانتے ہی ہیں تو پھر ستر بھی کیا چھپانا۔

غلو سے بچانے کا اہتمام

دیکھو! شریعت نے حدود کی دونوں طرف سے رعایت کی ہے کہ ویسے تو یہ ایک طرح کی بے ادبی ہے، اس بے ادبی سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا کہ تنہائی میں ہو تب بھی آپ اللہ تعالیٰ کے ادب کو بجالاتے ہوئے ستر کو چھپانے کا اہتمام کریں، لیکن اسی شریعت نے ہمیں یہ اجازت دی کہ قضاءِ حاجت کے وقت بقدرِ ضرورت ستر کھول سکتے ہیں، اب اگر کوئی آدمی اس وقت ستر کھول کر بیٹھا ہے تو وہ ضرورت کی وجہ سے ہے، اگر اس وقت بھی وہ یہ تصور دل میں لائے جیسا کہ میں نے ابھی بعض صحابہ کے متعلق

بتلایا، اوراس طرح سینے کو موڑ کر وہ اپنے آپ کو بلاوجہ مشقت میں ڈالے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے ادب کی بجا آوری میں ایک طرح کا غلو ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں کیا، اس لیے ان کو تنبیہ کی کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر آپ یہ سوچتے ہیں ہم کپڑے نکالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو پھر جب کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہو، اس وقت بھی تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہی ہوتے ہو؛ اس وقت کیا کروگے؟

خلاصۂ کلام

بہرحال! یہ چیز ایک ایسی جماعت کی طرف سے پیش آرہی تھی جس کو اللہ تعالیٰ آنے والی پوری امت کے واسطے نمونہ بنانا چاہتے تھے، اور جو شریعتِ مطہرہ نبی کریم ﷺ لے کر دنیا میں تشریف لائے اس شریعت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہی حضرات واسطہ بننے والے تھے، اس لیے اگر ان حضرات کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی، تو ہوسکتا تھا کہ آنے والی امت کو مشقت لاحق ہوتی، وہ حضرات تو اپنے اس جذبہ کی وجہ سے اس چیز کی رعایت کر پاتے، لیکن آنے والی امت اس کا لحاظ نہ کر پاتی اور بلاوجہ مشقت میں پڑ جاتی، اس لیے ان کو تنبیہ کی گئی اور اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دین کا کوئی بھی کام ہو، اس کی انجام دہی میں آدمی کو ان حدود کی پوری رعایت کرنی چاہیے جو شریعت نے مقرر کی ہیں، اگر وہ حد سے آگے بڑھے گا تو اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔

اعتدال کی ایک اور مثال

میں ایک اور مثال دیتا ہوں کہ قیام اللیل یعنی رات کو تہجد کے لیے اللہ تعالیٰ

کے سامنے کھڑا رہنا، یہ ایک پسندیدہ چیز ہے، اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی نزدیکی کا ذریعہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اس کے بڑے فضائل ہیں، قرآنِ پاک میں بھی اس کی تاکید آئی ہے، اگرچہ اس کو فرض نہیں کیا گیا ہے، لیکن حدیثِ پاک میں آتا ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کا خصوصی قرب حاصل کرنا چاہے، اس کو چاہیے کہ اس نماز کا اہتمام کرے۔ اب ایک آدمی پوری رات جاگتا ہے، اور اپنے بدن کو راحت پہنچانے کا نام ہی نہیں لیتا؛ تو یہ غلط طریقہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، ان کے والد عمرو بن عاص نے ان کا نکاح کرایا۔ نکاح کی کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنی بہو سے پوچھا کہ صاحبزادے کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ماشاء اللہ بہت نیک ہیں، دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر تہجد میں مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح اس نے چند جملوں میں اپنی بات کہہ دی کہ میرے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کچھ مدت کے بعد پھر انہوں نے پوچھا تو پھر یہی جواب ملا، اب انہوں نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مَیں نے اپنے بیٹے عبداللہ کا نکاح ایک شریف گھرانے کی عورت سے کرا دیا، لیکن وہ تو عبادت میں ایسے مشغول ہیں کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ہی نہیں کرتے، رات بھر تہجد میں مشغول رہتے ہیں اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ٹھیک ہے، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکیہ پیش کیا تو آپ نے اس کو ایک طرف رکھا اور پھر ان سے سارے حال احوال پوچھے، اس کے بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ دیکھو! پوری رات عبادت میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ حصہ آرام بھی کرو "اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ

حَـقًّـا، وَاِنَّ لِـعَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَـقًّا'' تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری ملاقات کے لیے جو مہمان آتے ہیں ان کا بھی تم پر حق ہے، اور ان تمام کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے، عبادت کا یہ ذوق وشوق ٹھیک ہے، لیکن اس میں اتنا غلو کرنا کہ دوسروں کے حقوق پر زد پڑے، پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اس کی اور بھی بہت ساری مثالیں ملیں گی۔ تو مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ کسی بھی چیز میں غلو پسندیدہ نہیں ہے، دین کا اونچے سے اونچا کام ہو اور وہ فرض کا درجہ رکھتا ہو لیکن اس میں بھی اگر آدمی مقررہ حدود سے آگے بڑھے، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ کسی بھی چیز میں غلو پسندیدہ نہیں ہے، دین کے مختلف شعبے ہیں، کوئی آدمی دین کے کسی بھی شعبے سے منسلک ہو تو اس کو اس شعبے کے حدود میں رہ کر ہی کام کرنا چاہیے، اس میں حد سے آگے بڑھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

اس روایت میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''وَحَـامِـلِ الْـقُـرْآنِ غَيْـرَ الْـغَالِي فِيْـهِ'' وہ حافظِ قرآن اور عالم جو اس میں غلو کی حد تک نہ پہنچے؛ تو اس کا اکرام کیا جائے۔ اور غلو کرنے والے کے متعلق حضور ﷺ نے کوئی بات نہیں فرمائی۔

''وَالْجَافِيْ عَنْهُ'' اور جو اس کے حقوق کو چھوڑنے والا ہے اس کو بھی مستثنیٰ کر دیا۔ گویا حدود سے آگے بڑھنے والے کو بھی اندر سے نکال دیا اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے کو بھی چھوڑ دیا۔ جو درمیانی راہ چلنے والا ہے اس کے اکرام کا حکم دیا ہے۔

اور اس روایت میں تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ جو بادشاہ انصاف کرنے والا ہو اس کا بھی اکرام کیا جائے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت کے حقوق میں سے ہے۔

وہ ہم میں سے نہیں

۳۵۵: عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَاوَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيرِنَا۔ (حديث صحيح،رواه ابوداود والترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی ہمارے چھوٹوں پر شفقت و مہربانی کا معاملہ نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی بزرگی اور ان کے شرف و کمال کا لحاظ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

افادات: گویا اسلامی تعلیمات کا تقاضہ یہ ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت و مہربانی اور محبت کا معاملہ کیجئے، اور بڑوں کے ساتھ ادب، عظمت، اور احترام کا معاملہ کیا جائے۔ دونوں چیزوں کا خیال کیا جائے۔

لوگوں کے مقام و مرتبہ کے مناسب معاملہ کیا جائے

۳۵۶: عَنْ أَبِي مَيْمُونَ بنِ أبي شَبِيبٍ رحمه اللّٰه اَنَّ عَائِشَةَ رضی اللّٰه عنها مَرَّ بِهَا سَائِلٌ، فَأَعْطَتْهُ كِسْرَةً، وَمَرَّبِهَارَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابٌ وَهَيْئَةٌ، فَأَقْعَدَتْهُ، فَأَكَلَ، فَقِيْلَ لَهَا فِي ذٰلك؟ فَقَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ (رواه ابوداود)

وذكر مسلم فی أول صحيحه تعليقاً فقال: ذُكِرَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللّٰه عنها قَالَتْ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نُنْزِلَ النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔

ترجمہ: میمون بن ابی شبیب کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے ایک مانگنے والا گذرا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو دے دیا۔ اس کے بعد ایک دوسر آدمی وہاں سے گذرا، جس کی ظاہری ہیئت ذرا اچھی تھی، اور وہ بھی ضرورت مند تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو بٹھا کر کھلایا، اور پھر رخصت کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں

پوچھا گیا تو فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاملہ کیجئے۔

دوسری روایت میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو اس بات کا حکم دیا کہ ہم لوگوں کو ان کے مقام ومرتبہ پر رکھیں۔

افادات: پہلے والا ظاہری ہیئت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مانگنے والا ہے، اس لیے اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے، یہی اس کے حق کو ادا کرنا ہے۔ اور دوسرا آدمی بھی محتاج اور ضرورت مند تو تھا لیکن مانگنے والا معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لیے اس کو بٹھا کر کھلایا۔

بہرحال! لوگوں میں سے ہر ایک سے اس کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاملہ کیا جائے، یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے۔ جس کیٹیگری کا آدمی ہے ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ لیکن یہاں وہ کیٹیگری مراد ہے جو شریعت کی مقرر کی ہوئی ہے یعنی شریعت نے اس کو جو مقام اور درجہ عطا فرمایا ہے اس مقام ومرتبہ کے مناسب اس کے ساتھ معاملہ کیا جانا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن

٣٥٧: وعن ابن عباسٍ رضی اللّٰہ عنہما قال: قَدِمَ عُيَيْنَةُ بْنُ حِصْنٍ، فَنَزَلَ عَلىٰ ابْنِ أَخِيهِ الْحُرِّ بْنِ قَيْسٍ، وَكَانَ مِنَ النَّفَرِ الَّذِيْنَ يُدْنِيهِمْ عُمَرُ رضی اللہ عنہ، وَكَانَ الْقُرَّآءُ أَصْحَابَ مَجْلِسِ عُمَرَ وَمُشَاوَرَتِهِ، كُهُوْلًا كَانُوْا أَوْشُبَّانًا۔ فَقَالَ عُيَيْنَةُ لِابْنِ أَخِيهِ: يَاابْنَ أَخِيْ! لَكَ وَجْهٌ عِنْدَ هٰذَاالْأَمِيرِ، فَاسْتَئْذِنْ لِيْ عَلَيْهِ، فَاسْتَأْذَنَ لَهُ، فَأَذِنَ لَهُ عُمَرُ رضی اللہ عنہ۔ فَلَمَّا دَخَلَ قَالَ هِيْ يَاابْنَ الْخَطَّابِ! فَوَاللّٰهِ مَا تُعْطِيْنَاالْجَزْلَ وَلَا تَحْكُمُ فِيْنَا بِالْعَدْلِ۔ فَغَضِبَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ، حَتّٰى هَمَّ أَنْ يُوْقِعَ بِهِ،

فَقَالَ لَهُ الْحُرُّ: يَاأَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ لِنَبِيِّهِ ﷺ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ وَاِنَّ هٰذَا مِنَ الْجَاهِلِيْنَ وَاللّٰهِ مَا جَاوَزَهَا عُمَرُ حِيْنَ تَلَاهَا عَلَيْهِ، وَكَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالىٰ. (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس ٹھہرے، حر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس بٹھاتے تھے (اور اس کی وجہ یہ تھی وہ قرآنِ پاک کے پڑھنے والے اور اس کے معانی سے واقف تھے گویا وہ عالم تھے اس وجہ سے ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس بٹھاتے تھے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی (adviser body) مجلسِ شوریٰ میں سب علماء ہوتے تھے، چاہے وہ جوان ہوں یا ادھیڑ۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اے بھتیجے! امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا خاص مقام ہے، اس لیے ان کی خصوصی مجلس میں میرے لیے بھی حاضری کی اجازت لے لو چنانچہ انہوں نے ان کے لیے اجازت لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دی، چنانچہ وہ اس مجلس میں حاضر ہوئے۔ جب وہ مجلس میں پہنچے تو (کسی بات پر) کہنے لگے کہ اے ابن الخطاب! آپ ہم کو بہت زیادہ عطیات تو دیتے نہیں، اور ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ بھی نہیں کرتے (یہ سن کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور ان کا ہاتھ کوڑے پر گیا تاکہ ان کو ان کی اس غلط حرکت کی سزا دی جائے۔ ان کے بھتیجے حر بن قیس نے (دیکھا تو فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے) کہا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے حکم دیا ہے کہ جو قصوروار ہوں آپ ان سے درگذر کیجیے، اور بھلی بات کا حکم دیجیے، اور جو نادان اور جاہل لوگ ہوں ان سے چشم پوشی کیجیے۔ اور یہ بھی جاہلین ہی میں سے ہیں۔ (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے انہوں نے آیت پڑھی اور یہ بات عرض کی) تو فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کو سزا دینے کا جو ارادہ کیا تھا اس سے باز آ گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآنِ پاک کے سامنے بہت زیادہ ٹھہرنے والے تھے۔

عالم بڑا ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو

ہمارے یہاں ایک مزاج یہ ہے کہ کوئی آدمی کتنا ہی صاحبِ علم ہو، اگر اس کی

عمر کچھ کم ہے تو اس کے علم کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا، حالانکہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے "اَلْعَالِمُ کَبِیْرٌ، وَاِنْ کَانَ صَغِیْراً، وَالْجاهِلُ صَغِیْرٌ وَاِنْ کَانَ کَبِیْراً" عالم بڑا ہے، چاہے وہ عمر کے اعتبار سے چھوٹا ہو، اور غیر عالم چھوٹا ہے، چاہے وہ عمر کے اعتبار سے زیادہ ہو۔ عمر کا لحاظ تو اس وقت کیا جائے گا جبکہ ایک ہی کمال میں دو آدمی برابر ہوں لیکن اگر کمالات میں کوئی آدمی دوسرے سے بڑھا ہوا ہے تو وہاں آگے بڑھانے کے معاملہ میں عمر نہیں دیکھی جائے گی۔ ہاں! اس کی عمر کی وجہ سے اس کا اکرام ضرور کیا جائے گا، لیکن ان دونوں میں کس کو آگے بڑھایا جائے؟ تو اس میں اس کمال کا لحاظ ضرور کریں گے۔ بہر حال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن لوگوں سے مشورہ لیتے تھے اور اپنے پاس بٹھاتے تھے وہ سب اہلِ علم ہوتے تھے، چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قرآن پر عمل کا اہتمام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام خلفاءِ راشدین کے یہاں جو لوگ اپنی حاجتیں لے کر جاتے تھے، ان کے لیے تو وہاں کوئی رکاوٹ تھی ہی نہیں، لیکن ان کی مشورہ کی جو خصوصی مجلس ہوتی تھی اس میں ہر ایک کو حاضری کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لیکن حر بن قیس تو اصحابِ مشورہ میں سے تھے، اسی مجلس سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کے چچا نے جو مہمان آئے تھے اپنے لیے اجازت کو کہا کہ میں بھی اس خصوصی مجلس میں تمہارے ساتھ آنا چاہتا ہوں، میرے لیے بھی اجازت لے لو۔ چنانچہ انہوں نے ان کے لیے اجازت لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی رعایت میں ان کو اجازت دی، چنانچہ وہ اس مجلس میں حاضر ہوئے۔ اب ان کے مزاج میں ذرا اکھڑ پن تھا۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی باتوں اور مشورہ میں مشغول تھے، اور کسی بات پر وہ کہنے لگے کہ اے ابن الخطاب!

آپ ہم کو بہت زیادہ عطیات تو دیتے نہیں، اور ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل و انصاف تو پوری دنیا میں مشہور ہے، لیکن انہوں نے اپنے مزاج کے اکھڑ پن کی وجہ سے ایسی بات کہی۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور ان کا ہاتھ سیدھا کوڑے پر گیا، تاکہ ان کو ان کی اس غلط حرکت کی سزا دی جائے۔ ان کے بھتیجے نے دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا پر امیر المؤمنین کا کوڑا پڑ جائے، ورنہ چچا کا تو برا حال ہو جائے گا۔ تو حضرت حر بن قیس نے فوراً حضرت عمرؓ سے کہا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے حکم دیا ہے کہ جو قصوروار ہوں، آپ ان سے درگذر کیجئے۔ اور بھلی بات کا حکم دیجئے۔ اور جو نادان اور جاہل قسم کے لوگ ہیں ان سے اعراض یعنی چشم پوشی کیجئے "وَاِنَّ هٰذَا مِنَ الْجَاهِلِيْنَ" اور یہ بھی جاہلین ہی میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے انہوں نے آیت پڑھی تو فوراً حضرت عمر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کو سزا دینے کا جو ارادہ کیا تھا اس سے باز آ گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآنِ پاک کے سامنے بہت زیادہ ٹھہرنے والے تھے۔

قصہ کا سبق

ہمارا معاملہ تو ایسا ہے کہ ایسے موقع پر اگر کوئی آدمی ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا قرآنِ پاک کی کوئی آیت یا شریعت کا کوئی حکم سنائے تو بھی ہم نے جو طے کیا ہے اس سے پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے اور تاویلیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن حضراتِ صحابہ کرام کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ یہاں بھی دیکھئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بس! جیسے ہی آیت سنی، فوراً اس پر عمل کر لیا۔

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا اہلِ مشورہ اور اپنی (advisery body) علماء کو بنایا تھا، گویا یہ ان حضرات کا اکرام تھا۔

بڑوں کی مجلس میں ان کا لحاظ کرنا چاہیے

٣٥٨: وعن أبی سعید سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ قال: لَقَدْ كُنْتُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غُلاماً، فَكُنْتُ أَحْفَظُ عَنْهُ، فَمَا يَمْنَعُنِىْ مِنَ الْقُوْلِ اِلَّا أَنَّ هٰهُنَا رِجَالاً هُمْ أَسَنُّ مِنِّىْ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں چھوٹا تھا اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو یاد کرلیا کرتا تھا، لیکن آپ کی مجلس میں بولتا نہیں تھا اس لیے کہ آپ ﷺ کی مجلس میں مجھ سے بڑی عمر والے لوگ موجود ہوتے تھے۔

افادات: بڑوں کی موجودگی میں چھوٹوں کا بولنا خلاف ادب سمجھا جاتا ہے، بس! اسی کو ثابت کرنے کے لیے یہ روایت پیش کی ہے کہ بڑوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

بوڑھوں کا اکرام، اور دنیوی انعام

٣٥٩: وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخاً لِسِنِّهٖ اِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَهٗ مَنْ يُكْرِمُهٗ عِنْدَ سِنِّهٖ. (رواہ الترمذی وقال حدیث غریب)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی جوان جب کسی بوڑھے کا اکرام اس کی سن رسیدگی اور عمر کی وجہ سے کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس جوان کے لیے ایک ایسا آدمی پیدا کردیتے اور مقرر کردیتے ہیں جو اس کے بوڑھاپے کے زمانہ میں اس کا اکرام کرے گا۔

افادات: دیکھو! اس روایت میں دو بشارتیں ہوئیں، ایک تو یہ کہ یہ جوان بھی بوڑھاپے کا زمانہ پائے گا یعنی اس کی عمر لمبی ہوگی، اور دوسری خاص بات یہ کہ اس زمانہ

میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا کریں گے جو اس کا اکرام کریں گے۔ جوانوں کے لیے کتنی بڑی بات ہے!

ہے یہ گنبد کی صدا؛ جیسی کہے ویسی سنے

آج کل ہمارا سماج اور معاشرہ جس رخ پر جا رہا ہے اور اس وقت جو تعلیم دی جا رہی ہے، اور جو پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، میڈیا کے ذریعہ سے جو عادت ڈلوائی جا رہی ہے، اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ بڑوں کے اکرام کی طرف سے جوانوں کو ہٹایا جائے کہ ان کا کیا ہے؟ اور انہوں نے تمہارے ساتھ کیا احسان کیا ہے؟ ان کا تم پر کیا حق ہے؟ ایسی مختلف چیزیں پھیلائی جاتی ہیں۔ بھائی! یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا اور اسی کی ساری نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں، اور اسی کا حکم ہم مانتے ہیں اور جب اسی نے ہمیں یہ حکم دیا کہ جو سن رسیدہ اور بڑی عمر کا بوڑھا ہو، اس کا اکرام کیا جائے؛ بس! اسی نسبت سے ہمیں بڑوں کا اکرام کرنا چاہیے، تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے ایسے اسباب مہیا فرمائے گا۔ ورنہ دنیا کا حال تو ایسا ہی ہے کہ اگر آدمی نے کسی کی بے عزتی اور بے ادبی کا معاملہ کیا تو پھر اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔ ہے یہ گنبد کی صدا؛ جیسی کہے ویسی سنے۔ ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

(بخاری شریف۔ باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب۔ ۵۷۰/۱۰)

اگر عالم کوتاہی کرے تو؟

چوں کہ اس باب میں علماء کی توقیر کے سلسلہ میں خاص عنوان قائم کیا گیا تھا، تو آج کل عام طور پر بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں بعض اہلِ علم جن کی طرف سے عمل کے معاملہ میں کچھ کوتاہی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ تعلیم دی

جارہی ہے کہ ان کی کوتاہی اپنی جگہ پر ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ عمل کے معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مواخذہ ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے اس کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ حکم ہم پر سے ہٹ نہیں جاتا، جیسے کہ اگلے باب میں سادات کا حکم آیا تھا تو وہاں بھی میں نے بتلایا تھا۔

اسی طرح کوئی عالم اگر عمل کے معاملہ میں بے توجہی اور کوتاہی سے کام لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک طبیب اور ڈاکٹر جو اپنے فن کا ماہر ہے لیکن بد پرہیز ہے، اور جو چیزیں صحت کے لیے مضر ہیں وہ خود ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کو استعمال کرے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی صحت اور تندرستی متأثر ہوگی اور وہ خود بیمار ہوگا، لیکن اس کے باوجود کوئی دوسرا بیمار اس سے علاج ومشورہ کے لیے جائے گا تو وہ اس کو تو صحیح علاج بتائے گا اور مشورہ دے گا، اس نے اپنے فن کی جو معلومات تھیں ان معلومات کو چھوڑ کر اور بد پرہیزی کر کے اگر چہ خود اپنا نقصان کیا ہے، لیکن اگر آپ مشورہ لینے کے لیے جائیں گے تو وہ آپ کو تو صحیح مشورہ ہی دے گا۔

ایک قانون داں (Lawyer) وکیل اور ایڈوکیٹ ہے، وہ ملک کے قانون کو جانتا ہے، لیکن وہ خود قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس خلاف ورزی کرنے پر اگر وہ پکڑا گیا تو جو سزا اس کو ملنے والی ہے وہ اس کو ملے گی، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ساری چیزیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن اگر آپ قانون کے معاملہ میں اس کے پاس مشورہ لینے جائیں گے تو وہ اپنے علم کی بنیاد پر اور قانون کو جاننے کی وجہ سے آپ کو صحیح راستہ ہی بتائے گا، اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی عالم کی طرف سے اس کے علم کے

باوجود عملی طور پر کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے اس کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

اگر عذاب دینا چاہتے

یہ علم خود اپنی جگہ پر ایک کمال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے۔ امام محمدؒ جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، ان کے انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور موتیوں کا تاج میرے سر پر رکھا اور مجھ سے کہا کہ اے محمد! اگر ہم تم کو عذاب دینا چاہتے تو تمہارے سینے میں اپنا علم نہ رکھتے۔

تو معلوم ہوا کہ یہ علم بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور کیا ضروری ہے کہ وہ عالم اپنی اس بدعملی کے اوپر باقی رہے، ہوسکتا ہے کہ کل کو اسی علم کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور وہ تائب ہوکر اور اپنی بدعملی چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلے، اور ہم اس کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے، یا اس کا اکرام نہ کرکے اپنا ہی نقصان کرلیں۔

اہلِ علم کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے ''الاعتدال فی مراتب الرجال''۔ حضرت شیخؒ کے یہاں رمضان المبارک میں پڑھ کر سنائی جاتی تھی اور ہمارے یہاں بھی اس کو سناتے ہیں، اس کتاب میں حضرت شیخؒ نے علماء سے متعلق کچھ چیزیں لکھی ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ وہ میں پڑھ کر سناؤں تو وہ آپ کے بھی سامنے آجائے، اسی لیے یہ کتاب میں ساتھ لایا تھا اور اسی کو سناتا ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص میری امت میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے عالم کی قدر نہ کرے۔ (ترغیب)

اس ارشادِ نبوی کے بعد علماء کو علی العموم گالیاں دینے والے اور برا بھلا کہنے والے اپنے آپ کو امتِ محمدیہ میں شمار کرتے ہیں لیکن صاحبِ امت ان کو اپنی امت میں شمار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کو منافق کے سوا کوئی آدمی ہلکا (اور ذلیل) نہیں سمجھ سکتا، ایک شخص وہ جو اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو گیا، دوسرے اہلِ علم، اور تیسرے منصف بادشاہ۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’اُغْدُ عَالِماً أَوْ مُتَعَلِّماً أَوْ مُسْتَمِعاً أَوْ مُحِبّاً وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَ فَتَهْلَكَ‘‘ (مقاصد حسنہ) کہ تو یا عالم بن یا طالب علم، یا علم کا سننے والا، یا (علم اور علماء) سے محبت رکھنے والا، پانچویں قسم میں داخل نہ ہونا، ورنہ ہلاک ہو جائے گا

حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پانچویں قسم سے مراد علماء کی دشمنی ہے اور ان سے بغض رکھنا ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تو عالم بن، یا طالب علم، اور اگر دونوں نہ بن سکے، تو علماء سے محبت رکھنا، ان سے بغض نہ رکھنا۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ قرآن شریف کے حاملین یعنی حافظ اور علماء قیامت کے دن جنت والوں کے چودھری (سردار) ہوں گے۔

دوسری حدیث میں وارد ہے کہ حاملینِ قرآن اللہ کے ولی ہیں، جو شخص ان سے دشمنی کرتا ہے، وہ اللہ سے دشمنی کرتا ہے۔ اور جو ان سے دوستی کرتا ہے، وہ اللہ سے دوستی کرتا ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی امت پر تین چیزوں سے زیادہ

کسی چیز کا خوف نہیں کرتا، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ علم والے شخص کو دیکھیں اور اس کو ضائع کر دیں، پرواہ نہ کریں۔ (ترغیب)

امام نوویؒ ''شرحِ مہذب'' میں لکھتے ہیں کہ بخاری شریف میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے، میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

اور خطیب بغدادی نے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر فقہاء (علماء) اللہ کے ولی نہیں ہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی ہے ہی نہیں۔

حِبرُ الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی فقیہ (عالم) کو اذیت پہنچائے، اس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی، اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائے، اس نے اللہ جل جلالہٗ کو اذیت پہنچائی۔

حافظ ابوالقاسم بن عساکر فرماتے ہیں: میرے بھائی ایک بات سن لے، حق تعالیٰ شانہ مجھے اور تجھے اپنی رضا کے اسباب کی توفیق عطا فرمائے، اور ہم کو ان لوگوں میں داخل فرمائے جو اس سے ڈرنے والے ہوں اور جیسا کہ چاہیے ویسا تقویٰ کرنے والے ہوں، (یہ بات سن لے) کہ علماء کے گوشت (یعنی ان کی غیبت) نہایت زہریلے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی پردہ دری میں اللہ کی عادت سب کو معلوم ہے (کہ جو لوگ علماء کی اہانت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی پردہ دری فرماتے ہیں) جو شخص ان کو عیب لگانے میں لب کشائی کرتا ہے، اس کے مرنے سے پہلے حق تعالیٰ شانہٗ اس کے دل کو مردہ بنا دیتے ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: اگر گالیاں دینے

والے کا مقصود علم اور علماء کی تحقیر علم کی وجہ سے ہے تو فقہاء اس کے کفر کا فتویٰ دیتے ہیں، ورنہ اگر کسی اور وجہ سے ہے (یعنی اگر اس کی ذات سے تکلیف پہنچی اور اس کی وجہ سے برا بھلا کہا تو کافر تو نہیں ہے) تب بھی اس آدمی کے فاسق وفاجر ہونے میں اور اللہ کے غصہ اور دنیا اور آخرت کے عذاب کے مستحق ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

اس کے بعد فقہاء کے کلام سے، نیز قرآنِ پاک اور احادیث سے اس مضمون کی تائید نقل فرمائی ہے۔

ہم لوگوں سے یہ عہد لیے گئے

علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ جو اکابر صوفیاء میں ہیں، انہوں نے ایک کتاب ''عُھودِ محمدیہ'' لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں فلاں باتوں پر حضور ﷺ نے عہد لیے ہیں، اس میں لکھتے ہیں: ہم لوگوں سے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ایک عام عہد اس بات کا لیا گیا ہے کہ ہم علماء کا اکرام کریں، اعزاز کریں اور ان کی تعظیم کریں۔ اور ہم میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ان کے (احسانات کا) بدلہ ادا کرسکیں، چاہے ہم وہ سب دے دیں جو ہماری مِلک میں ہے، اور ساتھ ہی پوری زندگی ان کی خدمت کرتے رہیں۔ اس معاہدہ میں بہت سے طلباء اور بہت سے مریدین کوتاہی کرنے لگے ہیں، حتیٰ کہ ہم کو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے استاذ کے حقوقِ واجبہ ادا کرتا ہو، یہ دین کے بارے میں ایک بڑی بیماری ہے، جس سے علم کی اہانت (بے قدری) کا پتہ چلتا ہے، اور اس ذات (یعنی نبی کریم ﷺ) کے حکم کے ساتھ لاپرواہی کا پتہ چلتا ہے، جس نے اس کا حکم فرمایا ہے۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ ہم لوگوں سے نبی اکرم ﷺ کی طرف

سے یہ عام عہد لیا گیا ہے کہ ہم علماء کی، صلحاء کی اور اکابر کی تعظیم کیا کریں، چاہے وہ خود اپنے علم پر عمل نہ کیا کریں۔ اور ہم لوگ ان کے حقوقِ واجبہ کو پورا کرتے رہیں، اور ان کے ذاتی معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ جو شخص ان کے حقوقِ واجبہ، اکرام و تعظیم میں کوتاہی کرتا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کرتا ہے، اس لیے کہ علماء رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں اور ان کی شریعت کے حامل اور اس کے خادم۔ پس جو شخص ان کی اہانت کرتا ہے تو یہ سلسلہ حضور اقدس ﷺ تک پہنچتا ہے اور یہ کفر ہے۔ اور تم غور کر لو کہ بادشاہ اگر کسی کو ایلچی بنا کر کسی کے پاس بھیجے اور وہ اس کی اہانت (بے ادبی) کرے تو بادشاہ ایلچی کی بات کس غور سے سنے گا، اور اپنی اس نعمت کو جو اس اہانت (بے ادبی) کرنے والے پر تھی، ہٹا لے گا، اور اس کو اپنے دربار سے ہٹا دے گا، بخلاف اس شخص کے جو ایلچی کی تعظیم و توقیر کرتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے تو بادشاہ بھی اس کو اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔

اس مضمون میں یہ بات کہ ''چاہے وہ اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں'' ایسی ہی ہے جیسا کہ اس خط کے شروع میں حضرت معاذؓ کے کلام میں مفصل گذر چکی اس کے اعادہ (لوٹانے) کی ضرورت نہیں۔

چار قسم کے عذاب

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت اپنے علماء سے بغض رکھنے لگے گی، اور بازاروں کی عمارتوں کو بلند اور غالب کرنے لگے گی اور مال و دولت کے ہونے پر نکاح کرنے لگے گی (یعنی نکاح میں بجائے دینداری اور تقویٰ کے مال دار کو دیکھا جائے گا) تو حق تعالیٰ شانہ چار قسم کے عذاب ان

پر مسلط فرمائیں گے (۱) قحط سالی ہو جائے گی (۲) بادشاہ کی طرف سے مظالم ہونے لگیں گے (۳) حکام خیانت کرنے لگیں گے (۴) اور دشمنوں کے پے در پے حملے ہوں گے۔ (حاکم)

امت کے بے وقوف

آج کل ان عذابوں میں سے کون سا نہیں ہے جو امت پر مسلط نہیں، لیکن وہ اپنی خوشی سے ان کے اسباب کو اختیار کریں تو پھر شکایت کیا؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک گھر میں ایک کتیا تھی، جس کے بچے ہونے کا وقت قریب تھا، ان لوگوں کے یہاں کوئی آدمی مہمان ہوا تو کتیا نے خیال کیا کہ آج رات کو مہمان پر شور نہ کروں گی، لیکن بچہ پیٹ ہی میں سے شور کرنے لگا، حق تعالیٰ شانہٗ نے وحی سے ارشاد فرمایا کہ یہی مثال اس امت کی ہے جو تمہارے بعد آنے والی ہے کہ اس کے بے وقوف اس امت کے عالموں پر غالب ہو جائیں گے۔ (مجمع الزوائد)

کفر کا اندیشہ

فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں کثرت سے یہ مضمون نقل کیا گیا ہے کہ علم سے اور علماء سے بغض و نفرت سخت اندیشہ ناک ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں نصاب الاحتساب سے نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی عالم سے بلا کسی ظاہری سبب کے بغض رکھے، اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔ ظاہری سبب سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شرعی وجہ اور دلیل اس بات کی ہو تو مضائقہ نہیں ہے، لیکن بلا کسی شرعی وجہ سے ایسا کرنا سخت اندیشہ ناک ہے۔ ایسی صورت میں کہ جب اندیشہ ناک صورت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے، کیا ضروری نہیں کہ ہر شخص اس چیز میں خصوصی احتیاط برتے؟

کسی عالم کے قول کو رد کرنے کا حق ضرور حاصل ہے، اس کی تردید کی جاسکتی ہے مگر جب ہی، جب اس کے مقابل تردید کا شرعی سامان موجود ہو، اس کے قول کے خلاف نصوص شرعیہ موجود ہوں، اور رد کرنے والا نصوص سے استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ میرا مقصود ہرگز نہیں کہ عالم جو بھی کہہ دے وہ صحیح ہے، اور اس کے کسی قول پر رد اور انکار نہ کیا جائے، نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی آدمی بھی ایسا نہیں ہے جس کے قول پر رد نہ کیا جاسکے، اس کے اقوال اور افعال میں غلطی کا احتمال نہ ہو، بیشک ہے اور ضرور ہے، لیکن رد کرنے کے واسطے اور غلطی پکڑنے کے واسطے شریعتِ مطہرہ میں حدود قائم ہیں، اس کے درجات ہیں، اس کے قواعد اور آداب ہیں، تاوقتیکہ اس سے واقفیت نہ ہو؛ رد کرنے کا حق بھی کسی کو نہیں ہے۔

قابلِ غور چند باتیں

میں یہ بھی نہیں کہتا کہ علماء بے عیب ہیں یا ان میں کوتاہیاں نہیں ہیں، یقیناً ہیں اور بمقتضائے زمانہ ہونا بھی چاہئیں، مگر ان کی کوتاہیوں کو پکڑنے کے ساتھ ساتھ چند امور قابل غور اور قابل لحاظ ہیں۔ اہل علم ہی ان چیزوں پر زیادہ اچھی طرح روشنی ڈال سکتے تھے، مگر چوں کہ یہاں معاملہ خود ان کی ذات کا آجاتا ہے اس لیے اس مسئلہ میں ان کو زیادہ واضح گفتگو کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اور اپنے وقار کا مسئلہ آجانے کی وجہ سے وہ اس میں وضاحت اور زور سے رد کرنے میں تساہل کرتے ہیں۔

(میں بھی اس کتاب کو سنانے کے واسطے لایا اس کی بھی وجہ یہی ہے، چوں کہ آج کل کوتاہی بہت ہورہی ہے، میں اگر تفصیل سے بیان کرتا تو کہتے کہ مولوی صاحب اپنی عزت کروانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں، اس لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی

تصنیف لاکراسی میں سے کتابوں کے حوالہ سے سنا رہا ہوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بھائی! علماء کے حقوق کی تاکیداپنے منھ سے بیان کرنے میں ہمیں خود بھی بڑی حیاء آتی ہے، اسی لیے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ علماء اس موضوع کو چھیڑتے نہیں ہیں، حضرت شیخ بھی لکھ رہے ہیں، پھر بھی حضرت کواس چیز کا احساس ہوا تو خود ہی یہ چیز فرمارہے ہیں کہ) میں اجمالی طور پر ان امور کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اول تو اس وجہ سے کہ میرا اور تمہارا خصوصی تعلق اس بدگمانی سے بالاتر ہے کہ میں اپنا اعزاز تم سے کرانا چاہتا ہوں۔ (چوں کہ یہ کتاب دراصل ایک خط ہے جو حضرت نے اپنے ایک شاگرد کو لکھا ہے۔ اس شاگرد نے کچھ سوالات کیے تھے، حضرت نے ان کے جواب دیئے ہیں۔ انہیں کو کہہ رہے ہیں کہ ہمارا تعلق تو ایسا ہے، اس لیے تم یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی عزت کروانا چاہتا ہوں۔)

دوسرے اس وجہ سے بھی کہ میرا کچھ زیادہ شمار بھی علماء کی جماعت میں نہیں ہے ایک کتب فروش ہوں، کتابیں بیچتا ہوں اور ایام گزاری کرتا ہوں (حضرت شیخ اپنے آپ کو یہ لکھ رہے ہیں)

تیسرے یہ خط بھی میرا ایک نجی خط ہے۔

چوتھے اس وجہ سے کہ میرے ساتھ تمہارا، بلکہ میرے تمام دوستوں کا جو معاملہ ہے، وہ میری حیثیت سے زیادہ ہے، اس لیے غور سے سنو، یہاں چند باتیں قابل لحاظ ہیں اور عام طور پر ان میں خلط ملط کیا جاتا ہے، یا عمداً ان سے اعراض یا تسامح کیا جاتا ہے، اور کہیں ناواقفیت بھی اس کا سبب ہے۔ بہرحال! یہ امور قابل غور ہیں:-

(۱) کیا ہر وہ شخص جو اہلِ علم کے لباس میں ہو، کسی عربی مدرسہ میں طلباء کے رجسٹر میں نام لکھا چکا ہو، تقریر دلچسپ کرتا ہو، تحریر اچھی لکھتا ہو؛ وہ عالم ہے، اور علماء کی

جماعت کا فرد ہے؟ اس لیے ہر شخص کی بات کو لے کر اور سن کر علماء کی طرف منسوب کر دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کھرا کھوٹا، اصلی جعلی، واقعی مصنوعی، دنیا کی ہر چیز میں نہیں ہے؟ دیکھو! دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز سونا چاندی اور جواہرات ہیں اور ضروری سے ضروری اور ہر شخص کا محتاج الیہ پیشہ حکیم اور ڈاکٹر کا پیشہ ہے، تو پھر کیا دونوں قسمیں ایسی نہیں ہیں جن میں کھرے سے کھوٹا زیادہ، اور اصلی سے نقلی زیادہ نہ ملتا ہو؟ یا واقعی سے مصنوعی بڑھے ہوئے نہ ہوں، تو پھر کیا حکیموں اور ڈاکٹروں کو اس وجہ سے گالیاں دی جاتی ہیں کہ ان کے لباس میں مصنوعی اور خطرۂ جان طبیب زیادہ ہیں، یا ہر سونے چاندی اور جواہرات کو اس وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ نقلی اور مصنوعی زیادہ ملتے ہیں؟؟ نہیں نہیں! بلکہ ان چیزوں میں یہاں تک افراط کی جاتی ہے کہ جہاں مشہور اور واقف طبیب میسر نہیں ہوتا، وہاں جان بوجھ کر ایسے ہی طبیبوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ضرورت سخت ہے۔ طبیب حاذق کے پاس فوراً پہنچنا مشکل ہے۔ (یعنی بیماری میں اچھا ڈاکٹر نہ ملے تو چالو ڈاکٹر سے بھی کام چلا لیتے ہیں، یوں سمجھ کر کہ اگر اس وقت اس سے رجوع نہیں کریں گے تو مر جائیں گے تو چوں کہ اپنی تندرستی ضروری سمجھی نا، اس لیے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور دین کے معاملہ میں!!! کہ دین کو بچانا ہے، اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہے، لیکن اس کی ضرورت اتنی سمجھی نہیں جاتی، اس لیے کوتاہی کرتے ہیں۔) مصنوعی سونا دیدہ و دانستہ (جان بوجھ کر) خریدا جاتا ہے، کیوں کہ ضرورت کو پورا کرنا ہے، اور اصلی سونا اس وقت ملنا دشوار ہے، یا گراں (مہنگا) ہے کہ تحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن علماء سب ہی گردن زنی (گردن مارنے کے قابل) ہیں، اس لیے کہ ان کے لباس میں جھوٹے بہت ہیں۔

تم نے غور کیا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ (سونا چاندی اور ڈاکٹر کا علاج) ضرورت کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، اور یہ بے ضرورت ہیں۔ اُن کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے اور یہ بے کار آمد ہے، اُن میں اچھے سے اچھے طبیب کی تلاش ہے، لیکن اس وقت تک کہ اچھا طبیب ملے جو بھی موجود ہو، وہ نہایت مغتنم ہے، اور اس کی رائے پر عمل نہایت اہم اور ضروری ہے، اور یہاں حقیقی (علماء) ملتے نہیں ہیں، اور جو ملتے ہیں وہ ہمارے نزدیک کامل نہیں ہیں، اس لیے لغو اور بے کار ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے اور دینی ضرورت کو ضرورت سمجھا جائے، دین کا اہتمام اور اس کی فکر قلوب میں کم از کم اتنی ہو جتنی ایک عزیز کے بیمار ہونے کی، یا بیٹی کے نکاح کرنے کی؛ تو عالمِ کامل کی تلاش میں طبیب حاذق کی تلاش سے زیادہ سرگرداں ہوں۔ اگر دین کا فکر ہو تو حقیقی ضرورت یہی ہے۔ عزیز کی بیماری کا منتہاء موت ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں، حاذق سے حاذق اور ماہر سے ماہر طبیب یہاں بے بس ہیں، وہ اپنا ہی کچھ نہیں بنا سکتا، تو دوسرے کا کیا کر سکتے ہیں۔

بیٹی کی شادی میں زیور نہ ہی میسر آسکا تو کیا بگڑ گیا؟ اتنا ہی ہوا کہ برادری کے لوگ، عزیز واقارب طعن وتشنیع کریں گے، وہ ابھی کب چھوڑ دیں گے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اب چار سنائیں گے، اُس وقت آٹھ سنا دیں گے۔ لیکن علماء کی ضرورت دین کے لیے ہے، جس کے بغیر زندگی بے کار ہے، دنیا میں آنا بے کار ہے، آدمی صرف دین ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، حق سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے کہ میں نے آدمی اور جن صرف اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کئے ہیں۔ جب یہی اصل غرض آدمی کی پیدائش سے ہے، تو اس کے لیے جس چیز کی غرض ہوگی وہ سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہوگی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ علماء کی مثال زمین میں ایسی ہے جیسا کہ آسمان

پرستارے جن کے ذریعہ سے جنگل کے اندھیروں میں اور سمندر کے سفر میں راستہ پہچانا جاتا ہے، اگر ستارے بے نور ہو جائیں تو اقرب ہے یہ بات کہ رہبرانِ قوم راستے سے بھٹک جائیں۔ (ترغیب)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ نبوت کے درجہ سے بہت قریب جماعت ایک علماء کی ہے، دوسرے مجاہدین کی۔ اس لیے کہ علماء اس چیز کا راستہ بتاتے ہیں جو اللہ کے رسول لے کر آئے ہیں اور مجاہدین اپنی تلواروں سے اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ (احیاء)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ خیر کی بات سکھانے والے کے لیے اللہ جل شانہٗ رحمت بھیجتے ہیں، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اور ہر وہ چیز جو آسمان وزمین میں ہے حتیٰ کہ چیونٹی اپنے سوراخ میں اور مچھلیاں سمندر میں اس کے لیے دعاءِ خیر کرتی رہتی ہیں۔ (ترمذی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی عالم مرجاتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پیدا ہو جاتا ہے جس کو اس کا کوئی نائب ہی بھر سکتا ہے۔ (احیاء)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایک ہزار عابد جو شب بیدار ہوں اور دن بھر روزہ رکھتے ہوں ان کی وفات ایک ایسے عالم کی وفات سے زیادہ سہل (آسان) ہے جو حلال وحرام سے واقف ہو۔ (احیاء)

(٢) دوسری یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کے ہر کام میں فن والوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، مکان بنانا ہے تو مستری کے بغیر چارہ نہیں، قفل (تالا) درست کرانا ہے تو لوہار کے بغیر گذر نہیں۔ مقدمہ کرنا ہے، آپ لاکھ سمجھ دار ہوں ہوشیار ہوں لیکن وکیل کے بغیر مفر نہیں۔ آپ لاکھ قابل ہوں لیکن تعمیر مستری ہی کرے گا، مگر علم دین ایسا ارزاں (سستا) ہے کہ ہر شخص جو ذرا بھی بولنا یا لکھنا جانتا ہے، وہ واقف اسرار شریعت

ہے، محقق ملت ہے، اور اس کی محققانہ تحقیق کے خلاف قرآن شریف اور احادیثِ نبویہ بھی قابل قبول نہیں، پھر علماء بیچاروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور چوں کہ اس کے مقابل اگر کوئی آواز اٹھتی ہے تو وہ علماء کی جانب سے ہوتی ہے، اس لیے جتنا بھی یہ روشن دماغ علماء کے خلاف زہر اُگلیں، اور علماء کے خلاف جھوٹ یا سچ الزام لگا کر عوام کو ان سے بدکائیں؛ وہ قرینِ قیاس ہے کہ ان کی غلط باتوں کی اور دین میں تحریف کی پردہ دری علماء ہی سے ہوتی ہے، وہ مخالف بھی بنیں گے، وہ دشمن بھی بنیں گے، اور جو کچھ کر سکتے ہیں وہ سب ہی کچھ کر گذریں گے۔ مگر کیا ہوسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مجھے اپنے بعد سب سے زیادہ خوف تم پر ہے ہر اُس منافق کا، جو زبان کا ماہر ہو۔ (ترغیب) کہ یہ لوگ اپنی شستہ تحریر وتقریر سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر گمراہ کرتے ہیں اور دین کے ہر جزو کا استہزاء و مذاق کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دین کے اجزاء کے متعلق بھی ہر فن کے خواص کو ممتاز فرما دیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جابیہ میں خطبہ (وعظ) فرمایا جس میں یہ اعلان فرمایا کہ جو شخص کلام اللہ شریف کے متعلق کوئی بات معلوم کرنا چاہے وہ اُبی بن کعب کے پاس جائے۔ اور جس شخص کو فرائض کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو وہ زید بن ثابت کے پاس جائے۔ اور جس شخص کو فقہ کا کوئی مسئلہ معلوم کرنا ہو وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے۔ البتہ جس شخص کو (بیت المال سے) کچھ مال طلب کرنا ہو وہ میرے پاس آئے کہ مجھے اللہ نے والی اور مال کی تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔ (مجمع الزوائد)

اور پھر حضرات تابعین رحمہم اللہ کے زمانہ میں تو ہر شعبہ کی مستقل جماعتیں قائم ہو گئیں تھیں، محدثین کی جماعت علٰیحدہ، فقہاء کی علٰیحدہ، مفسرین کا مستقل گروہ، واعظین

مستقل، صوفیہ مستقل؛ لیکن ہمارے زمانہ میں ہر شخص اس قدر جامع الاوصاف اور کامل مکمل بننا چاہتا ہے کہ وہ معمولی سی عربی عبارت لکھنے لگے، بلکہ صرف اردو کی عبارت دلچسپ لکھنے لگے، یا تقریر برجستہ کرنے لگے، تو پھر وہ تصوف میں مستقل اہل الرائے ہے، فقہ میں مستقل مجتہد ہے، قرآن پاک کی تفسیر میں جو نئ سے نئ بات دل چاہے گھڑے۔ نہ اس کا پابند کہ سلف کا یہ قول ہے یا نہیں، نہ اس کی پرواہ کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات اس کی نفی تو نہیں کرتے۔ وہ دین میں مذہب میں جو چاہے کہے، جو منہ میں آئے بکے، کیا مجال ہے کہ کوئی شخص اس پر نکیر کر سکے، یا اس کی گمراہی کو واضح کر سکے۔ جو یہ کہے کہ یہ بات اسلاف کے خلاف ہے، وہ لکیر کا فقیر ہے، تنگ نظر ہے، پست خیال ہے، تحقیقاتِ عجیبہ سے عاری ہے۔ لیکن جو یہ کہے کہ آج تک جتنے اکابر نے، اسلاف نے جو کچھ کہا وہ سب غلط ہے اور دین کے بارے میں نئ نئ باتیں نکالے، وہ دین کا محقق ہے۔ نبی کریم ﷺ کا تو ارشاد ہے کہ جو شخص قرآن پاک کی تفسیر میں اپنی رائے سے کچھ کہے اگر وہ صحیح بھی ہو، تب بھی اس نے خطا کی۔ (مجمع الزوائد) مگر یہ لوگ قرآن پاک کی ہر آیت میں سلف کے اقوال کو چھوڑ کر نئ بات پیدا کرتے ہیں۔

اور صریح ظلم یہ ہے کہ علماء کو ہر شخص مشورہ دیتا ہے کہ وہ تفریق نہ کریں، تفسیق نہ کریں، تکفیر نہ کریں، لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ روشن دماغ دین کی حدود سے نہ نکلیں۔ یہ نبوت کا انکار کر دیں، یہ قرآن وحدیث کا انکار کر دیں، یہ نماز روزہ کو لغو بتا دیں، یہ حضور کی شان میں گستاخیاں کریں، صحابہ کرام کو گالیاں دیں، ائمہ مجتہدین کو گمراہ بتا دیں، فقہ اور حدیث کو نا قابل عمل بتا دیں، دین کے ہر ہر جزو سے انکار کر دیں، دین کی ہر بات کا استہزاء اور مذاق اُڑائیں، لیکن یہ پھر بھی مسلمان رہتے ہیں، پکے دین دار رہتے ہیں۔

اور جو اُن کے خلاف آواز اُٹھائے وہ دین کا دشمن ہے، مسلمانوں کا بدخواہ ہے، وہ کافر بنانے والا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو علماء کافر نہیں بناتے ہیں، اس لیے کہ جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کردے، وہ اپنی رضا اور رغبت اور اپنی روشن خیالی یا اپنے جہل سے کافر تو خود ہی بن چکا ہے، خواہ اس کو کوئی کافر بتائے یا نہ بتائے۔ اور اگر وہ اب تک کافر نہیں بنا تو کسی کے کافر بتانے سے کافر نہیں بنتا۔ اور اگر بن چکا ہے تو کسی کے کافر نہ بتانے سے مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو کافر بتانے والے کا تو احسان ہے کہ وہ اس پر تنبیہ کررہا ہے، متنبہ کررہا ہے کہ جو چیز تم نے اختیار کی ہے وہ اسلام سے نکال دینے والی چیز ہے، اور کفر میں داخل کردینے والی چیز ہے۔ اگر دین کی فکر ہے تو اس تنبیہ پر متنبہ ہونا چاہیے۔ کہنے والے کے قول پر اعتماد نہیں تو خود تحقیق کرلینا چاہیے کہ کہنے والے کا قول صحیح ہے یا غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ غلط ہوگا اور مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض اوقات غلط بھی ہوتا ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ ہمیشہ ہی غلط ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ کہ مغربی تعلیم کے زیراثر، یا دین سے ناواقفیت کے سبب کہنے والا جو چاہے کہہ گذرے، اس کو ہرگز کافر نہ کہا جائے، دنیا کے ساتھ خیرخواہی نہیں۔ یہ ناواقفوں کو اور ان لوگوں کو جو ناواقفیت سے اس آفت میں مبتلا ہوجانے والے ہیں، کافر بنانا ہے۔ اس لیے حقیقت میں کافر بنانے والے وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ کفر کی باتوں پر تنبیہ نہ کی جائے، ان کو واضح اور ظاہر نہ کیا جائے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ کفر آج کل ایسا سستا ہوگیا ہے کہ ہر شخص کافر ہے، اور اس خیال سے کفریات سے متأثر نہ ہونا یہ خود دین سے، نبی اکرم ﷺ کے پاک ارشادات سے، فقہائے امت کے اقوال سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ (الاعتدال فی مراتب الرجال۔ ص۔۱۶۴ تا ۱۷۵)

زِيارَةُ أَهلِ الْخَيرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ

نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

۴/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۱۹/جون ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰه فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّآاللّٰه وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰه تَعَالٰی عَلَيْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً۔أَمَابَعْدُ: وَإِذْقَالَ مُوسٰی لِفَتَاهُ لَاأَبْرَحُ حَتّٰی أَبْلُغَ مَجمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْأَمْضِیَ حُقُباً.

عنوان کی وضاحت

باب قائم کیا ہے کہ جولوگ صالح، اہلِ خیر اور نیک ہوں، ان کی ملاقات کیلیے جانا چاہیے، اور ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا چاہیے۔اس لیے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان پر جوخصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کوبھی اپنے اندر شامل کرلیا کرتی ہیں۔اس لیے ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا یہ بھی ان برکتوں کا ذریعہ بنتا ہے۔"وَصُحْبَتُهُمْ" اور ان کی مصاحبت اور ان کا ساتھ اختیار کرنا۔"وَمُحَبَّتُهُمْ" اور ان کے ساتھ محبت اور تعلق رکھنا "وَطَلَبُ زِيَارَتِهِمْ وَالدُّعَاءُ مِنْهُمْ" اور جس طرح خود ان کی زیارت کے لیے جائے، اسی طرح ان سے یہ درخواست کرنا کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں۔اور ان سے دعا کی درخواست کرنا۔ "وَزِيَارَةُالْمَوَاضِعِ الْفَاضِلَةِ" اور ایسے مقامات کی زیارت کیلیے جانا جن کی کوئی خصوصی فضیلت قرآنِ پاک یا احادیثِ مبارکہ میں آئی ہے۔علامہ نوویؒ نے اس باب کا عنوان یہی قائم کیا ہے۔گویا ان تمام چیزوں کی اہمیت کو اس باب میں بیان کرنا اور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو سورۂ کہف کی ان آیتوں

کو ذکر کیا ہے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے یوں کہا کہ میں اپنا یہ سفر برابر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ دو دریا جہاں ملتے ہیں وہاں پہنچ جاؤں یا اس مقصد کے لیے سالہا سال ایک طویل زمانہ تک اپنا یہ سفر جاری رکھوں۔

یہ واقعہ جو قرآن پاک کی ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ احادیث کے اندر موجود ہے، اس کا بہت کچھ حصہ تو ان آیات کے اندر ہے اور اس کا ابتدائی حصہ احادیث میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنی قوم میں لوگوں کی اصلاح اور نصیحت کے لیے ایک بیان کیا اور ایسی تقریر فرمائی کہ جس سے سننے والے بہت متاثر ہوئے، جب وہ اپنے اس بیان سے فارغ ہوئے تو مجمع میں سے ایک آدمی نے ان سے سوال کیا کہ روئے زمین پر آپ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور موجود ہے؟

واقعہ بھی یہی تھا کہ شریعت کا جتنا علم اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اتنا کسی اور کو نہیں دیا تھا۔ چوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبروں میں سے ہیں۔ پیغمبروں میں بھی بعض پیغمبر اور رسول وہ ہیں جن کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم؛ یہ پانچ پیغمبروں کے نام جلیل القدر انبیاء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر پیغمبروں میں سے تھے، اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی قرب حاصل تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا، بلکہ اگر غور کریں تو

قرآنِ پاک میں جس کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ مختلف مقامات پر مختلف انداز سے آیا ہے، کسی اور نبی کا تذکرہ اتنی کثرت سے قرآن میں موجود نہیں۔

......اس ذات کی محبوبیت کا کیا عالم ہوگا؟

علامہ عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا اور میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآنِ پاک میں مختلف مواقع پر اور وہ بھی ایک خاص انداز سے جس سے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تعلق اور ان کی عجیب محبت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص برگزیدگی اور پسندیدگی کا پتہ چلتا ہے ان کی پیدائش، بچپن، دودھ پینے کا زمانہ، بڑا ہونا، جوانی کے ایام کو کس شہر میں گذارنا، پھر وہاں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جانا اور وہاں نکاح ہونا، پھر نبوت سے نوازا جانا، پھر اپنی قوم کے ساتھ کا پورا معاملہ؛ مطلب یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نبی کی زندگی کی اتنی زیادہ تفصیل قرآنِ پاک میں موجود نہیں ہے۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو تمام نبیوں میں سب سے بڑھ کر ہے، آپ تو سید الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں، پھر بھی حضرت موسیٰ کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے ویسا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تذکرہ قرآنِ پاک میں موجود نہیں، حالانکہ قرآنِ پاک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ یہ چیز بار بار میرے دل میں کھٹکتی تھی۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب اس آیت پر غور کیا ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے باری تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اے نبی! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، تو تم میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس

آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی پیروی اور اتباع پر ہر اس آدمی کو- جو آپ ﷺ کی پیروی کرے -محبوبیت کا مقام عطا فرمایا ہے۔تو جس ذات کی پیروی کرنے پر پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا مقام دیا جاتا ہو؛ تو خود اس ذات کی محبوبیت اور قرب کا کیا عالم ہوگا!

حضرت موسیٰ کا جواب، اللہ کا عتاب

خیر! تو اس آدمی نے سوال کیا تھا کہ اس وقت روئے زمین پر آپ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور موجود ہے؟ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے، آپ کے پاس وحی آیا کرتی تھی، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی معلومات کے مطابق اس آدمی کو یہ جواب دیا کہ نہیں۔ گویا شریعت کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والا میں ہی ہوں اور آپ کا جواب بالکل درست تھا۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ اپنے مقرب اور خصوصی بندوں کے ساتھ بڑا عجیب وغریب ہوا کرتا ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب یہ سوال کیا گیا تو چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں یوں کہتے کہ دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کے بندے تو بہت سارے ہیں، کون کس درجے پر ہے اور کس کو کتنا علم دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ گویا اس سوال کے جواب کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کرتے، لیکن اس کے بجائے انہوں نے جب یہ جواب دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔ اور بطورِ عتاب کے ان سے یہ کہا گیا کہ ہمارے ایک بندے ہیں جو وہ باتیں جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ تم جو یہ کہتے ہو کہ روئے زمین پر سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں تو ان کے پاس ایک ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔

ویسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ شریعت اور اسرارِ شریعت کا جو علم دیا گیا تھا اتنا کسی اور کے پاس نہیں تھا لیکن ایک اور طرح کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیا تھا، اسی کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باخبر کیا گیا کہ ہمارے ایک بندے ایسے ہیں جن کے پاس ایسا علم اور جانکاری ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ باری تعالیٰ! آپ کے وہ بندے کہاں رہتے ہیں؟ مَیں چاہتا ہوں کہ ان کی ملاقات کروں اور ان کی صحبت اختیار کروں اور ان سے وہ علم حاصل کروں جو میرے پاس نہیں ہے۔

علامہ نوویؒ ان آیات کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام خود اتنے اونچے مقام پر تھے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں، آپ کے پاس وحی آتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام اور اسرارِ شریعت کا جو علم آپ کو دیا گیا ہے وہ کسی اور کو اتنا نہیں دیا گیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو باخبر کیا جا رہا ہے کہ ہمارا ایک ایسا بندہ بھی ہے ﴿وَاٰتَیۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا﴾ اس کے پاس ہمارا دیا ہوا ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس بلند و بالا مقام کے باوجود اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مَیں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اور ان کی صحبت میں رہ کر اس علم کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجازت دی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ کے اس بندے سے کہاں ملاقات ہوگی؟ تو ایک جگہ کی نشاندہی کی گئی کہ مجمع البحرین یعنی جہاں دو دریا ملتے ہیں وہاں وہ آپ کو ملیں گے۔

اب یہ دو دریا کون سے ہیں؟ اس سلسلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض

کہتے ہیں کہ بحر فارس اور بحر روم جہاں ملتے ہیں۔ آج کل تو نہر سوئیز کی وجہ سے وہ ملے ہوئے ہی ہیں لیکن اُس زمانہ میں بالکل تو نہیں ملتے تھے، بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب جس مقام پر تھے، اس کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ دریائے دجلہ جہاں بحر فارس میں آکر گرتا ہے وہاں ملاقات ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ خلیج عقبہ بندرگاہِ ایلہ جہاں پر واقع ہے، وہ علاقہ مراد لیا گیا ہے۔

خیر! ایک جگہ بتلا دی گئی، پھر مجمع البحرین جو بتلایا گیا تھا وہ بھی ایک بڑا رقبہ و علاقہ تھا، اس میں خاص طور پر کون سی جگہ پر ان سے ملاقات ہوگی، اس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر علامت دریافت کی کہ کوئی ایسی نشانی مجھے بتلا دی جائے جس کی وجہ سے مَیں یہ معلوم کرلوں کہ مجمع البحرین میں فلاں جگہ پر ان سے ملاقات ہوگی۔ جیسے کسی کو کہا جائے کہ سورت میں ملاقات ہوگی تو وہ پوچھے گا کہ سورت میں کون سی جگہ ہوگی؟

عزم پختہ ہو

خیر! اللہ تعالیٰ کی طرف سے علامت کے طور پر یہ حکم دیا گیا کہ آپ ایک مچھلی تل کر اپنے ساتھ رکھ لیجئے، جس جگہ وہ مچھلی زندہ ہو کر پانی کے اندر چلی جائے، وہیں ہمارے اس بندے سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ چنانچہ بات طے ہوگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مقام سے حضرت خضر کی ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔ جس وقت روانہ ہو رہے تھے اسی موقعہ کا اس آیت کے اندر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنے جس پیغمبرانہ عزم و ارادہ کا اظہار کیا وہ دیکھئے۔ اور پیغمبروں کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور جس کام کا بیڑا اُٹھاتے ہیں تو اس کام میں ان کا عزم

ایسا ہی پختہ ہوتا ہے۔

اس وقت ان کے ساتھ خدمت کے لیے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جانشین بنے، اس وقت ان کو پیغمبری نہیں ملی تھی، اور حضرت موسیٰ کی خدمت میں تھے۔ ان کو بھی اپنے ساتھ لیا اور ان سے حضرت موسیٰ نے کہا کہ مَیں اپنے اس سفر پر برابر چلتا رہوں گا، اپنے اس سفر کے ارادے سے باز نہیں آؤں گا یہاں تک دو دریا جہاں ملتے ہیں وہاں پہنچ جاؤں ﴿أَوْ أَمْضِيَ حُقُباً﴾ یا سالہا سال چلتا رہوں۔ "حُقُب" یہ "حُقُبَةٌ" کی جمع ہے، تیس سال کو کہا جاتا ہے۔ اور "حُقُبَةٌ" جمع ہے، اور عربی میں جمع کا صیغہ کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک سو بیس سال ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چاہے ایک طویل زمانہ تک بھی کیوں سفر کرنا نہ پڑے، تب بھی مَیں وہاں جا کر رہوں گا۔ اس سے **معلوم ہوا** کہ آدمی جب کسی کارِ خیر کا ارادہ کرے اور بیڑا اُٹھائے تو اُس کو اسی طرح پختہ عزم و ارادہ سے کام لینا چاہیے کہ اس کام کو مَیں انجام دے کر ہی رہوں گا۔

اپنی ذات پر اعتماد نہ ہو

خیر! آگے علامہ نووی نے آیتیں چھوڑ دی ہیں جن میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰ روانہ ہوئے اور چلتے چلتے مجمع البحرین والے علاقہ تک پہنچے، اسی علاقہ میں ایک چٹان تھی، اس کے پاس ایک مرتبہ دوپہر کے وقت دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع) آرام کے لیے لیٹے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع سے کہا تھا کہ دیکھو! اس مچھلی کا خیال رکھنا، تو حضرت یوشع نے جواب میں عرض کیا تھا کہ کوئی بڑا کام آپ نے نہیں سونپا ہے۔

دیکھو! کسی بھی کام کو چاہے وہ معمولی سا ہی کیوں نہ ہو، اس کام کی انجام دہی میں جب آدمی اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور اس کے ارادے کی طرف نظر نہیں ہوتی، تو اس صورت میں چھوٹے سے چھوٹا کام بھی آدمی انجام نہیں دے سکتا، اللہ تعالیٰ دنیا کو دکھلاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ ان شاء اللہ کہہ دے تو وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ان کی زبان سے یہ نکلا کہ کوئی بڑا کام آپ نے نہیں سونپا ہے، آپ بے فکر رہیے، یہ کام ہو جائے گا۔ دونوں لیٹے تو ان کو نیند نہیں آئی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سو گئے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اسی چٹان کے پاس آبِ حیات کا چشمہ تھا، اس کے کچھ چھینٹے اس مچھلی کو لگے اور اس میں جان آ گئی اور وہ مچھلی زنبیل میں سے اچھل کر دریا میں کود گئی۔ اور جب دریا میں گری اور آگے بڑھی تو باقاعدہ سرنگ بناتی چلی گئی۔ (بخاری شریف، ۴۴۵۰) یعنی کاغذ وغیرہ کے بیچ میں سے جب کوئی سخت چیز گذرے تو سوراخ بن جاتا ہے، لیکن پانی میں سوراخ نہیں بنتا، بلکہ پانی کا حال تو یہ ہوتا ہے جب کوئی چیز پانی میں ڈالیں، تو جب وہ آگے بڑھے گی تو پانی کا پچھلا حصہ آپس میں ملتا چلا جائے گا، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ یہ دکھلایا کہ جب وہ مچھلی پانی کے اندر داخل ہو رہی تھی تو ساتھ ہی ساتھ پانی میں سوراخ اور سرنگ سی بنتی چلی گئی۔ حضرت یوشع اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو آرام فرما رہے تھے، اس لیے انہوں نے سوچا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، اس لیے بیدار کرنا مناسب نہیں۔ جب بیدار ہوں گے تو ان کو بتا دوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو یہ بتانا ہی بھول گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اس کام کو معمولی سمجھا تھا، حالانکہ جب تک

میری توفیق شامل حال نہ ہو وہاں تک آدمی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گوشمالی

بہر حال! حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ چلو اور آگے بڑھ گئے۔ جب چٹان کے پاس سوئے تھے وہ دوپہر کا وقت تھا، وہاں سے شام تک چلتے رہے، رات کو بھی چلے پھر دوسرے دن جب صبح ہوئی، اور کچھ وقت گذرا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا ﴿اٰتِنَا غَدَآءَ نَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ بھائی! ہمارا کھانا لاؤ، اب تو ہم تھکے اور بھوک کا بھی کچھ احساس ہوا۔ دیکھو! وہاں سے یہاں تک چلتے ہوئے آئے تو تھکن نہیں ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب تک تو بھوک اور تھکن کا احساس نہیں تھا، لیکن جب مقصد سے آگے نکلے اور اتنا آگے بڑھ چکے تب احساس ہوا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتلا دیا کہ تم سب سے زیادہ جاننے کا دعویٰ کر رہے تھے، اور ساتھ میں مچھلی اس لیے لائے تھے کہ جہاں وہ زندہ ہو کر پانی میں گرے گی تو جگہ معلوم ہو جائے گی، لیکن وہ کب زندہ ہوئی اس کا پتہ ہی نہیں چلا، اور جس جگہ کی تلاش میں نکلے تھے اس سے آگے نکل گئے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سب بطورِ سبق بتلایا گیا تھا۔

خیر! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کھانا لاؤ، تو حضرت یوشع نے جواب دیا کہ ارے! بات بتلانا تو بھول ہی گیا، شیطان نے بھلا دیا اور شیطان کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ کام کی بات بھلا دیا کرتا ہے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ تو کہا کہ ہم جہاں لیٹے تھے وہیں وہ مچھلی زندہ ہو کر زنبیل سے نکل کر پانی میں داخل ہو گئی تھی اور عجیب وغریب طریقہ سے اس نے اپنا راستہ پانی میں بنا لیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بھائی! وہیں تو ہمیں

جانا تھا۔ چلو! واپس لوٹتے ہیں۔ اب جس راستہ پر وہ چلے تھے وہ باقاعدہ بنا ہوا راستہ، پگڈنڈی اور سڑک نہیں تھی، اس لیے اپنے پاؤں کے نشانات ہی کو دیکھتے دیکھتے واپس لوٹے۔ گویا آدھا دن اور پوری رات جو چلے تھے اتنا پھر دوبارہ اُلٹا چلنا پڑا، اور مزید مشقت اُٹھانی پڑی۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات

اور جب اسی جگہ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی چادر تانے ہوئے لیٹا ہے۔ چادر کا ایک سِرا سر کے نیچے دبا ہوا ہے اور دوسرا سرا پاؤں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح سونا جائز ہے۔ بعض لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ وہ اس طرح سوئے ہوئے تھے۔

بہرحال! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا، جب حضرت خضر علیہ السلام نے سنا تو سوچا کہ یہاں سلام کیسا؟ اس لیے کہ وہ علاقہ اہلِ ایمان کا نہیں تھا۔ تو حضرت خضر نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مَیں بنی اسرائیل والا موسیٰ ہوں۔ پوچھا: یہاں کیوں آئے ہو؟ کہا: آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰٓ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی صحبت میں رہنے کے لیے ہی گئے تھے، اس لیے پوچھا کہ کیا مَیں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور علم کی جو باتیں آپ کو سکھائی گئی ہیں، وہ آپ مجھے سکھلائیں۔ مَیں آپ کی رفاقت اور آپ کی صحبت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

بس! یہاں تو انہوں نے اس آیت کو اتنی ہی پیش کر کے ختم کر دی ہے۔ آگے قصہ طویل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اتنا سن کر آپ حضرات کو بھی شوق پیدا ہوا ہو، اس لیے اس

قصہ کو مکمل کر دیتا ہوں۔

تکوین

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہ نہیں سکیں گے اور صبر نہیں کر سکیں گے۔ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم آپ کو عطا فرمایا ہے۔ یعنی شریعت کا اور احکام خداوندی کا علم آپ کو دیا ہے کہ بندوں کو کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بندوں کی ہدایت کے واسطے اور زندگی گذارنے کا طریقہ بتلانے کے لیے جو احکام نازل فرماتے ہیں اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ اس کا علم جتنا آپ کے پاس ہے وہ میرے پاس نہیں "وَاِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنَ اللّٰہِ، لا تَعْلَمُہ" اور ایک علم اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے، اور وہ اسرارِ کائنات کا علم ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔

دیکھو! دو چیزیں ہیں ایک تو ہے تکوین اور ایک ہے تشریع۔ تکوین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پوری کائنات؛ زمین و آسمان، چاند و سورج وغیرہ جو کچھ پیدا کیا اور اس میں مختلف مخلوقات کو پیدا کیا، اسی میں انسان کو بھی بسایا اور اس کی ضرورتیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں۔ کائنات کا یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ اور کائنات کے اس نظام کو چلانے کے واسطے اللہ تعالی نے کچھ اصول بھی مقرر کئے ہیں جن کے مطابق یہ نظام چل رہا ہے، اور اس کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کا اسٹاف اور عملہ بھی ہے اور وہ فرشتے ہیں۔ تو اس پوری کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ چلاتے ہیں اور اس سلسلہ میں فرشتوں کو احکام بھی دیتے رہتے ہیں جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ لیلۃ القدر یا بعض مخصوص راتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو فیصلے بتلائے جاتے ہیں۔

اس کی بہت ساری تفصیلات ہیں۔

شیاطین اور تکوینیات

پہلے زمانہ میں جب کہ جن وشیاطین کے لیے راستہ بند نہیں کیا گیا تھا تو وہ آسمانوں پر جا کر جو چیزیں سنتے تھے وہ یہی ہدایات ہوتی تھیں۔ جیسے بادشاہِ وقت کی طرف سے اپنے ماتحتوں کو ہدایات دی جاتی ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو کائنات کے نظام کے سلسلہ میں ہدایات دی جاتی تھیں، اسی کو سننے کے لیے شیاطین آسمانوں پر جایا کرتے تھے اور سنتے تھے، تو بعض باتیں ان کے کانوں میں پڑ جاتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا گیا اور ان کو ستارے مارنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے جب یہ جاتے تھے تو ان کو ستارے مار کر اور میزائل داغ کر وہاں سے بھگایا جاتا تھا، لیکن ایک آدھ بات ان کے کان میں پڑ جاتی تھی۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فلاں جگہ فلاں تاریخ کو سیلاب لانا ہے، یا زلزلہ لانا ہے۔ اب یہ بات ان کے کان میں پڑ گئی تو اس سے پہلے کہ وہ میزائل نما ستارہ اس کو لگے، وہ اپنے نیچے والے شیطان کو بتا دیتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نیچے والے کو بتانے سے پہلے ہی وہ ستارہ اس کو آ کر لگتا تھا، گویا ان کی ساری کوشش بے کار جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ جلدی سے نیچے والے کو بتا دیتا تھا اس کے بعد وہ ستارہ اس کو لگتا تھا۔ یہ تو بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے۔ (بخاری شریف، ٥٤٢٩)

خیر! کبھی وہ نیچے والے کو بتا دیتا تھا، پھر وہ اس کے نیچے والے کو، اور وہ اپنے نیچے والے کو بتاتا، اس طرح آتے آتے اخیر والا اپنے دوست کاہن اور جوتشی کو وہ بات بتاتا تھا۔ اب یہ ایک ایسی بات ہے جو کائنات کے نظام کے متعلق اوپر ہی سے آئی ہوئی

ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس زمانہ کی مصلحتوں کی وجہ سے اتنی پابندی بھی نہیں تھی اس لیے وہ اوپر سے یہ بات گویا چرالایا کرتے تھے۔ اور وہ واقعہ تو ہونا ہی تھا، اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا۔ جب وہ بات کاہن کے پاس پہنچتی تو وہ کاہن لوگوں کو کہتا کہ فلاں دن دنیا میں یہ واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اب وہ بات تو سچ ہوتی تھی اور ایسا ہی واقعہ ہوتا تھا۔ تو پھر وہ کاہن ایک سچی بات کے سہارے سے اپنی سو جھوٹی باتیں لوگوں میں چلاتا تھا۔ اس لیے کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ فلاں دن فلاں تاریخ کے متعلق اس نے یہ پیشین گوئی دی تھی اور وہ بات ٹھیک اسی طرح وجود میں آئی تھی، تو سوچتے ہیں کہ اس کی بات میں کچھ وجود معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی دوسری باتیں بھی لوگ سچ مان لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہی ارشاد حدیث میں نقل کیا گیا ہے۔

بہر حال! میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مقرر کیا ہے اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق اس کائنات کو چلاتے ہیں؛ اسی کو اصطلاح میں تکوین کہتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جو ہدایتیں دی جاتی ہیں؛ اسی کو تکوینیات کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کا ایک کارخانہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ سے چل رہا ہے دنیا کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ حکم کے بغیر نہیں چلتی۔

تشریع

اور دوسری چیز تشریع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسانوں کی ضرورت پوری کرنے کے واسطے پیدا کیا ہے، اور انسانوں کو اپنی عبادت واطاعت اور فرمانبرداری کے واسطے پیدا کیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ انسانوں کو

ان چیزوں سے واقف کرانا چاہتے ہیں کہ کون سے کام کروگے تو اس سے میں خوش ہوؤں گا اور کون سے کام کروگے تو میں ناراض ہوجاؤں گا۔ان ساری تفصیلات کوتشریع کہا جاتا ہے۔اوراس بارے میں بندوں کواختیار دیا کہ وہ چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ایسانہیں ہے کہ کرنے کا کوئی کام اگرکوئی نہیں کرے گا تو اس کی وجہ سے وہ آدمی گونگا، اندھا یا بہرا ہو جائے گا، یا اس کو بخار آجائے گا۔ایسانہیں ہوتا۔اوراسی میں تو بندوں کا امتحان ہے۔

خیر! تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ شریعت کے احکام کو بتلانے کے لیے باقاعدہ اپنے بندوں کو بھیجا، جن کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔اوران تک وہ احکام پہنچانے کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا۔وحی شریعت کے احکام کو بتانے کے لیے نازل ہوتی تھی۔

تو یہ دو چیزیں۔تکوین اورتشریع۔الگ الگ ہوئیں۔اب تکوین تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو چل رہا ہے، اس سے انسانوں کو کوئی واسطہ نہیں ہے، انسانوں کی ضرورتیں مختلف طریقہ سے پوری ہورہی ہیں۔اورانسانوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اس اس طریقے سے زندگی گذارو۔انہی طریقوں کا نام تشریعی احکام ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات کا علم دیا گیا تھا

اب تکوینی نظام کے سلسلہ میں کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نظام میں زیادہ تر فرشتوں کو لگا رکھا ہے، لیکن انسانوں میں سے بھی اپنے بعض مخصوص بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی نظام سے متعلق ہدایتیں دی جاتی ہیں۔حضرت خضر علیہ السلام انہیں بندوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تکوینیات یعنی کائنات کے بھیدوں سے واقف کیا تھا اوران کے متعلق ان پر وحی آتی تھی۔ویسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

انسانوں پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ تشریعی احکام کے متعلق نازل ہوا کرتی ہے، لیکن حضرت خضر علیہ السلام کے اوپر جو وحی آتی تھی اس میں کائنات کے متعلق احکام نازل کیے جاتے تھے۔ یہ خاص علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا تھا۔

کامیابی تکوینیات کے علم پر موقوف نہیں

لیکن ایک بات یاد رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جو علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا وہ تو ایسا تھا کہ اس پر جب کوئی آدمی عمل پیرا ہو تو اس کی دنیا بھی بن جاوے اور آخرت بھی بن جاوے۔ گویا کامیابی اور ناکامی کا مدار اسی پر ہے۔ جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو کائنات کے رازوں اور بھیدوں کا جو علم دیا گیا تھا، وہ ایسا نہیں تھا جس پر کامیابی اور ناکامی کا مدار ہو۔ جیسے آج ہم یہاں بیٹھے ہیں، ایک آدمی کو ہم نے دیکھا جو بہت شریف سا ہے، لیکن اچانک پولیس آئی، اس کی پٹائی کی اور اس کو پکڑ کر لے گئی۔ ہم اس آدمی کے حالات سے واقف ہیں کہ بڑا شریف ہے، اور کبھی کوئی جرم اس نے نہیں کیا، کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، اس لیے یہ معاملہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، ہمارا دل اس کو قبول ہی نہیں کرتا۔ اور قدرت کی طرف سے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کروایا جارہا ہے، اس کا راز ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے علم میں ہی نہیں آسکتا، یہ کائنات کے رازوں میں سے ایک چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ لیکن مان لو کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ذریعہ سے ہم کو بتا دیا جائے کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے ہوا ہے۔ تو جب نہیں جانتے تھے تو کیا نقصان ہوا؟ اور اب جان لیا تو ہمارا دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تو کائنات کا ایک نظام ہے جو چل رہا ہے۔ اگر اس نظام کے اندرونی بھیدوں سے ہمیں واقفیت نہیں

ہے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اور اگر واقف ہو جائیں گے تو ہمارا دنیا اور آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمارا جو کچھ بھی فائدہ اور نقصان ہے اس کا تعلق تو شریعت کے احکام سے ہے۔ شریعت کے احکام کو جانیں اور اس پر عمل کریں تو فائدہ ہے۔ اگر نہیں جانیں گے اور چھوڑ دیں گے تو اس میں نقصان ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شریعت کا علم دیا گیا تھا جس پر انسانوں کی کامیابی اور ناکامی کا مدار تھا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کو کائنات کے اسرار کا علم دیا گیا تھا جس پر کسی کامیابی اور ناکامی کی بنیاد نہیں تھی۔ ہاں! اگر جان لیں تو بعض چیزوں میں ہمیں جو اشکال رہتا ہے، وہ دور ہو جائے۔ جیسے اسی واقعہ میں آرہا ہے۔

آپ سے ضبط نہ ہو سکے گا

تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "وَاِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنَ اللّٰہِ، لَا تَعْلَمُہٗ" اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک علم دیا ہے جو میں پورا نہیں جانتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک علم دیا جو آپ پورا نہیں جانتے۔ حضراتِ انبیاء کو بھی کائنات کے رازوں سے واقف کیا جاتا ہے لیکن اتنی تفصیل سے نہیں جیسا کہ اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: ﴿اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا﴾ آپ میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکو گے۔ اس لیے کہ جو چیز پیش آرہی ہے اس کے اندر کے بھید سے تم واقف نہیں ہو گے، تو آپ سے ضبط نہیں ہو سکے گا۔ اس کا ظاہری حال ایسا ہوگا جس سے آپ بے چین ہو جائیں گے، اور آپ غیر اختیاری طور پر اعتراض کر بیٹھیں گے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال تو تھا ہی نہیں کہ آگے کیسے خطرناک معاملات پیش آنے والے ہیں، اس لیے انہوں نے کہہ دیا ﴿سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا

وَّلاأَعْصِیْ لَکَ أَمْراً﴾ آپ مجھے صابر پائیں گے اور کسی بات میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ کرلیا۔

سفر شروع ہوا

اب ان تینوں کا قافلہ دریا کے کنارے کنارے آگے چلا، اتنے میں دیکھا کہ ایک کشتی ہے تو ان حضرات نے ان کشتی والوں سے گفتگو کی کہ ہمیں سوار کرلو۔ بخاری شریف میں ہے کہ کشتی والوں نے حضرت خضر کو پہچان لیا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں اس لیے انہوں نے ان سب کو مفت میں سوار کرلیا۔ یہاں پر مَیں مولویوں سے کہا کرتا ہوں کہ مفت کی سواری تو ہمارے لیے پرانے زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ خیر! انہوں نے کہا کہ آپ سے کرایہ نہیں لیں گے اور مفت سوار کرالیا۔

کشتی میں سوار ہونے کے بعد دیکھا کہ ایک چڑیا کشتی کے کنارے بیٹھی ہے اور اس نے اپنی چونچ ڈبوئی، تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس چڑیا نے اپنی چونچ ڈبو کر دریا میں سے جتنا پانی لیا ہے، اس کی جو حیثیت پورے دریا کے مقابلہ میں ہے، اتنی حیثیت بھی میرے تمہارے اور سارے عالم کے تمام انسانوں کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی چونچ میں جو پانی آیا ہے وہ بھی محدود اور دریا کا پانی بھی محدود ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم غیر محدود ہے۔

تختہ توڑ دیا

اس کے بعد تھوڑا آگے چلے تھے کہ اچانک حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی کا ایک تختہ توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ توڑ دیا تو ان کو اپنا وہ وعدہ، شرط اور جو ایگریمنٹ (Agreement) ہوا تھا وہ یاد نہیں رہا۔ داخلہ کی جو شرط ہوئی تھی؛ یاد

نہیں رہی۔

یہاں مَیں ہمارے طلبہ سے کہا کرتا ہوں کہ مدرسہ میں داخلہ کی جو شرطیں لگائی جاتی ہیں کہ یوں کرنا پڑے گا اور توں کرنا پڑے گا، یہ قرآن سے ثابت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علم حاصل کرنے ہی تو گئے تھے اور حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ رکھنے کی جو منظوری دی تھی اس میں یہ شرط لگائی تھی کہ اس طرح رہنا پڑے گا کہ کوئی اعتراض نہ ہو۔

خیر! ان کو وہ شرط یاد ہی نہیں رہی اور ایک دم بے خیالی میں بول پڑے کہ یہ کیا کیا؟ یہ تو آپ سب لوگوں کو ڈبا دینے کا کام کر رہے ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان لوگوں نے ہمیں مفت سوار کر کے ہمارے ساتھ احسان کیا، اس کا بدلہ دینے کے بجائے آپ تو اُلٹی بات کر رہے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آ گیا کہ اوہو! مَیں نے شرط منظور کی تھی، فوراً کہا: ﴿لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ أَمْرِیْ عُسْرًا﴾ مَیں بھول گیا تھا (اور واقعتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول ہی گئے تھے کہ یہ شرط ہوئی ہے اور غیر اختیاری طور پر یہ چیز زبان سے نکلی تھی) اس پر میری پکڑ مت کرو، پہلی بھول پر کوئی بھی پکڑ نہیں کرتا اور میرے معاملہ میں تنگی نہ ڈالو۔ یعنی اگر آپ میری اس بھول کی وجہ سے اپنی صحبت سے الگ کر دیں گے تو یہ میرے لیے تنگی والی بات ہو جائے گی۔ خیر! حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

یہ کیا کیا؟

آگے بڑھے اور کشتی سے اترے۔ ایک بستی کی طرف جا رہے تھے، بستی کے

باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک حسین اور خوبصورت چھوٹے بچہ کو (جو دیکھنے میں بھی بڑا ذہین معلوم ہوتا تھا) پکڑ کر اس کی گردن کاٹ کر مار ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بول پڑے ﴿لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا﴾ یہ کیا کیا؟ یہ تو بہت خطرناک کام کیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے پھر وہی بات کہی کہ مَیں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ﴿إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي﴾ اگر اس کے بعد کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔

دیکھو! اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ مَیں بھول گیا، اس لیے کہ دوسری مرتبہ جو اعتراض کیا تھا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا وعدہ یاد تھا لیکن یہ کام ہی ان کی نگاہوں میں ایسا خطرناک تھا کہ وعدہ یاد ہوتے ہوئے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی شخصیت خاموشی اختیار نہ کرسکی۔ فوراً بول پڑے۔ اور اسی لیے معذرت کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ مَیں بھول گیا، بلکہ مزید ایک مہلت مانگی کہ اگر اب سوال کروں تو مجھے الگ کردینا۔

جدائی کا وقت آ گیا

خیر! آگے بڑھے، اور ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں اور بھوکے بھی ہیں، ہماری میزبانی کرو۔ ان لوگوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی بستی میں سے گذر رہے تھے کہ ایک بڑی لمبی چوڑی دیوار کو دیکھا جو جھکی ہوئی تھی اور گرنے کے قریب تھی، کوئی بھی آدمی اس کے پاس سے گذرتا تو ڈر کے مارے دور دور سے گذرتا تھا کہ کہیں گر نہ جائے۔ حضرت خضر نے چن کر اس کو سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

کہا کہ اس بستی والوں نے تو ہماری میز بانی بھی نہیں کی، ان کی ذمہ داری تھی کہ ہماری میز بانی کرتے کہ ہم بھوکے اور مسافر تھے، لیکن انہوں نے وہ تو کیا نہیں، اور آپ نے ان کے ساتھ احسان کیا؟ اگر آپ چاہتے تو ان سے اجرت کا مطالبہ کرتے، اور جو اجرت ملتی اس سے ہمارا کام بھی بن جاتا کہ کھانے کو مل جاتا، یا کم سے کم اجرت میں کھانا ہی لے لیتے؟ تو حضرت خضر نے کہا ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ﴾ بس! یہ تیسری مرتبہ اعتراض کیا، اب ہماری اور تمہاری جدائی کا وقت ہے۔ اور اب مَیں آپ کو بتلا دیتا ہوں کہ ان تین باتوں کی وجہ کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش! حضرت موسیٰ اور تھوڑا صبر کرتے تو ہمیں کائنات کے اور زیادہ راز معلوم ہوتے۔

عین احسان شناسی

خیر! پہلی بات کے متعلق بتلایا کہ دیکھو! وہ کشتی غریب بھائیوں کی تھی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ کل دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپاہج تھے، کمانے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے، اور دوسرے پانچ بھائی اس کشتی میں کام کرتے تھے، مسافروں کو اِدھر سے اُدھر لے جاتے تھے اور سامان ڈھوتے تھے، اور جو کچھ کماتے تھے اسی میں سے ان کا گذران چلتا تھا۔ حضرت خضر نے کہا یہ ان بے چاروں کی کشتی تھی اور اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ اور آگے جہاں یہ جا رہے تھے اس علاقہ کا حاکم بڑا ظالم تھا، جو کشتی بھی اچھی حالت میں ہوتی اس کو وہ چھین لیا کرتا تھا، اور ان غریبوں کی کشتی بھی بہت اچھی اور ٹوپ (Top) کنڈیشن میں تھی، اور اس کی عادت کے مطابق اگر وہ اس کشتی کو دیکھتا تو ضرور چھین لیتا۔ مَیں نے یہ تختہ اس لیے اُکھاڑ دیا تھا کہ وہ اگر دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ کشتی اچھی نہیں ہے۔ اس طرح ان کی کشتی بچ جائے گی،

اس طرح ان بے چاروں کا ذریعۂ معاش باقی رکھنے کی مَیں نے کوشش کی تھی دیکھنے میں تو آپ کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ان کے ساتھ احسان فراموشی کا معاملہ کیا، لیکن حقیقت میں یہ احسان شناسی والی بات تھی۔ اندر کا بھید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اشکال ہوا۔ ہم اور آپ بھی جب یہ حقیقت سنتے ہیں تو ہمارا بھی سارا اشکال دور ہو جاتا ہے۔

دوسرا راز

خیر! پھر دوسرے واقعہ کے متعلق کہا کہ اس بچہ کے والدین مؤمنین میں سے صالح اور اللہ کے نیک بندے تھے، اور یہ بچہ آگے جا کر ان کی نافرمانی کرتا، کفر اختیار کرتا اور اپنے ماں باپ کو تکلیف پہنچاتا۔ اور ہو سکتا تھا کہ اس بچہ کی محبت میں والدین بھی کفر کی طرف مائل ہو جاتے، تو اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہوا کہ اس بچہ کے بدلہ ان کو اور کوئی اولاد دے، اس لیے وحی کے ذریعہ مجھے حکم دیا گیا کہ اس کو ختم کر دو۔ الہام کے ذریعہ نہیں بلکہ باقاعدہ وحی کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کا حکم ملا اس لیے اس کو قتل کر دیا گیا روایتوں میں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک صالح لڑکی دی اور اس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوئے۔

نیکی کی برکت، پشتہا پشت تک

اور تیسرے نمبر کے متعلق بتلایا کہ دیوار دراصل دو یتیم بچوں کی تھی، اور اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور یہ دونوں ابھی چھوٹے تھے، اگر یہ دیوار گر جاتی تو خزانہ کھل جاتا، اور لوگ اس کو لوٹ لے جاتے۔ اور یہ دونوں بچے ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ اس خزانہ کو سنبھال سکیں۔ اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔

اس جگہ پر مفسرین نے لکھا ہے کہ ماں باپ کی نیکی اولاد تو کیا، بلکہ اولاد کی

اولاد اور اس اولاد کی اولاد، اس طرح پشتہا پشت تک کو کام آتی ہے۔ بلکہ اہلِ خاندان اور اہل محلّہ اور اہلِ قریہ کو کام آتی ہے۔اللہ والوں کی موت پر سب کو صدمہ کیوں ہوتا ہے؟ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ان کے وجود سے ہمیں بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔

حضرت شبلیؒ جو بڑے بزرگوں میں سے ہیں انہوں نے کہا کہ دیکھو! میرے مرنے کے بعد تم کو میری قدر ہوگی اور تمہیں پتہ چلے گا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بغداد میں رہتے تھے، جب انتقال ہوا، اس کے دوسرے ہی روز دشمن قبیلے والوں نے بغداد پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ بغداد والے کہتے تھے کہ ہم کو تو دوہرا غم ہوا، ایک شبلی کی وفات کا اور دوسرا دشمن کے حملہ کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو نیکی اختیار کرنی چاہیے۔

اولاد کے لیے کیا فکر کریں؟

آج کل لوگ یہ سوچتے ہیں کہ میرے بعد میری اولاد کا کیا ہوگا؟ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بہت ساری تدبیریں سوچی جاتی ہیں کہ میں کس طرح مال جمع کروں اور کتنا بینک بیلنس بڑھاؤں، کتنی جائیدادیں ان کے لیے مہیا کروں، مکانات تیار کروں، زمینیں خرید لوں اور ان کے لیے دکان وفیکٹری بنالوں۔ یہ ساری چیزیں سوچی جاتی ہیں۔ حالانکہ پتہ ہی نہیں کہ یہ سب بنانے والے کی زندگی تک بھی باقی رہتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر باقی رہیں تو آئندہ اس سے ان کو فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ کسی کی بڑی سے بڑی فیکٹری ہو، لیکن کاروبار ہی نہ چلے، تو آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ فیکٹری ہونے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی فیکٹری دردِ سر بن جاتی ہے۔ گویا ہاتھی پال رکھا ہے جو زیادہ مصیبت بن جاتا ہے۔ تو آدمی یہ ساری چیزیں سوچتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتا کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور نیکی کی راہ اختیار کروں اور اللہ کے

نیک بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں۔ آدمی اگر نیک بنے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس کی اولاد اور اس کی پشتہا پشت کی حفاظت کرے گا۔

بعض لوگوں نے یہاں ایک ضعیف روایت بیان کی ہے ﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾ ان کا باپ یعنی ان کی ساتویں پشت پر جو آتا تھا وہ نیک وصالح تھا، اس کی نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان بچوں کے خزانے کی حفاظت فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ کہف)

اسی لیے آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرے اور یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ضائع نہیں کرے گا۔ نہ ان کو ضائع کرے گا اور نہ ان کے پسماندگان اور متعلقین کو ضائع کرے گا۔ بس یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو ضائع نہ کیجیے۔

یہ ہمارا موضوع نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت خضر نے کہا کہ ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ ان کا خزانہ ضائع ہو جائے، جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو خود اس خزانے کو نکال لیں گے۔ اس طرح حضرت خضر نے تینوں کام کی علتیں بتلا دیں کہ یہ کائنات کے راز ہیں۔

تکوینیات کا حال یہی ہوتا ہے کہ ایک چیز دیکھنے میں ہمیں بظاہر بہت اُلٹی معلوم ہوتی ہے اور ہمارے دل میں اعتراض ہوتا ہے۔ لیکن دیکھو! کوئی آدمی اگر ہمارے کسی معمولی سے فعل پر ذرا سا اعتراض کر دے تو ہمارا دماغ خراب ہو جاتا ہے، مزاج بگڑ جاتا ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی دنیا میں وجود میں آ رہا ہے اس پر آدمی کو کبھی دھیان دینا ہی نہیں چاہیے۔ یہ ہمارا کام ہے ہی نہیں۔ ہمیں تو صرف یہی کہنا چاہیے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، وہ علیم وقدیر ہے

اور حکیم و خبیر ہے، سب کچھ اس کی حکمت کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ اس لیے آدمی کو کبھی اس طرف دھیان دینا ہی نہیں چاہیے۔ ورنہ یہ معاملہ کبھی آدمی کے ایمان کے ختم ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ایک خان صاحب کا واقعہ

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک خان صاحب اپنے وطن سے بھاگ کر چلے آئے اور راجپوتانہ کے علاقہ میں کسی زمین دار کے یہاں ملازم ہوگئے۔ وہ خانصاحب تھے، ان کی وجہ سے زمین دار کو بھی اچھی خاصی مدد ہوگئی، وہی اس کی ساری جائیداد کی حفاظت کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس علاقہ میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا اور خانصاحب کے سر الزام آیا تو ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ کیس چلا اور خانصاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ انگریز کے زمانہ کا قصہ ہے۔ اس زمانہ میں لندن میں پرائیویٹ کونسل ہوتی تھی، وہاں تک کیس لڑا جاتا تھا۔ جب ان کو پھانسی کی سزا ہوئی تو ان کے مالک اور آقا نے کہا کہ آپ بےفکر رہو، میں آپ کا کیس اوپر تک لڑوں گا۔ ان خانصاحب نے کہا کہ حضور! آپ کا احسان ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ کو کیس لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آقا نے کہا کہ تم بےقصور ہو اور تمہیں سزا ہوئی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قتل کے معاملہ میں مجھے جو گرفتار کیا گیا ہے، وہ مَیں نے نہیں کیا ہے۔ لیکن مَیں اپنے علاقہ میں ایک بےقصور کو قتل کرکے وہاں سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی سزا کا یہ انتظام کیا گیا ہے۔ مجھے اسی دنیا میں اس کی سزا بھگت لینے دو، تاکہ آخرت کے وبال سے بچ جاؤں۔ اس لیے میری آپ سے

درخواست یہی ہے کہ میرا کیس آگے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تبصرے نہ کریں

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے حالات تو دیکھتے نہیں، اپنے اعمال کی درستگی کا اہتمام نہیں کرتے، اور قدرت کے جو واقعات پیش آتے ہیں اس پر تبصرے کرتے رہتے ہیں، اور ان تبصروں میں نعوذ باللہ کبھی ایسے جملے زبان سے نکال دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتراض لازم آتا ہے۔ اس لیے ایسی چیزوں سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

وہ مالک ہے جو چاہے کرے

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا یہ واقعہ قرآنِ پاک میں ذکر کر کے آنے والی دنیا کو خاص طور پر یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ دیکھو! کائنات میں جو واقعات پیش آتے ہیں کہ ان کی ظاہری شکل وصورت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو جب اندر کا حال معلوم نہیں تھا تو اعتراض پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے اعتراض اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت خضر پر کیا تھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اگر چہ حضرت خضر علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کیا تھا۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن میں بظاہر اعتراض کی چیز نظر آتی ہے، لیکن جب اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، جیسے آج جب ہم نے بھی سنا اور اندر کا حال معلوم ہوا تو سارا معاملہ برابر معلوم ہوا۔ اسی لیے دنیا میں جب بھی کوئی چھوٹا یا بڑا معاملہ پیش آوے اور اس میں ظاہری اعتبار سے چاہے کیسا ہی معلوم ہوتا

ہو، لیکن ایک مؤمن کی ایمانی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کبھی کوئی اعتراض کا تصور بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ چیز آدمی کے لیے بڑی خطرناک ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے ﴿لَا یُسْـئَـلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا۔ ہاں! لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ اور وہ تو مالک ہے جو چاہے کرے۔

بلکہ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ چلو مان لو کہ کوئی قصور نہیں ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے پٹوادیا تو آخر اللہ تعالیٰ تو اس کے خالق اور مالک ہیں، اس کے ساتھ جو چاہیں معاملہ کریں۔ جیسے ہماری ایک گھڑی ہے جس کو ہم نے پھینک دی، اب کوئی آکر ہم سے پوچھے کہ اتنی قیمتی گھڑی تھی، اس کو آپ نے پھینک دی، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ہمارا اور آپ کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ مَیں اس کا مالک ہوں، تجھے کہنے کا کیا حق ہے؟ حالانکہ ہماری مالکی کی کیا حیثیت ہے، حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اس کے خالق تو ہم ہیں ہی نہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ کو اسی مناسبت سے لائے ہیں۔ آج وقت بھی بہت ہو چکا ہے، یہیں بات کو ختم کرتے ہیں۔

زِيَارَةُ أَهْلِ الْخَيْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ

نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

١١/ربیع الاول ١٤٢٠ھ ٢٦/جون ١٩٩٩ء

گذشتہ مجلس میں ایک عنوان قائم کیا تھا جس میں علامہ نوویؒ نے فرمایا تھا کہ جو نیک لوگ ہیں ان کی ملاقات، ان کی ہم نشینی، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا اور ان سے محبت کا تعلق رکھنا، اور ان سے درخواست کرنا کہ وہ آپ کے یہاں آئیں یا ان سے دعا کی درخواست کرنا۔ اس سلسلہ میں سورۂ کہف کی ایک آیت ذکر کی تھی اس کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ آج یہاں سورۂ کہف ہی کی ایک دوسری آیت کو عنوان کی مناسبت سے پیش کر رہے ہیں۔

......تب سوچیں گے

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ﴾ مکہ مکرمہ کے رئیس اور سردار قسم کے لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کی باتیں سننے کے لیے آپ کی مجلس میں آنا تو چاہتے ہیں، لیکن کیسے آویں کہ آپ کی مجلس میں معمولی قسم کے لوگ جن کو ہمارے معاشرہ اور سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں وہ آکر بیٹھتے ہیں، ایسے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے پاس آکر بیٹھنا ہمیں اپنے مقام سے کم تر معلوم ہوتا ہے، اس میں ہم اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی باتوں کو سنیں اور آپ جس دعوت کو پیش کر رہے ہیں اس کی طرف توجہ کریں تو اس کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کی مجلس میں آتے ہیں ان کو آپ اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دیں۔ یا پھر آپ ہمارے لیے الگ مجلس قائم کریں کہ اس مجلس میں ہم ہی ہم ہوں، یہ معمولی قسم کے لوگ اس میں نہ ہوں، تو اس صورت میں ہم آپ کی باتیں سنیں گے اور آپ کی دعوت کی طرف توجہ کریں گے، اور

اس کو قبول کرنے کے معاملہ میں غور کریں گے اور سوچیں گے۔

ایسا نہیں ہوگا

نبی کریم ﷺ کو اس بات کا خیال رہتا تھا کہ مَیں اپنی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچاؤں۔ اور ایسے بڑے لوگ جن کے متعلق یہ توقع اور امید ہو کہ اگر وہ ایمان لے آئیں، اور ہماری دعوت پر لبیک کہیں تو ان کی وجہ سے ہماری دعوت کو زیادہ فروغ ہوگا اور دوسرے لوگ بھی ان کے مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے ہماری دعوت کی طرف مائل ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کو لگن تھی کہ میری بات تمام لوگوں تک پہنچ جائے اور لوگ اس کی طرف توجہ کریں۔ خود باری تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی یہ شان بیان فرمائی ہے ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں اس بات پر افسوس میں کہ وہ آپ کی بات پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ تو اس کی وجہ سے ہوسکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ ان کی اس بات کی طرف مائل ہو جاتے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت نازل فرمائی کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو روکے رکھیے، اپنے آپ کو مقید کر لیجئے ان لوگوں کے ساتھ جو صبح اور شام اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہتے ہیں، اس کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو لگائے رکھیے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرما کر ان لوگوں کی طرف سے جو فرمائش کی گئی تھی اس کا جواب دے دیا کہ تم لوگ نبی کریم ﷺ کی باتیں سننا چاہتے ہو تو تم جس طرح چاہتے ہو اس طرح نہیں، بلکہ مجلس میں جو لوگ آتے ہیں، جن کا مقصود

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی ہوا کرتا ہے، ایسے لوگوں کو اس مجلس سے نکالا اور ہٹایا نہیں جائے گا، ان کی موجودگی میں انہیں کے دوش بدوش بیٹھ کر حضور ﷺ کی باتیں سننا منظور ہے تب تو ٹھیک ہے، باقی تم لوگ جو یہ چاہتے ہو کہ تمہارے لیے الگ مجلس قائم کی جائے؛ تو ایسا نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کو صحبتِ صالحین کا حکم

خیر! یہ تو اس آیت کا شان نزول ہوا۔ یہاں علامہ نوویؒ نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ایک خاص بات بیان کی تھی کہ جو لوگ نیک اور صالح ہوں ان کی ملاقات کے لیے جانا، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنا۔ تو اس آیت کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات تو کسی کی صحبت کی محتاج نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو خاص طور پر تاکید فرمائی کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو مقید کر دیجیے، پابند بنائیے اور اپنے آپ کو بٹھائیے ان لوگوں کے پاس جو اللہ تعالیٰ کو صبح وشام خالص اسی کو راضی کرنے کے لیے پکارتے ہیں۔

گویا علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت سے یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم ﷺ کو تاکید کی گئی کہ آپ کو بھی اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے، تو اس سے اس بات کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ جو صلحاء اور نیک لوگ ہیں ان کی ملاقات اور ان کی ہم نشینی، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنا؛ یہ کتنا ضروری اور اہم ہے۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں احادیث پیش کرتے ہیں:-

اُمِ اَیمن نے شیخین کو رُلا دیا

۳۶۰۔وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ أَبُوبَكْرٍ رضی اللہ عنہ لِعُمَرَ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: اِنْطَلِقْ بِنَا اِلَى أُمِّ أَيْمَنَ رضى الله عنها نَزُوْرُهَا كَمَا كَانَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا، فَلَمَّا انْتَهَيَا اِلَيْهَا، بَكَتْ، فَقَالَا لَهَا: مَا يُبْكِيْكِ؟ أَمَا تَعْلَمِيْنَ أَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسولِ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَتْ: اِنِّي لَا أَبْكِي اِنِّي لَا أَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَاللّٰهِ تَعَالٰى خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَلٰكِنْ أَبْكِي أَنَّ الْوَحْيَ قَدِانْقَطَعَ مِنَ السَّمَآءِ، فَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَآءِ، فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چلیے! ہم لوگ حضرت ام ایمنؓ کی زیارت کے لیے جائیں جیسے نبی کریم ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب یہ دونوں ان کے پاس پہنچے تو وہ رونے لگیں۔ انہوں نے کہا: کیوں روتی ہو؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالی کے پاس جو ملا ہے وہ یہاں سے بہتر ہے؟ انہوں نے کہا: میں اس لیے نہیں روتی۔ مجھے یہ بات معلوم ہے۔ لیکن مَیں اس لیے روتی ہوں کہ آسمان سے وحی اترنے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ سو ان کو بھی رونے پر ابھارا اور وہ دونوں بھی ان کے ساتھ رونے لگے۔

افادات: حضرت ام ایمنؓ نبی کریم ﷺ کے والدِ محترم حضرت عبداللہ کی باندی تھیں، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے میراث میں جو چیزیں چھوڑی تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں۔ گویا یہ اس طرح آپ کی ملک میں آئی تھیں پھر آپ ﷺ نے ان کو آزاد کیا تھا، نبی کریم ﷺ کو انہوں نے بچپن میں کھلایا تھا، آپ ﷺ کو دودھ تو حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے پلایا تھا لیکن حضرت ام ایمنؓ نے آپ ﷺ کو کھلایا تھا۔ کھلائی ہوتی ہیں۔ یہ بچپن میں نبی کریم ﷺ کو سنبھالتی اور خیال رکھتی تھیں، نبی کریم ﷺ ان کا بڑا احترام

کرتے تھے، اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتے تھے جو ایک ماں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حضرت اُم اَیمن کا ناز

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ یہ بھی کبھی نبی کریم ﷺ کے سامنے اسی طرح اڑ جاتی تھیں جیسے ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ کرتی ہے۔ انصار کی عادت یہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس خمس کا مال زیادہ نہیں آتا تھا اور فتوحات کی کثرت نہیں ہوئی تھی، اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مہمانوں کی آمد ورفت اور لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا، اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے مال کی ضرورت ہوتی تھی تو جو حضرات انصار باغات والے تھے، وہ اپنے باغات میں سے کچھ درخت نبی کریم ﷺ کے لیے مخصوص کر دیا کرتے تھے، اور آکر عرض کر دیتے کہ یارسول اللہ! یہ پانچ درخت آپ کے لیے ہیں یعنی اس میں جو کھجوریں اتریں گی، وہ آپ اپنے استعمال میں لائیں۔ نبی کریم ﷺ اس کو قبول فرما لیا کرتے تھے، لیکن غزوۂ بنو نضیر اور غزوۂ بنو قریظہ کے بعد ان کے جو باغات مالِ غنیمت کے طور پر ملے، ان میں سے نبی کریم ﷺ کو بھی بہت کچھ ملا، تو اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے وہ درخت جو حضراتِ انصار کی طرف سے عاریۃً استعمال کرنے کے لیے آپ کو دئے گئے تھے، وہ سب واپس کر دئے۔ اسی طرح حضراتِ انصار مہاجرین کو بھی درخت دیا کرتے تھے، تو مہاجرین نے بھی ان کو واپس کر دئے۔

بنو نضیر کا جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خصوصی اختیارات دیئے تھے اور آپ ﷺ نے بنو نضیر کی طرف سے ملنے والی جائیدادیں اور باغات زیادہ تر مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیئے تھے، انصار میں سے دو چار جو زیادہ حاجت مند تھے ان کو بھی دیا گیا تھا، لیکن زیادہ تر مہاجرین کو دیا گیا تھا۔ اس موقع پر

مہاجرین نے بھی -انصار کی طرف سے جو تعاون ہوتا تھا- شکریہ کے ساتھ ان سے معذرت کر دی کہ اب ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس وقت اعلان فرمایا تھا کہ جن کے جو درخت ہیں وہ آ کر ہم سے واپس لے لیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے بھی کچھ درخت نبی کریم ﷺ کے استعمال کے لیے حضور کی خدمت میں عاریۃً پیش کئے تھے۔ جب حضور کی طرف سے یہ اعلان ہوا تو اس کی واپسی کے لیے گھر والوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے جو درخت نبی کریم ﷺ کو استعمال کے لیے دیئے تھے، حضور نے وہ درخت حضرت ام ایمنؓ کو استعمال کے لیے عنایت فرمائے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں پہنچا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ام ایمن کو بلایا اور کہا کہ ان کے درخت واپس کر دو۔ انہوں نے کہا کہ میں واپس نہیں کرتی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ام ایمن میرے گلے میں کپڑا ڈال کر کھینچنے لگیں اور فرمانے لگیں کہ میں نہیں دینے والی ہوں، میں نہیں دینے والی ہوں۔ نبی کریم ﷺ ان کو جواباً کہنے لگے کہ آپ دے دیجیے، ہم آپ کو اس کے بدلہ میں ڈبل دیں گے، تین گنا دیں گے، چار گنا دیں گے۔ اس طرح حضور ﷺ ان کو بہلا پھسلا کر راضی فرماتے رہے، یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ نے ان سے کہا کہ آپ کے پاس جو درخت ہیں اس سے دس گنا ہم آپ کو دیں گے، لیکن یہ آپ ان کو واپس کر دیجیے۔ جب نبی کریم ﷺ نے دس گنا دینے کا وعدہ فرمایا تب انہوں نے وہ درخت واپس کیے۔ (بخاری شریف۔ ۴۱۲۰)

بہر حال! عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کا معاملہ

ناز کا تھا جیسے ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسے مواقع پر کیا کرتی ہے، اور حضور اکرم ﷺ ان کا بڑا احترام وادب فرمایا کرتے تھے، اور ان کا بڑا خیال ولحاظ فرماتے تھے۔ بعد میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت ام ایمن کا نکاح حضرت زید بن حارثہؓ سے کرادیا تھا اور انہی سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے تھے۔

بڑوں کا معمول ملحوظ رہے

اور جیسا کہ اس روایت میں آیا کہ خود نبی کریم ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ علامہ نوویؒ اس روایت سے یہی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنے اس مقامِ رفیع کے باوجود ان کے یہاں تشریف لے جارہے ہیں اور حضور ﷺ کی اتباع ہی میں آپ کی وفات کے بعد حضراتِ شیخین ان کے پاس جارہے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمارہے ہیں کہ چلیں ہم ان کے پاس جائیں جیسے نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، ہمیں بھی ان کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے بڑوں کا معمول چھوٹوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جیسے آپ کے خاندان کے بڑے کسی بزرگ کے پاس اس کی صلاح ونیکی کی وجہ سے حاضری دیا کرتے تھے، کسی صاحبِ فضل وکمال کے پاس ان کے فضل وکمال کی وجہ سے حاضری دیتے تھے تو چھوٹوں کو بھی اس کا اہتمام رہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

پتے کی بات

خیر! جب یہ دونوں حضرات ان کی خدمت میں پہنچے تو ان کی آمد پر نبی کریم ﷺ کی یاد تازہ ہونا لازمی تھی، تو وہ رونے لگیں، جب ان کو روتے دیکھا تو ان حضرات نے

تسلی کے طور پر ان سے کہا کہ کیوں روتی ہیں؟ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ ملا ہے وہ دنیا کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔ یعنی دنیا میں نبی کریم ﷺ جس حال میں تھے وہاں آپ کو یہاں سے زیادہ راحت ہے، اور اگر کسی کو اپنے محبوب کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں کے مقابلہ میں وہاں زیادہ راحت میں ہے تو وہ یہ معلوم کر کے خوش ہوتا ہے کہ ہمیں تو انہی کی راحت مطلوب ہے، تو اب ہمیں وہاں کے حال کا تصور کر کے بجائے رونے کے خوش ہونا چاہیے۔ ان حضرات نے تسلی کے طور پر یہ کہا کہ اب روتی کیوں ہو؟ اس پر انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں اس لیے نہیں روتی کہ مَیں یہ بات نہیں جانتی کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس دنیا کے مقابلہ میں بہت بڑھ کر ملا ہے، یہ بات تو میں بھی بخوبی جانتی ہوں۔ لیکن میں تو اس لیے روتی ہوں کہ وحی کا سلسلہ جو نبی کریم ﷺ کے وجودِ مسعود کی وجہ سے دنیا میں تھا، آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ جب تک نبی کریم ﷺ دنیا میں تھے وہاں تک حضرت جبرئیل وحی لے کر آتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے وحی کا آنا اور اللہ کے کلام کا اللہ کے نبی پر نازل ہونا؛ دنیا والوں کے لیے اور جس زمانہ میں یہ وحی نازل ہو رہی ہے خصوصاً اس زمانہ والوں کے لیے واقعتاً بڑا ابرکات وخیرات کا ذریعہ اور سبب تھا۔ تو ظاہر ہے کہ جب نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، تو اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور وحی کی آمد کی وجہ سے جو برکتیں اور رحمتیں دنیا والوں پر نازل ہوتی تھیں؛ وہ نہیں رہیں۔ میں تو اس بات پر رو رہی ہوں۔ جب انہوں نے یہ بات فرمائی تو اس بات کو سن کر تو پھر ان حضرات کا دل بھی بھر آیا اور وہ بھی رونے لگے کہ ان کی بات تو پتے کی ہے۔ اور جو بات اُن کو رُلا رہی تھی، اب تو یہ حضرات بھی اپنے آپ پر قابو نہیں

رکھ سکے، اور وہ بھی بے اختیار رونے لگے۔

اللہ کی نسبت پر ملاقات کا انعام

۲۶۱: وعن أبی هریرةَ رضی اللہ عنہ عنِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أَنَّ رَجُلاً زَارَأَخًالَهُ فِیْ قَرْیَةٍ أُخْرٰی، فَأَرْصَدَاللّٰهُ تَعَالیٰ عَلیٰ مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا۔ فَلَمَّاأَتیٰ عَلَیْهِ قَالَ: أَیْنَ تُرِیْدُ؟ قَالَ: أُرِیْدُ أَخًا لِیْ فِیْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ۔ قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَیْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا عَلَیْهِ؟ قَالَ: لَا، غَیْرَ أَنِّی أَحْبَبْتُهُ فِی اللّٰهِ تَعَالیٰ۔ قَالَ: فَاِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكَ بِأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَاأَحْبَبْتَهُ فِیْهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے گاؤں میں خالص اللہ کی نسبت پر اپنے بھائی کی ملاقات کے لیے جانے لگا۔ جس راستہ سے وہ گذر رہا تھا اس راستہ پر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فرشتے نے اس سے سوال کیا: بھائی! کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ اس بستی میں میرا ایک دینی بھائی ہے، میں اس کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ فرشتہ نے پوچھا کہ تمہارا اس کے ساتھ کوئی بھلائی کا معاملہ رہا ہے کہ اس کے باقی رکھنے اور اس کو فروغ دینے کے لیے تم جا رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! بلکہ صرف اللہ کے واسطہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں۔ فرشتہ نے کہا کہ میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص یہ بشارت اور خوش خبری سنانے کے واسطے بھیجا گیا ہوں کہ جس طرح تو نے اللہ کی خاطر اس سے محبت کی، اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے۔

افادات: (۱) اگر چہ اس فرشتہ کو بھی معلوم تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تو بتلا کر بھیجا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو جو بشارت سنانے کے واسطے بھیجا تھا اس بشارت کی بنیاد قائم کرنے کے لیے یہ سوال ضروری تھا۔

(۲) یہاں سوال کیا ہے "أَیْنَ تُرِیْدُ؟" کہاں جا رہے ہو؟ اور وہ جواب دے رہا ہے کہ کس لیے جا رہا ہوں۔ ویسے اس فرشتہ کا مقصد "أَیْنَ تُرِیْدُ؟" سے یہی تھا کہ اگر

وہ یہ جواب دیتا کہ اس بستی میں جا رہا ہوں تو وہ فرشتہ آگے یہی پوچھتا کہ اس بستی میں کیوں جا رہا ہے۔ اس لیے یہ بھی سوال کا اصل مقصد سمجھ گیا، اور اس کے نتیجہ میں دوسرا جو سوال وجود میں آنے والا ہے، اس کا جواب پہلے ہی دیدیا۔

(۳) ظاہر ہے کہ جو صلحاء اور نیک لوگ ہوتے ہیں ان کے ساتھ کوئی مؤمن جب بھی کوئی معاملہ کرتا ہے، ان کی ملاقات کے لیے جائے گا، ان کی مجلس میں بیٹھنے کے لیے جائے گا، یا ان کی صحبت اختیار کرنے کے لیے جائے گا، یا ان سے محبت کا تعلق رکھے گا، جو ہمارے باب کا عنوان ہے؛ تو وہ سب اللہ ہی کی نسبت پر ہوتا ہے۔

اس لیے اس روایت کو علامہ نوویؒ نے یہاں پر ذکر کیا ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی نسبت پر جب کوئی تعلق قائم کیا جاتا ہے تو اللہ کے یہاں وہ کتنا اونچا درجہ رکھتا ہے۔

(۴) فرشتہ نے کہا کہ میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص یہ بشارت سنانے کے واسطے بھیجا گیا ہوں کہ جس طرح تو نے اللہ کی خاطر اس سے محبت کی اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے۔

اسی لیے یہ بھی تعلیم ہے کہ اگر کوئی مسلمان بھائی ہم سے یوں کہے کہ میں تجھ سے اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہوں تو ہم جواب میں بطورِ دعا یہ کہیں کہ جس ذات کے لیے تو مجھ سے محبت رکھتا ہے، وہ ذات بھی تجھ سے محبت رکھے (مسند احمد، ۱۲۵۹۰) یہ آداب میں سے ہے۔

(۵) یہاں پر فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایلچی بن کر اس سے یہ کہا کہ جس اللہ کی خاطر تو نے اس سے محبت کی ہے، اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کے ساتھ کو معاملہ کیا جاتا ہے، وہ محض اللہ کی محبت کی وجہ

سے ہوا کرتا ہے، مثلاً ان کی زیارت کے لیے جانا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے پاس بیٹھنا، ان کے ساتھ محبت رکھنا؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے بدلہ میں اپنی طرف سے یہ انعام عطا فرماتے ہیں کہ اس بندہ سے محبت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کسی کو حاصل ہو جائے تو پھر اس کا بیڑا پار ہے۔

آج ہماری مجلس میں حضرت مولانا احمد لاٹ صاحب دامت برکاتہم تشریف فرما ہیں، میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ حضرت مولانا ہی کچھ ارشاد فرمائیں، لیکن وہی بزرگوں والا اصول حضرت نے یہاں بھی اپنایا کہ یہ تو آپ کا معمول ہے، اس لیے آپ کو تو یہ پورا کرنا ہی چاہیے۔ اس لیے میری بات ابتداءً تو نہیں مانی، لیکن اب میں دوبارہ حضرت سے درخواست کرتا ہوں کہ دو چار باتیں ارشاد فرما دیں اور دعا بھی فرما دیں۔

زِيَارَةُ أَهْلِ الْخَيْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ

نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

۱۸ / ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۳ / جولائی ۱۹۹۹ء

بیان چل رہا تھا کہ نیک لوگوں کی زیارت اور ان کی ہم نشینی، اور ان کی صحبت اختیار کرنا اور ان کے ساتھ محبت رکھنا اور ان سے اپنے یہاں آنے کی اور ان سے دعا کی درخواست کرنا، اور بابرکت جگہوں کی زیارت کے لیے جانا۔ اسی سلسلہ میں اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔

جنت میں ٹھکانہ بنانے کا آسان نسخہ

۳٦۲: وعنه قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنُ عَادَمَرِيُضاً أَوُزَارَأَخاً لَهُ فِي اللّٰهِ، نَادَاهُ مُنَادٍ: بِأَنُ طِبُتَ، وَطَابَ مَمُشَاكَ، وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الُجَنَّةِ مَنُزِلًا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت اور خبر گیری کے لیے جاتا ہے، یا اپنے اس بھائی کی ملاقات کے لیے جاتا ہے جس کے ساتھ بھائی چارگی کا تعلق اللہ کی نسبت پر قائم کیا ہے، تو ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ تو بڑا پاکیزہ اور عمدہ ہے، اور تیرا یہ چلنا بھی بڑا اچھا ہے، اور تو نے جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

افادات: علامہ نووی رحمہ اللہ یہاں اس روایت کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ جس کے ساتھ کسی نے اللہ کی نسبت پر اخوت اور بھائی چارگی کا تعلق قائم کیا ہے، تو جب وہ آدمی اس کی ملاقات کے لیے جاتا ہے، تو اس کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔

جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالینا کتنا آسان ہے، کسی دینی بھائی یا جس سے اللہ کی نسبت سے محبت ہو، اس کی ملاقات کے لیے جانے میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا، پانچ دس منٹ میں بھی یہ کام نمٹ سکتا ہے۔ یا کسی بیمار کی تیمارداری کے لیے آدمی جاوے، تو ویسے بھی اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ وہاں زیادہ نہ رُکے، بلکہ کھڑے کھڑے اس کی خبر پوچھ کر واپس آجاوے۔ تو اس پر اتنی بڑی فضیلت سنائی گئی کہ اس

نے جنت میں اپنے لیے ٹھکانہ بنالیا۔

ان اعمال کو معمولی مت سمجھو

ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال ہیں جن میں ریا کا بھی کوئی شبہ نہیں ہے، بڑے اعمال میں تو دکھلاوے کا بھی شبہ ہوسکتا ہے، جیسے کوئی آدمی تہجد پڑھے، تو ہوسکتا ہے کہ اس میں نفس کو دخل ہو کہ لوگ مجھے دیکھیں اور میری تعریف کریں، لیکن کوئی آدمی کسی بیمار کی خبرگیری کے لیے جب جاتا ہے، یا کسی نیک آدمی کی ملاقات کے لیے جاتا ہے تو وہاں کبھی دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں کوئی بڑا عمل کررہا ہوں، اور لوگ مجھے دیکھیں اور اس پر میری شہرت اور نیک نامی ہو، بلکہ یہ عمل خالص اللہ کے لیے ہوتے ہیں۔ تو یہ عمل چھوٹا سا ہے، اور اس میں ریا کا بھی کوئی شائبہ نہیں ہے، اور اتنی بڑی فضیلت ہے۔ تو ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال جن پر اتنی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، آدمی اگر انہیں کا اہتمام کرلے، اور اس قسم کے اعمال کو انجام دینے کی عادت بنالے، تو کب کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے، اور نجات کا ذریعہ بن جائے؛ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، جبکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی بڑی بشارت دی جارہی ہے۔

نیک و بد ہم نشین کی مثال

٣٦٣: عَنْ أَبِی مُوسٰی الأَشْعَرِی رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَجَلِيْسِ السُّوْءِ، كَحَامِلِ الْمِسْكِ، وَنَافِخِ الْكِيْرِ۔ فَحَامِلُ الْمِسْكِ؛ اِمَّا أَنْ يُحْذِيَكَ، وَاِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَاِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبَةً۔ وَنَافِخُ الْكِيْرِ؛ اِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ، وَاِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا مُنْتِنَةً. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیک ہم نشین اور ساتھی کی مثال اور برے ہم نشین اور ساتھی کی مثال مشک رکھنے والے اور بھٹی جھونکنے والے جیسی ہے۔ پس مشک رکھنے والا؛ یا تو تم کو خوشبو لگادے گا، یا تم اس سے عطر خریدو گے، یا اس کے پاس سے اچھی خوشبو تو سونگھ ہی لوگے۔ اور بھٹی جھونکنے والا؛ یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا، یا اس کے پاس سے بدبو تو سونگھ ہی لوگے۔

مثالیں اور انبیاءؑ کی تعلیمات

افادات: بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جلدی سے سمجھ میں نہیں آتی، ان کو سمجھنا آسان ہوجائے اس کے لیے آدمی ظاہری اور حسی طور پر جو نمونے اور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسی میں سے کسی چیز کو پیش کر کے بات سمجھائی جاتی ہے۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر یہ ملکہ اور وصف اور یہ خصوصی شان عطا کی جاتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو یعنی جو بات عقل سے تعلق رکھتی ہے اس کو سمجھانے کے لیے حسی اور ظاہری مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس کا سمجھنا آسان ہوجائے۔ اسی لیے حدیث کی کتابوں میں محدثین باقاعدہ الگ سے ایک عنوان ''کتاب الامثال'' قائم کرتے ہیں، اور اس کے تحت صرف ایسی روایتیں لاتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے مثالیں دے کر کیا کیا چیزیں سمجھائی ہیں۔ یہ بھی حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا ایک خاص حصہ ہیں۔ اور قرآنِ پاک میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو مثال دے کر سمجھایا ہے۔ یہاں پر بھی اچھے آدمی کی صحبت اور برے آدمی کی صحبت کو سمجھانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے ایک مثال دی ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشک رکھنے اور بیچنے والا اور دوسرا بھٹی جھونکنے والا جس کو لوہار کہتے ہیں۔ تو ان دو شخصوں کو مثال اور نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

نیک ہم نشین کی مثال

چنانچہ فرمایا کہ اچھی صحبت والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشک بیچنے والا ہوتا ہے کہ اگر آپ مشک بیچنے والے عطر فروش کے پاس جا کر بیٹھ جائیں تو اگر آپ کا اس کے ساتھ تعلق زیادہ ہے، پرانی جان پہچان اور دوستی ہے تو وہ آپ کو تھوڑا سا عطر دیدے گا۔ اگر پوری شیشی نہیں دے گا تو کم سے کم عطر کا پھایہ ہی دیدے گا۔ تو اس کی طرف سے یہ فائدہ آپ کو پہنچے گا۔ یا اگر وہ نہیں دے گا تو آپ کا جی چاہے گا کہ آپ وہ خرید لیں۔ جیسے آدمی کوئی اچھی چیز دیکھتا اور اس کو پسند بھی آجاتی ہے اور جیب میں پیسے بھی ہیں اور خریدنے کی استطاعت بھی ہے تو وہ اس کو خرید لیتا ہے۔ اور اگر نہ اس نے دیا اور نہ آپ نے خریدا، تب بھی خوشبو تو کہیں گئی ہی نہیں۔ اس کے پاس جا کر بیٹھنے سے آپ کو جو خوشبو محسوس ہوگی، اس کی وجہ سے آپ کا دماغ تروتازہ ہو جائے گا، طبیعت میں فرحت کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے خوشبو آدمی کی عقل کو بڑھاتی ہے۔ امام شافعیؒ کا مقولہ ہے کہ جو آدمی اچھی خوشبو استعمال کرتا ہے، اس کی عقل بڑھتی ہے۔

بہر حال! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ کم سے کم خوشبو ہی محسوس کریں گے یعنی اس کی صحبت کسی حال میں بھی فائدے سے تو خالی نہیں ہے۔ نیک آدمی کی صحبت میں آپ بیٹھیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ آپ کو کوئی بھلی بات کہہ دے گا، اور اگر کچھ نہ کہے تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں اس میں آپ کا بھی حصہ لگ جائے گا۔

برے ہم نشین کی مثال

”کِیر“ کیا ہے؟ آپ نے لوہار کی بھٹی دیکھی ہوگی، اس میں پیچھے کی طرف

چمڑے کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہوتا ہے، جب اس کو دباتے ہیں تو اس کی وجہ سے ہوا پیدا ہوتی ہے، اور آگے بھٹی میں کوئلے ہوتے ہیں، وہ ہوا ان پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے اس کی آگ تیز ہوتی رہتی ہے، اور جس وقت وہ ہوا آگے بڑھتی ہے تو چنگاریاں اُڑتی ہیں اور دھواں بھی اُٹھتا ہے۔ اگر کہیں کسی لوہار کی بھٹی کا منظر آپ نے دیکھا ہو، تو وہ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

تو بری صحبت کی مثال بھٹی جھونکنے والے لوہار جیسی ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ جس وقت بھٹی کو جلانے کے لیے وہ چمڑے کا ٹکڑا دبا رہا ہوگا تو جو چنگاریاں اُڑیں گی اس میں سے ایک آدھ چنگاری اگر آپ کے کپڑوں میں لگ گئی تو کپڑے جلا دے گی، یا اگر ایسا نہیں ہوا تو کم سے کم اس کا دھواں تو کہیں گیا ہی نہیں، وہ تو آپ کی ناک میں پہنچ کر ہی رہے گا۔ ایسے ہی برے آدمی کی صحبت میں جب بیٹھیں گے تو اس کی ہم نشینی سے آپ کو نقصان ضرور پہنچے گا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کو اچھی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔

صحبت کا کردار...... ابو مسلم خولانیؒ کا قصہ

اس زمانہ میں عام طور پر آدمی کے بنانے اور بگاڑنے میں صحبت ہی کو بڑا دخل ہے، اسی لیے اپنے لیے بھی اور اپنے گھر والوں کے لیے بھی، اپنے بال بچوں کے لیے بھی، چھوٹوں بڑوں ہر ایک کے لیے اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ وہ اچھی صحبت اختیار کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو یا اپنے بال بچوں اور گھر والوں کو بری صحبت سے بچانے کا اہتمام نہیں کرتا، تو چاہے آپ اس کو کتنی ہی تعلیم دے ڈالیں، کبھی بھی اس کی حالت درست ہونے والی نہیں ہے، وہ اپنی اسی برائی پر باقی رہے گا۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ ذرا سی دیر میں آدمی پر اثر ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو مسلم

خولانیؒ تابعین میں بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، مستجاب الدعوات تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ اپنے گھر میں جب تشریف لایا کرتے تھے تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے باہر ہی سے اللہ اکبر کہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی جواب میں اللہ اکبر کہتی تھی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ رات کے وقت آئے اور اللہ اکبر کہا لیکن اندر سے جواب نہیں آیا تو فوراً کہا کہ میری بیوی کا دماغ کسی نے خراب کیا ہے۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ جب یہ اندر پہنچے تو ان کے پہنچتے ہی بیوی نے شکایت شروع کر دی کہ آپ میرے لیے زیور تو بنواتے نہیں، اچھے کپڑے تو بنواتے نہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اس عورت کے آنے کی وجہ سے یہ ہوا ہے۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھائے اور دعا کی کہ اے اللہ! میری بیوی کا دماغ جس نے خراب کیا ہے اس کی بینائی چھین لے۔ وہ عورت جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی وہ کہنے لگی کہ تمہارا چراغ بجھ گیا۔ اس سے کہا گیا کہ چراغ تو جل رہا ہے لیکن تیری آنکھوں کی روشنی ختم ہوگئی ہے۔ اب وہ رونے لگی اور ان سے دعا کی درخواست کرنے لگی۔ انہوں نے کہا کہ یہ وعدہ کر کہ آئندہ کبھی میرے گھر میں قدم نہیں رکھے گی، تب ہی دعا کروں گا۔ اس نے وعدہ کیا، تو انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! اس کی بینائی واپس کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ دعا بھی قبول فرمالی۔ اور اس کو گھر سے رخصت کیا۔

عجیب شیخِ کامل کی صحبت کا اثر

حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں ہے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب تھے، ان کو جو تنخواہ ملتی تھی، وہ اس تنخواہ کا بڑا حصہ اپنے رشتہ داروں اور غریب غرباء پر خرچ کرتے تھے، گھر میں بڑی سادگی تھی۔ بیوی کے پاس کوئی زیور بھی نہیں تھا، بالکل سادہ کپڑوں میں رہتی تھی اور گھر کا کام کاج بھی خود ہی کرتی تھی۔ سالہا سال سے اسی طرح ٹھیک

ٹھاک معاملہ چل رہا تھا۔ایک مرتبہ ان کے دور کے کسی رشتہ دار کے یہاں شادی تھی، وہاں سے دعوت آئی تو وہ وہاں پہنچی۔ان کے گھر کا حال جب اس نے دیکھا کہ وہاں تو ایسا ساز وسامان ہے اور نوکر چاکر ہیں، خادمائیں بھی ہیں اور ان کی بیوی کو دیکھا کہ زیورات بھی خوب پہنے ہوئے ہیں۔حالانکہ سرکاری گریڈ اور ملازمت کے اعتبار سے وہ کم درجہ میں کام کرتے تھے۔اور اِن کا گریڈ اُن سے بہت اونچا تھا۔بس! وہاں سے آتے ہی وہ شوہر کے سر چڑھ گئی کہ آپ نے تو آج تک مجھے کچھ دیا ہی نہیں، اور وہاں دیکھو کہ گریڈ اور ملازمت کے اعتبار سے وہ آپ سے بہت کم درجے کے ہیں، اس کے باوجود زیورات بھی ہیں اور کپڑے بھی اچھے اچھے ہیں، نوکرانیاں اور خادمائیں بھی ہیں، گھر میں ساز وسامان بھی اچھے سے اچھا ہے۔پھر تو وہ ایسی ان پر مسلط ہوئی کہ بے چارے زندگی بھر روتے رہے کہ میں اب تک جو نیکیاں کرتا رہا وہ سب ختم ہوگئیں۔ اب تو سارے پیسے اس کے پیچھے ہی خرچ ہو جاتے ہیں۔حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ عجیب شیخِ کامل کی صحبت تھی کہ ایک ہی نظر میں ساری زندگی کا دھارا بدل دیا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ بری صحبت بہت ہی خطرناک چیز ہے۔آج کل ہم لوگوں کو اپنے اور اپنے گھر والوں، بال بچوں کے متعلق اس کا خاص اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے ان چیزوں کی طرف توجہ کیجئے۔بہت سے لوگ سوچتے ہیں اور کوششیں کرتے ہیں پھر بھی اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو صحبتیں میسر آتی ہیں اور جو ماحول ملتا ہے، وہ سدھرنے نہیں دیتا۔بلکہ سدھرے ہوئے کو بگاڑ دیتا ہے۔

کیا دیکھ کر لڑکی پسند کی جائے؟

٣٦٤:وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ:تُنكَحُ الْمَرْأَةُ

لِأَرْبَعٍ؛ لِمَالِهَاوَلِجَمَالِهَاوَلِحَسَبِهَاوَلِدِيْنِهَا،فَاظْفَرْبِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورت کے ساتھ چار باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، یا چاروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

(۱) لِمَالِهَا: بہت سے لوگ عورت کو پسند کرنے میں اس کے مال کو سامنے رکھتے ہیں کہ یہ مال دار ہے، اگر ہم اس کے ساتھ نکاح کریں گے تو اس کے مال سے ہمیں فائدہ پہنچے گا، اس کی مالداری والی خوبی کو دیکھ کر اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۲) لِجَمَالِهَا: اور کبھی اس کی خوبصورتی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(۳) لِحَسَبِهَا: خاندانی شرافت کی وجہ سے۔ اونچے گھرانے کی لڑکی ہے، ہم اگر اس کے ساتھ شادی کریں گے تو ہماری کیٹیگری اور ہمارا مقام بھی بڑھ جائے گا، یہ سمجھ کر اس کے ساتھ نکاح کرتے ہیں، چاہے پھر زندگی بھر اس کی غلامی کرنی پڑے

(۴) لِدِيْنِهَا: اور کبھی اس کی دینداری، نیکی اور صلاح کی وجہ سے اس سے نکاح کیا جاتا ہے۔ تو یہ چار خوبی ہوئیں۔

عام طور پر ان چار میں سے کسی ایک خوبی کو دیکھ کر آدمی اپنے نکاح کے لیے عورت کو پسند کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ ان چاروں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ تم تو دیندار عورت کو اپنے نکاح کے لیے اختیار کر کے کامیابی حاصل کرو۔ گویا ان چار اوصاف میں سے کون سا وصف مدنظر رکھنا چاہیے، یہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بتادیا اس لیے کہ ہمیں ایک دو دن اس کے ساتھ نہیں گزارنے ہیں، بلکہ نکاح تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ اب مال کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ وہ کب تک باقی رہے گا

مال کے متعلق عربی میں کہاوت ہے "اَلْمَالُ غَادٍوَرَاحٍ" صبح کو آتا ہے، شام کو جاتا ہے شام کو آتا ہے اور صبح کو جاتا ہے۔ بہت سے مال وثروت والے دیکھے ہوں گے کہ جو صبح کو مالدار ہیں اور کوئی قدرتی آفت ایسی آگئی کہ شام کو سارا مال ختم ہوگیا۔ اس لیے یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو ترجیح دی جائے۔

اسی طریقہ سے اگر خاندان کی وجہ سے بھی کوئی آدمی نکاح کرتا ہے تو جو زندگی دونوں میاں بیوی ہونے کی حیثیت گزاریں گے اس پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ بات ہے کہ خاندانی عورت ہے تو شریف ہوگی، تو پھر تو وہی دین داری والا مسئلہ آگیا، درحقیقت صرف اونچے خاندان والا ہونے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور رہی خوبصورتی؛ تو اس کا حال تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر بیماری آگئی، یا آٹھ روز تک بخار نے ڈیرا ڈال دیا اور تھوڑے دست بھی آگئے تو ساری خوبصورتی ختم ہوجائیگی۔ اور بوڑھاپا تو آنے ہی والا ہے جو جوانی کی ساری خوبصورتی کو ختم کردے گا

اصل چیز دین داری ہے کہ جس میں حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ہو، باقی اگر کوئی عورت دین دار بھی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اِن اوصاف میں سے کوئی وصف بھی ہے تو نورٌ علیٰ نور۔ لیکن جب مقابلہ ہو کہ ایک طرف کوئی عورت ایسی مل رہی ہے جو صرف خوبصورت ہے، لیکن دین دار نہیں ہے، اور دوسری ایسی ہے کہ جو دین دار ہے لیکن اتنی زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ تو پھر ہم کو نبی کریم ﷺ کی تعلیم یہ بتلاتی ہے کہ اگر ترجیح دینے کا وقت آئے تو آپ دین دار کو خوبصورت کے مقابلہ میں ترجیح دیجیے۔ باقی اگر کوئی عورت خوبصورت بھی ہے اور دین دار بھی ہے، اور دوسری صرف دین دار ہے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس میں دو وصف ہیں اس کو اگر آپ ترجیح دیں، تو اس میں کوئی

حرج کی بات نہیں ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ جس کے ساتھ آپ کو پوری زندگی گزارنی ہے، جس کی رفاقت اور صحبت آپ زندگی بھر کے لیے اختیار کرنے جارہے ہیں، وہاں پر آپ کو چاہیے کہ نیکی کو دیکھیں، نیک لوگوں کی صحبت میں یہ چیز بھی آجاتی۔

آپ کیوں زیادہ نہیں آتے؟

٣٦٥: وعن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ لجبریل: مایمنعك أن یزورنا أکثر مماتزورنا؟ فنزلت: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾ (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ میرے پاس جتنا آتے ہیں، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ (دراصل ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے آنے میں دیر ہوئی۔ مختلف روایتیں ہیں، آٹھ روز، پندرہ دن تک نہیں آئے، اور چالیس روز کی بھی روایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طویل زمانہ تک حضرت جبرئیل علیہ السلام نہیں آئے اور نبی کریم ﷺ ان کی آمد کا انتظار فرماتے تھے۔ جب آئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں تو آپ کی زیارت و دیدار اور ملاقات کا مشتاق و منتظر تھا، آپ نے دیر کیوں کردی؟) تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں بھی آپ کی زیارت و ملاقات کا مشتاق تو تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت اور حکم کے بغیر نہیں آسکتا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے یہی کہا ہے کہ آپ ان کو جواب میں یہ کہو ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾ کہ ہم آپ کے پاس نہیں آسکتے مگر اللہ تعالیٰ کے

حکم سے۔ وہی ہمارے آگے اور پیچھے اور جو سامنے ہے اس سب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آپ کی زیارت کا شوق تو مجھے بھی ہے جیسا آپ کو ہے، لیکن میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں آسکتا۔ ابھی تک حکم نہیں ملا تھا تو نہیں آیا، اب آج حکم ملا تو حاضر ہوا ہوں۔

بہرحال! یہاں تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زیارت کے مشتاق تھے۔ گویا آپ ﷺ کو ایک مدت تک طلب رہی کہ کب جبرئیل آویں اور ملاقات ہو۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا صلحاء میں سے ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ تو جب حضور اکرم ﷺ بھی اس چیز کو چاہتے ہیں کہ صالح لوگوں کی صحبت میسر آئے، حالانکہ آپ ﷺ تو کامل بھی تھے اور مکمّل بھی تھے، اس کے باوجود آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی صحبت کے خواہش مند اور متمنی ہیں۔ تو اب تو ہر ایک آدمی کو صلحاء اور نیک لوگوں کی صحبت کا متمنی اور مشتاق ہونا چاہیے، اور ان کی زیارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دوستی صرف ایمان والوں سے کرو

٣٦٦: عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَاتُصَاحِبُ اِلَّا مُؤْمِناً وَلَا یَأْکُلُ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِیٌّ. (رواہ ابوداود والترمذی باسناد لا بأس بہ)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (مصاحبت، رفاقت اور) دوستی اختیار مت کرو مگر اس کی جو مؤمن (یعنی کامل الایمان) ہو۔ اور تمہارا کھانا (یعنی محبت والا) نہ کھاویں مگر نیک لوگ۔

افادات: حاجت والا کھانا تو ہر ایک کو کھلایا جاسکتا ہے، لیکن دوستی کی بنیاد پر آپ جو دعوت کریں وہ نیکوں کی ہی کرنی چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ جب آدمی نیکوں سے ہی دوستی کا اہتمام کرے گا تو دوستی کے نام پر دعوت بھی انہیں کی کرے گا۔ اور اگر

بروں سے دوستی کرے گا تو دوستی کے نام پر انہی کی دعوت کرنے کی نوبت آئے گی۔ باقی حاجت اور ضرورت کی وجہ سے جو کھانا کھلایا جاتا ہے، اس میں مؤمن کی بھی قید نہیں ہے، بلکہ کافر بھی اگر ضرورت مند ہے تو اس کو بھی کھلایا جائے گا۔ اسی طریقہ سے مؤمن میں بھی اگر ضرورت مند فاسق ہے، اور ضرورت مند ہونے کی بنیاد پر کھانا کھلا رہے ہیں تو وہاں یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ کیسا آدمی ہے، نماز پڑھتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس جگہ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ تمہارا طعامِ محبت، دوستی کی بنیاد پر کھلایا جانے والا کھانا نیکوں کے علاوہ اور کوئی نہ کھائے۔

انسان اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے

٣٦٧: عنْ أبِي هريرةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: اَلرَّجُلُ عَلىٰ دِيْنِ خَلِيْلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقہ، اس کے دین اور روش پر ہوتا ہے۔ (یعنی آدمی کی چال ڈھال بھی وہی ہوتی ہے جو اس کے دوست کی ہوتی ہے۔) اس لیے آدمی دیکھ لے کہ کس کے ساتھ دوستی کرتا ہے۔

افادات: بھائی! کسی کو آپ پہچاننا چاہیں کہ اس کا مزاج کیسا ہے؟ تو یہ دیکھ لیجئے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اس کی طبیعت کا میلان و رجحان کن لوگوں کی طرف ہے، وہ کدھر جھکتا ہے؛ اسی سے اس کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ جو گنہگار لوگ ہیں ان کی طرف نہ جھکو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی جہنم کی آگ پکڑ لے۔ جب ان پر عذاب آئے گا تو وہ تم کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیں گے۔ بہر حال! آدمی اپنے دوست ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو چاہیے کہ نیک لوگوں ہی کی

دوستی اختیار کرے، برے لوگوں کے ساتھ دوستی نہ کرے۔

حشر بھی محبت والوں کے ساتھ ہوگا

٣٦٨: عَنْ أَبِي مُوسىٰ الأَشعرِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ. وفي رواية: قيل لِلنَّبِيِّ ﷺ: اَلرَّجُلُ يُحِبُّ الْقَوْمَ وَلَمَّا يَلْحَقْ بِهِمْ؟ قَالَ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی کو نیک لوگوں کے ساتھ محبت و تعلق ہے لیکن ابھی تک وہ نیکی کے اس معیار پر نہیں پہنچا کہ ان کو پالے۔تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

افادات: ''وَلَمَّا يَلْحَقْ بِهِمْ'' عربی زبان میں لفظ ''لَمَّا'' اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کہ کوئی چیز ابھی تک واقع نہ ہوئی ہو، لیکن اس کے واقع ہونے کی امید ہو۔ جیسے کوئی پوچھے: ''أَجَاءَ زَيْدٌ؟'' زید آیا؟ تو اگر یہ کہیں ''لَمَّا يَأْتِ'' ابھی تک تو نہیں آیا۔ یعنی آنے کی امید ہے۔

اسی طرح ایک آدمی نیک، صلحاء اور اللہ والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے، لیکن ابھی تک اس کا عمل اس درجہ کا نہیں ہوا کہ ان تک پہنچ جائے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی اس محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو بھی ان کے ساتھ رکھیں گے۔اس لیے آدمی کو محبت کا تعلق بھی نیکوں کے ساتھ ہی رکھنا چاہیے۔ بروں کے ساتھ نہیں۔

محبت ہے لیکن عمل اس درجہ کا نہیں

٣٦٩: عَن أَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ أَعرَابِيًّا قالَ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: مَتَى السَّاعَةُ؟

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟ قَالَ: حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، قَالَ: أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ. (متفق عليه)

وفي رواية: مَا أَعْدَدْتُ لَهَا مِنْ كَثِيْرِ صَوْمٍ، وَلَا صَلَاةٍ، وَلَا صَدَقَةٍ؛ لٰكِنَّنِيْ أُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیہات کا ایک رہنے والا حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا، اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قیامت کب آئے گی؟ حضور ﷺ نے پوچھا کہ تو نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اس کے لیے کوئی زیادہ روزے یا نمازیں اور صدقہ وخیرات تو نہیں کر رکھے ہیں، لیکن ہاں! میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تو انہیں لوگوں کے ساتھ رہے گا۔

افادات: یعنی تو جنت میں ان کے ساتھ جائے گا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مقام جو جنت میں حضور اکرم ﷺ کو ملے گا وہی اس کو بھی ملے گا۔ اس مقام کو تو کون پا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے اس جگہ جانے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

سب کا کام بن گیا

اب ایک بات یہ ہے کہ محبت کی علامت بھی پائی جانی چاہیے۔ اسی لیے امام بخاریؒ نے یہ روایت اپنی کتاب الجامع الصحیح بخاری شریف میں جہاں بیان فرمائی ہے اس باب کا عنوان قائم کیا ہے ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ تم میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ خالی زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے۔ ایک تو زبانی دعویٰ ہوتا ہے اور ایک اس کی حقیقت ہوتی ہے۔ کوئی آدمی جب کوئی دعویٰ کرتا ہے تو پھر اس کی علامتیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ تو اس کی علامت یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پیروی اختیار کرے۔ تو اس

دیہاتی سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تو جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ رہے گا۔

اس لیے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب حضور اکرم ﷺ کا یہ جواب سنا کہ ''تو جس سے محبت کرتا ہے اس کے ساتھ رہے گا'' تو یہ سن کر صحابہ کو اتنی خوشی ہوئی کہ کسی اور چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی (بخاری شریف۔۳۶۸۸) اس لیے کہ تمام صحابہ کو حضور اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ گویا یہ جواب سن کر سب خوش ہو گئے کہ اب تو ہم سب کا کام بن گیا۔

کوشش کرتا رہے

۳۷۰: وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: جَاءَ رَجُلٌ اِلیٰ رَسولِ اللّٰہِ ﷺ، فقال: یَارسولَ اللّٰہ! کَیفَ تَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ أَحَبَّ قَوْمًاوَلَمْ یَلْحَقْ بِھِمْ؟فقال رسولُ اللّٰہِ ﷺ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ۔

ترجمہ: ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اس آدمی کے سلسلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت رکھتا ہے لیکن وہ ابھی تک اپنے عمل کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ نہیں سکا (نیکی اور بزرگی کے جس درجہ کے وہ لوگ ہیں، یہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا) تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدمی انہیں کے ساتھ رہے گا جن سے محبت رکھتا ہے

افادات: جب اللہ والوں اور نیک وصلحاء کے ساتھ تعلق اور محبت ہوتی ہے تو کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہمارا عمل تو اس درجہ کا نہیں ہے، پتہ نہیں کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں۔ تو آدمی کو چاہیے کہ کوشش کرتا رہے، اس کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد اس کی تسلی کے لیے کافی ہے۔

اوصاف فطری ہوتے ہیں

۳۷۱: وَعَنْ أَبِیْ ھُریرۃَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ

الـذَّهَـبِ وَالْـفِـضَّـةِ: خِيَـارُهُـمْ فِـى الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِى الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا، وَالْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌمُجَنَّدَةٌ،فَمَاتَعَارَفَ مِنْهَاائْتَلَفَ، وَمَاتَنَاكَرَمِنْهَا اخْتَلَفَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ ایسی کانوں کی طرح ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ جولوگ زمانہ جاہلیت میں (یعنی اسلام کے آنے سے پہلے) شریف، اچھے اور اونچے سمجھے جاتے تھے (گویا خاندانی شرافت ان کے لیے مسلّم تھی تو) اسلام میں بھی وہ ایسے ہی سمجھے جائیں گے۔ (البتہ ایک) شرط یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں (تو گویا یہ چیز ان کی اور زیادہ پختہ ہوجائے گی۔) اور اللہ تعالیٰ نے روحیں مختلف جماعتوں میں پیدا کی ہیں، پہلے روز جن روحوں میں آپس میں تعلق اور دوستی ہوئی، دنیا میں بھی ان میں تعلق ہوگا، اور جن روحوں میں وہاں تعلق پیدا نہیں ہوا، یہاں بھی ان میں تعلق پیدا نہیں ہوگا۔

افادات: کان کو گجراتی میں (ખાણ) اور انگریزی میں (Maeiled) کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں ایسے ہی لوگوں کا حال ہے۔ سونے چاندی کی کان کا مطلب یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کے جس خطہ میں سونا نکلتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس حصہ میں یہ صلاحیت اسی دن سے رکھ دی ہے جس دن زمین کو پیدا کیا تھا۔ تو جس طرح مختلف چیزوں کی کانیں ہوتی ہیں اسی طریقہ سے لوگوں کا حال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تو انسانوں کے اندر جتنے بھی اوصاف اور خوبیاں ہوتی ہیں وہ بھی گویا ایک فطری چیز ہے۔

جسموں کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے روحیں پیدا فرمائیں، جسم تو دنیا میں آنے کے وقت وجود میں آئے گا۔ دنیا تو معلوم نہیں کب سے چل رہی ہے اور کب تک چلے گی، اور ہر ایک کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آنے کا ایک وقت مقرر کیا ہے اس وقت وہ آئے گا اور جانے کا جو وقت مقرر کیا ہے اس وقت ہ جائے گا، لیکن جس وقت کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس وقت سے روحیں پیدا کی ہیں۔

باہم مناسبت وعدم مناسبت پہلے دن سے ہے

تو اس پہلے روز جن روحوں میں آپس میں تعلق اور دوستی ہوئی، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت اور اُنس پیدا ہوا، دنیا میں بھی ان کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا۔ اور جن روحوں میں وہاں عالمِ ارواح میں تعلق پیدا نہیں ہوا، یہاں دنیا میں بھی ان میں تعلق پیدا نہیں ہوگا۔ بعض مرتبہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک آدمی آتا ہے، پہلی مرتبہ ملاقات ہوتی ہے اور ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے برسہا برس سے ہو۔ دراصل وہ اسی تعلق کا اثر ہوتا ہے جو عالمِ ارواح میں روحوں میں قائم ہوا تھا۔ اور بعضا ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں، مثلاً سالہا سال سے ایک ہی آفس میں کام کر رہے ہیں لیکن آپس میں بات کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی، دونوں میں سے کسی کو دوسرے کی پڑی ہی نہیں ہوتی۔ وہ بھی دراصل اسی کا اثر ہے کہ طبیعتوں میں مناسبت نہیں ہے۔

حضرت اویس قرنیؒ کے مناقب

٣٧٢: وعن أُسَيرِ بن عَمرٍو —وَيُقَالُ ابنُ جَابِر وَهُوَ بِضَمِّ الْهَمْزَةِ وَفَتْحِ السِّيْنِ الْمُهْمَلَةِ— قَالَ: كَانَ عُمَرُ بنُ الْخَطَّابِ إِذَا أَتىٰ عَلَيْهِ أَمْدَادُ أَهلِ اليَمَنِ سَأَلَهُمْ: أَفِيْكُمْ أُوَيْسُ بنُ عَامِرٍ؟ حَتىٰ أَتىٰ عَلىٰ أُوَيسٍ، فَقَالَ لَهُ: أَنْتَ أُوَيسُ بنُ عَامِرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَكَانَ بِكَ بَرَصٌ فَبَرَأْتَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: لَكَ وَالِدَةٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "يَأْتِي عَلَيْكُمْ أُوَيسُ بنُ عَامِرٍ مَعَ أَمْدَادِ أَهْلِ الْيَمَنِ مِنْ مِرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ، كَانَ بِهِ بَرَصٌ فَبَرَأَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ، لَهُ وَالِدَةٌ، هُوَ بِهَا بَرٌّ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَسْتَغْفِرَ

لَكَ فَافْعَلْ" فَاسْتَغْفِرْ لِيْ، فَاسْتَغْفَرَ لَهٗ. فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ: اَلْكُوْفَةُ، قَالَ: أَلَا أَكْتُبُ لَكَ إِلىٰ عَامِلِهَا؟ قَالَ: أَكُوْنُ فِيْ غَبْرَاءِ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ. فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ حَجَّ رَجُلٌ مِنْ أَشْرَافِهِمْ فَوَافىٰ عُمَرَ، فَسَأَلَهٗ عَنْ أُوَيْسٍ، فَقَالَ: تَرَكْتُهٗ رَثَّ الْبَيْتِ قَلِيْلَ الْمَتَاعِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "يَأْتِيْ عَلَيْهِمْ أُوَيْسُ بْنُ عَامِرٍ مَعَ أَمْدَادِ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ، مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ، كَانَ بِهٖ بَرَصٌ فَبَرَأَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ، لَهٗ وَالِدَةٌ، هُوَ بِهَا بَرٌّ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَّسْتَغْفِرَ لَكَ فَافْعَلْ"، فَأَتىٰ أُوَيْساً، فَقَالَ: اِسْتَغْفِرْ لِيْ، قَالَ: أَنْتَ أَحْدَثُ عَهْداً بِسَفَرٍ صَالِحٍ فَاسْتَغْفِرْ لِيْ، قَالَ: لَقِيْتَ عُمَرَ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَاسْتَغْفَرَ لَهٗ، فَفَطِنَ لَهُ النَّاسُ فَانْطَلَقَ عَلىٰ وَجْهِهٖ. (رواه مسلم)

وفي رواية لمسلم أيضا: عَنْ أَسِيْرِ بنِ جَابِرٍ أَنَّ أَهْلَ الْكُوْفَةِ وَفَدُوْا عَلىٰ عُمَرَ وَفِيْهِمْ رَجُلٌ مِّمَّنْ كَانَ يَسْخَرُ بِأُوَيْسٍ، فَقَالَ عُمَرُ: هَلْ هَاهُنَا أَحَدٌ مِّنَ الْقَرْنِيِّيْنَ؟ فَجَاءَ ذٰلِكَ الرَّجُلُ، فَقَالَ عُمَرُ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ قَالَ: "إِنَّ رَجُلاً يَأْتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَنِ يُقَالُ لَهٗ أُوَيْسٌ، لَايَدَعُ بِالْيَمَنِ غَيْرَ أُمٍّ لَهٗ، قَدْ كَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَدَعَا اللّٰهُ تَعَالىٰ فَأَذْهَبَهُ إِلَّا مَوْضِعَ الدِّيْنَارِ أَوِ الدِّرْهَمِ، فَمَنْ لَقِيَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ".

وفي رواية له عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: إِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "إِنَّ خَيْرَ التَّابِعِيْنَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ أُوَيْسٌ، وَلَهٗ وَالِدَةٌ، وَكَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَمُرُوْهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ".

ترجمہ مع تشریح: حضرت اُسیر بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب یمن کے لوگ کمک کے لیے آتے تھے (اس زمانہ میں اسلامی لشکر جو

مختلف علاقوں میں بھیجے جاتے تھے، ان لشکروں کو مدد پہنچانے کے لیے اسلامی سلطنت کے مختلف علاقوں سے لوگ امیر المؤمنین کی خدمت میں مدینہ منورہ آتے تھے، اور عرض کرتے تھے کہ آپ جہاں چاہیں ہمیں اسلامی لشکر کی مدد کے واسطے بھیجئے۔ تو جس جس مورچہ اور محاذِ جنگ پر ضرورت ہوتی تھی وہاں ان کو بھیجا جاتا تھا۔ تو اس قسم کے لوگ اسلامی لشکر کو مدد پہنچانے کے لیے جب یمن سے آتے تھے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے پوچھتے تھے کہ کیا تمہارے درمیان حضرت اویس بن عامر ہیں؟ یہاں تک کہ جب یمن والوں کا وہ قافلہ مدینہ منورہ پہنچا جس میں حضرت اویس تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی سے پوچھا کہ کیا تم اویس ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا کہ تمہارا تعلق یمن کے قبیلۂ مراد سے ہے؟ اور قبیلۂ مراد کی شاخ قرن سے ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا: کیا تمہارے جسم میں سفید داغ تھے اور تم نے اس کے اچھا ہونے کی دعا کی تھی جس کی وجہ سے جسم کے سارے داغ اچھے ہو گئے، صرف ایک درہم کے برابر داغ تمہارے جسم پر باقی رہ گیا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا: تمہاری والدہ بھی ہیں؟ کہا: جی ہاں! ہیں۔ پھر کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے پاس یمن سے آنے والے قافلوں میں اویس بن عامر آئیں گے، جن کا تعلق قبیلہ مراد کی شاخ قرن سے ہے اور ان کو برص تھا اور وہ سوائے ایک روپیہ جتنی جگہ کے اچھا ہو گیا، اور ان کی ماں بھی ہے جن کی یہ بڑی خدمت کرتے ہیں۔

(بلکہ آپ اندازہ لگائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، اسلام لا چکے تھے اور دل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کی تمنا تھی، لیکن والدہ کو خدمت کی ضرورت تھی اس وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر نہیں ہو سکے، اور صحابیت

کا شرف حاصل نہ کر پائے۔ آج اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو کون ہے جو وہاں جانے کی کوشش نہیں کرے گا؟ ان کے دل میں بھی تمنا تھی لیکن والدہ کی خدمت کی وجہ سے وہ اپنا وطن اور گھر نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے نہیں جا پائے، تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پوری تفصیل بتلا دی۔)

(اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام یہ ہے کہ) اگر اللہ کا نام لے کر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دے گا (پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ) اگر تم ان سے دعاءِ مغفرت کرو اسکو تو کروا لینا (یعنی تمہاری ملاقات ہو اور موقع ملے تو ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت ضرور کرانا۔ (جب وہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوری تفصیل دریافت فرمالی اور تحقیق ہوگئی کہ یہی حضرت اویس قرنی ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا اور کہا کہ) میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے۔

(دیکھو! نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید کی، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام اس امت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد آتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے، اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تاکید فرماتے ہیں کہ جب وہ آئیں تو ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت ضرور کرانا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اونچے درجہ والا ہو اس کو بھی دوسرے سے۔ جو چاہے اپنے سے کم درجہ والا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو اس سے۔ اپنے لیے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ کوئی بھی یہ نہ سمجھے کہ میں اونچے مقام والا ہوں، مجھے دوسرے سے دعا کی درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

(بہرحال! حضرت عمر نے ان سے دعا کی درخواست کی) تو حضرت اویس قرنی (سمجھتے تھے کہ یہ چھوڑیں گے نہیں، اس لیے) نے ان کے لیے دعاءِ مغفرت کی۔

چٹھی نہیں لکھوائی

(اس کے بعد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوفہ جانے کا ارادہ ہے۔ (یمن سے آئے تھے اور کوفہ جو عراق میں واقع ہے وہاں جانے کا ارادہ تھا، وہ بتلایا) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے لیے کوفہ کے گورنر کے نام چٹھی لکھ دوں؟ (دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود سامنے سے ان سے پوچھ رہے ہیں، حالانکہ وہ ایسے آدمی نہیں تھے کہ اصولی طور پر ایسی بات پوچھیں لیکن چوں کہ اویس قرنی کا خاص مقام تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ چٹھی لکھ دوں تا کہ وہ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے) تو انہوں نے فرمایا کہ میں عام لوگوں میں رہوں یہ مجھے زیادہ پسند ہے، اس لیے کوئی چٹھی نہ لکھیے، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (اگر آپ چٹھی لکھ دیں گے تو گورنر صاحب میرے لیے خاص اہتمام کریں گے، تو گویا میں بھی (VIP) ہو جاؤں گا، اور میں (VIP) بننا نہیں چاہتا، میں تو وہاں جا کر عام لوگوں میں زندگی گزاروں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ چٹھی نہیں لکھوائی۔ اب یہ تو کوفہ چلے گئے اور وہاں رہنے لگے۔ کوفہ والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا مقام کیا ہے۔)

خیر! دوسرے سال حج کے موقع پر کوفہ کے رہنے والوں میں سے ایک بڑا آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے حضرت اویس کے متعلق پوچھا کہ اویس کا کیا حال ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے ان کو دیکھا کہ معمولی مکان میں بہت قلیل سامان کے ساتھ رہتے ہیں۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی سے کہا کہ (اویس کس مقام کے آدمی ہیں؛ یہ تمہیں معلوم ہے؟) میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے پاس یمن سے آنے والے قافلوں میں اویس بن عامر آئیں گے، جن کا تعلق قبیلۂ مراد کی شاخ قرن سے ہے اور ان کو برص تھا اور ان کا وہ برص سوائے ایک روپیہ جتنی جگہ کے اچھا ہو گیا، اور ان کی ماں بھی ہے جن کی یہ بڑی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ کے یہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر وہ اللہ کا نام لے کر کسی بات پر قسم کھالیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دے۔ اور مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت کرا سکو تو کرا لینا۔

شہرت کی زندگی پسند نہ کی

(یہ ساری بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے اس آدمی کو بتائی) چنانچہ یہ آدمی جب حج سے واپس گیا تو حضرت اویس کی خدمت میں اہتمام سے حاضر ہوا اور کہا کہ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجیے (حضرت اویس بھی سوچنے لگے کہ آج تک تو یہ آدمی کبھی آیا نہیں، اور آج آیا؛ کیا بات ہے) حضرت اویس نے اس سے کہا کہ ابھی تو تم بڑی اونچی جگہ سے حج کر کے آ رہے ہو، تم میرے لیے دعاءِ مغفرت کرو (اس لیے کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ جو حج کر کے آوے، اس سے آپ اپنے لیے دعاءِ مغفرت کی درخواست کیجیے (مشکوٰۃ، ص۲۲۳) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! حاجی کی بھی مغفرت کر دے اور حاجی جس کے لیے دعاءِ مغفرت کرے، اس کی بھی مغفرت کر دے (شعب الایمان۔۴۱۱۲) تو حضرت اویس نے اس آدمی سے کہا کہ آپ بہت اچھی جگہ سے لوٹ کر آ رہے ہیں اس لیے آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجیے، لیکن اس نے کہا کہ نہیں! آپ پہلے میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجیے) تو حضرت اویس نے کہا کہ کیا وہاں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تھی؟ اس نے کہا: جی ہاں (تو وہ سمجھ گئے کہ اب تو یہ میرا پیچھا چھوڑے گا نہیں، اس لیے) حضرت اویس نے اس کے لیے دعاءِ مغفرت فرمائی (پھر تو اس آدمی نے باقاعدہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اپنی بستی میں ایک ایسی شخصیت موجود ہے۔ اب تک تو وہ گمنام رہتے تھے، کسی کو ان کا پتہ نہیں تھا، لیکن اب تو سب لوگوں کو پتہ چل گیا) چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کو پتہ چل گیا ہے تو وہاں سے رخصت ہو کر دوسری جگہ چلے گئے (انہوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اس طرح شہرت کے ساتھ زندگی گزاریں)

مسلم کے حوالہ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، ان میں ایک آدمی وہ بھی تھا جس کو معلوم نہیں تھا کہ حضرت اویس کا کیا مقام ہے۔ وہ ان کی ظاہری حالت اور مفلوک الحالی دیکھ کر ان کا مذاق اور ٹھٹھا اڑایا کرتا تھا۔ جب وہ قافلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو ان سے ان کا حال پوچھا، تو اس آدمی نے ان کا حال بتایا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا مقام بتلایا۔ تو پھر اس نے اپنی حالت سے توبہ کی کہ اب تک ان کا مقام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مَیں تو ان کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

روایت کا سبق

بہرحال! یہاں پر تو یہ بتانا ہے کہ دیکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے دعاءِ مغفرت کی تاکید فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسروں کو کہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اللہ کے نیک بندے ہوں ان سے ملاقات کرنی چاہیے اور ان سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے اور جس مقام پر وہ آباد ہوں وہاں کے لوگوں کو بھی ان سے

واقف کرانا چاہیے، اور تاکید بھی کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی ان سے فائدہ اُٹھائیں۔

چنانچہ اہل اللہ کے یہاں اس بات کا بھی اہتمام تھا۔ بعض اکابر کے واقعات میں ہے کہ ان کے مریدین اور معتقدین میں سے بعض لوگ جو اونچے مقام کے ہوتے تھے اور لوگ ان کے حال سے واقف نہیں ہوتے تھے تو لوگوں کو ان سے واقف کرنے کے لیے کوئی بات وہ ظاہر کر دیا کرتے تھے۔

بادشاہوں کا حال یہ تھا

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے جنازہ کی نماز وہ آدمی پڑھائے جس نے کبھی کسی غیر محرم کی طرف نظر نہ کی ہو، اور جس کی عصر کی چار سنتیں کبھی فوت نہ ہوئی ہوں۔ جنازہ لا کر رکھا گیا، اور یہ اعلان کیا گیا کہ حضرت شیخ کی یہ وصیت ہے۔ بڑا مجمع موجود تھا، کوئی آگے نہیں بڑھا۔ کئی مرتبہ جب اعلان ہوا اور کوئی آگے نہیں بڑھا تو سلطان شمس الدین التمشؒ (ان کا مزار قطب مینار کے علاقہ میں ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزار مہرولی میں ہے) آگے بڑھے اور کہا کہ حضرت شیخ نے میرا راز لوگوں کے درمیان کھول دیا۔ میں نے زندگی بھر کبھی کسی غیر محرم کی طرف نظر نہیں کی، اور میری عصر کی چار سنتیں کبھی فوت نہیں ہوئی۔ اس زمانہ کے بادشاہوں کا یہ حال تھا۔

ہم کو بھی دعا میں نہ بھولیو

٣٧٣: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ؓ قَالَ: اِسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْعُمْرَةِ، فَأَذِنَ لِيْ، وَقَالَ: لَا تَنْسَنَا يَاأُخَيَّ مِنْ دُعَائِكَ۔

وفی روایة: اَشْرِكْنَا يَاأُخَيَّ فِيْ دُعَائِكَ۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اور فرمایا کہ اے ہمارے پیارے بھائی! ہم کو بھی دعا میں نہ بھولیو۔

افادات: (۱) یہ بھی آداب میں سے ہے کہ آدمی اگر اپنے بڑوں کے ساتھ رہے تو جب کسی کام کے لیے باہر جانا ہو تو ان کی اجازت لے۔ یعنی ان کے سامنے اظہار کرے، اگر وہ اجازت دیں تو جائے۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کررہے ہیں، چوں کہ وہ بیت اللہ کی زیارت کو جارہے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جارہے ہوں، یا ایسے مقام پر جارہے ہوں جہاں دعا قبول ہوتی ہے تو ان کی خدمت میں دعا کے لیے درخواست کرنی چاہیے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وہ اس کی درخواست منظور کرلے تو اس کو بھی چاہیے وہاں اس کے واسطے دعا کرے۔

بابرکت جگہوں کی زیارت کرنا

اور چوں کہ اس باب کے عنوان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ بابرکت جگہوں کی زیارت کے لیے جانا، اسی مناسبت سے یہ آخری روایت لا رہے ہیں۔

۳۷۴: وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یزور قبآء راکباً وماشیاً۔ فیصلی فیه رکعتین۔

وفی روایة: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأتی مسجد قبآء کل سبت راکباً وماشیاً وکان ابن عمر یفعله۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قباء کی زیارت کے لیے کبھی سواری پر اور کبھی پیدل تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور وہاں جا کر دو رکعت ادا فرماتے تھے۔ اور

دوسری روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر سنیچر کو مسجد قباء سوار ہوکر اور کبھی پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ اور حضرت ابن عمر کا معمول بھی یہ تھا۔

افادات: قباء مسجد نبوی سے کافی دوری پر واقع ہے، اس زمانہ میں تو وہ مدینہ سے الگ ایک آبادی اور بستی تھی، آج کل تو مدینہ منورہ کا ہی ایک حصہ ہوگیا ہے، لیکن بہرحال وہ دوری پر واقع ہے، پھر بھی نبی کریم ﷺ وہاں کبھی سواری پر جاتے تھے اور کبھی پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ اس لیے دونوں طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ ہر پیر اور جمعرات کو وہاں جاتے تھے (مسند البزار ۱، ۳۰۳) اور یہ فضیلت بھی ہے کہ جو آدمی مسجد قباء جاکر دو رکعت نماز پڑھے، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقبول عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ (المعجم الکبیر۔ ۵۵٦۱)

توجہ نہ دی جائے

اس روایت سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایسی برکت اور فضیلت والی جگہیں جن کی فضیلت حدیث پاک میں آئی ہے، ان کی زیارت کے لیے بھی آدمی کو جانا چاہیے۔ چوں کہ ہمارے یہاں سے جو لوگ حج و عمرہ کے لیے جاتے ہیں ان کو بھی ایسی جگہوں کی زیارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ویسے وہاں ''زیارۃ زیارۃ'' کے نام سے موٹر گاڑی والے آواز تو دیتے ہی ہیں۔ لیکن بعض لوگ ان کی زیارت کرنے جانے والوں کو روکتے ہیں۔ تو میں بتادوں کہ ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ ایسے مقامات جن کی فضیلت حدیث پاک میں آئی ہے ان کی زیارت کے لیے بھی آدمی کو جانا چاہیے۔ اس روایت کو اسی لیے لائے ہیں کہ یہ بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اور جن چیزوں کا ثبوت ہے ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔

مدینۂ منورہ میں روزانہ دو عمرے

بمبئی کے ہمارے ایک حاجی داود صاحب ہیں وہ مدینہ منورہ میں ہم سے کہنے لگے کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے تو ایک عمرہ کرنے میں دیر بھی لگتی ہے اور محنت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن میں تو مدینہ میں رہتے ہوئے روزانہ آسانی سے دو عمروں کا ثواب لیتا ہوں۔ وہ اس طرح سے کہ یہاں فجر کی نماز کے بعد اشراق تک تو ذکر میں بیٹھا رہتا ہوں اور اشراق پڑھ لیتا ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جو آدمی فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھا رہے اور اللہ کی یاد میں مشغول رہے، اور اشراق پڑھ کر اٹھے تو اس کو ایک عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ اور پھر یہاں سے نکل کر قباء جاتا ہوں اور وہاں دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں۔ اس طرح روزانہ دو عمروں کا ثواب آسانی سے حاصل کر لیتا ہوں۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے یہ سب فضیلتیں اور ثواب کی بہت آسان آسان شکلیں مہیا کر دی ہیں، اور اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں جو ان چیزوں کو حاصل کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ آج ہم نے اپنی عقلوں اور اپنی سوجھ بوجھ کو دنیا میں ایسا لگا رکھا ہے کہ جہاں دو پیسے زیادہ ملتے ہوں وہاں تو ضرور جائیں گے، لیکن ایسے بڑے بڑے ثواب کے معاملہ میں ہم استغناء اور بے پرواہی اختیار کرتے ہیں۔ ہم میں اور ہمارے اسلاف میں یہی فرق ہے کہ وہ ان چیزوں کے حریص تھے، اور دنیا کی طرف سے بے رغبت تھے۔ اور ہم دنیا کے حریص ہیں اور ان چیزوں کی طرف سے بے رغبت ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے اور توفیق عطا فرمائے۔

﴿دعا﴾

سُبُحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمُدِكَ وَتَبَارَكَ اسُمُكَ وَتَعَالیٰ جَدُّكَ وَلَااِلٰهَ غَیُرُكَ.

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اے اللہ! جیسا کہ تیرے حبیب پاک ﷺ نے تاکید فرمائی، تیرے نیک بندوں کی زیارت اور ہم نشینی اور صحبت اور ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اور اے اللہ! ان کی اس محبت کو ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنا۔ اے اللہ! اسی کو ہمارے لیے آخرت میں نجات کا ذریعہ بنا۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما، حاجتمندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! تیرے جن بندوں نے ہم حاضرین مجلس سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں، سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو اور پوری امت محمدیہ کو عطا فرما۔ اور نبی کریم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، اے اللہ! ان سے ہماری اور پوری امت محمدیہ کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

فَضْلُ الْحُبِّ فِی اللّٰہِ وَالْحَثِّ عَلَیْہِ

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم۔بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح،آیت ٢٩)

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَوَالْإِيْمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَإِلَيْهِمْ۔ (الحشر، آیت ٩)

یہاں باب کا عنوان قائم کیا ہے ”فضلُ الحبّ فی اللّٰہِ والحثّ علیه واعلام الرجل من یحبه انه یحبه وماذایقول له اذااعلم“ **اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت، اور آدمی کا اس آدمی کو باخبر کرنا جس سے وہ اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہے۔ اور وہ اس کو جواب میں کیا کہے؟ اس کو اس باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ترغیب بیان کریں گے کہ یہ عمل کرنا چاہیے کہ دومؤمن آپس میں اللہ کی نسبت پر ایک دوسرے سے محبت کا تعلق رکھیں۔ اور اگر آپ کو کسی سے اللہ کے واسطے محبت ہے تو آپ کو چاہیے کہ اس کو بتلادیں کہ میں اللہ کی نسبت پر تم سے محبت کرتا ہوں اور جب کوئی آکر کہے کہ مَیں تم سے اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہوں تو جس سے یہ کہا گیا ہے وہ اس کو جواب میں کیا کہے؟ یہ ساری باتیں احادیث کے ذریعہ سے اس باب میں پیش کریں گے۔ پہلے تو علامہ نوویؒ نے دوآیتیں پیش کی ہیں۔**

صلحِ حدیبیہ

پہلی آیت ہے ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ یہ سورۂ فتح کی آخری آیت ہے۔ دراصل سورۂ فتح صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے چلے، احرام باندھا، اور مکہ مکرمہ آکر بیت اللہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، اور پھر حلق یا قصر کروا کر احرام کھول دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنا یہ خواب حضرات صحابۂ کرام کے سامنے بیان کیا، چوں کہ حضرات مہاجرین کو مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے ہوئے ایک طویل مدت ہوئی تھی، اور مکہ کی یاد تو ان کو ستاتی ہی رہتی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خواب کا ان کے سامنے تذکرہ کیا، تو فوراً سب تیار ہو گئے کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے جائیں گے۔ اور پھر یہ نبی کریم ﷺ کا خواب تھا اور نبی کا خواب چوں کہ وحی کا حکم رکھتا ہے، اس لیے ان کو یقین تھا کہ ان شاء اللہ اب یہ چیز ہمیں نصیب ہوگی، اس لیے سب نے ارادہ کر لیا اور نبی کریم ﷺ نے بھی ارادہ فرما لیا۔ ۶ ؁ھ ذوالقعدہ کے مہینہ میں نبی کریم ﷺ حضراتِ صحابہ کو لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مقامِ ذوالحلیفہ سے آپ احرام باندھ کر چلے۔ ادھر مکہ والوں کو پتہ چل گیا کہ حضور اکرم ﷺ حضراتِ صحابہ کو لے کر عمرہ کے ارادہ سے ہی چلے ہیں، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ عمرہ ہی کے لیے آرہے ہیں، لڑائی کا ارادہ نہیں ہے، لیکن انہوں نے سوچا کہ یہ لوگ اس طرح اطمینان کے ساتھ آئیں اور عمرہ کر کے چلے جائیں، اس میں ہماری ناک کٹ جائے گی، اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہ لوگ تم پر غالب آ گئے، اسی لیے مکہ والوں نے یہ طے کیا کہ ہم ان کو کسی بھی حال میں بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ کرنے نہیں دیں گے۔ اب قریش نے مکہ مکرمہ کے اطراف میں جو قبائل آباد تھے ان کو جمع کر کے یہ بات دوسرے طریقہ سے پیش کیا کہ یہ لوگ حرم کی حرمت کو ختم کرنے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ

پر حملہ کرنے کے واسطے مدینہ منورہ سے چلے ہیں، اس لیے آپ ہمارا ساتھ دیجئے، ہم سب مل کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ اور چوں کہ حرم کی حرمت کا تو سب ہی لحاظ کرتے تھے اس لیے انہوں نے بھی کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا ہے۔، اس طرح انہوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ہم ان کو کسی بھی حال میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

اِدھر نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور آپ نے مکہ مکرمہ کے حالات سے باخبر ہونے کے واسطے پہلے سے اپنے آدمی بھی آگے بھیج دیئے۔ مکہ والوں نے جب مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دینے کا فیصلہ کیا تو حضرت خالد بن ولید- جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے- کی سرکردگی میں گھوڑے سواروں کا پورا دستہ اس بات کے لیے مقرر کیا گیا کہ راستہ ہی میں جا کر ان کو روکا جائے۔ وہ اِدھر سے روانہ ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے جن کو بھیجا تھا انہوں نے آ کر آپ کو اطلاع دی کہ وہاں تو یہ صورتِ حال ہے، تو نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ نے خود اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ کیا ہم ایسا نہ کریں کہ مکہ مکرمہ کے اطراف کے جو لوگ مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے وہاں پہنچے ہوئے ہیں ان کے علاقے تو لڑنے والے مردوں سے خالی ہو چکے ہوں گے، اس لیے ہم ان کے علاقوں میں جا کر ان کے گھروں پر حملہ کریں تو وہ لوگ مکہ والوں کا ساتھ چھوڑ کر یہاں آنے پر مجبور ہو جائیں گے، اس طرح ہم مکہ والوں کے لشکر کی طاقت کو توڑ دیں گے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اور ہم تو اپنا یہ ارادہ ظاہر کر کے مدینہ منورہ سے چلے ہیں کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے واسطہ چلے ہیں، اس لیے ہم اپنے اسی ارادہ سے آگے بڑھیں، ابھی اپنے ارادے

میں کوئی تبدیلی نہ کریں، راستہ میں کوئی ہمیں روکے گا اور مقابلہ کی نوبت آئے گی تو دیکھ لیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔اس طرح آپ روانہ ہوئے۔ جب آپ مقامِ حدیبیہ میں پہنچے (''حدیبیہ'' جدہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے، جس کو آج کل ''شمسیہ'' کہا جاتا ہے، اس کا کچھ حصہ حدودِ حرم میں ہے اور کچھ حصہ حدود حرم سے باہر ہے) تو وہاں نبی کریم ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی، آپ ﷺ نے وہیں پڑاؤ ڈالا۔لوگ کہنے لگے ''خَلَأَتِ الْقَصوَآءُ، خَلَأَتِ الْقَصوَآءُ'' حضور کی اونٹنی بیٹھ گئی، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بیٹھنا اس کا شیوہ نہیں ہے ''حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ'' بلکہ جس ذات نے ہاتھی والوں کے لشکر کو حرم میں پہنچنے سے روکا تھا، اسی نے اس کو بھی آگے بڑھنے سے روکا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قریش اگر حرم کی حرمت کو باقی رکھنے کے لیے آج مجھ سے کوئی معاہدہ کرنا چاہیں گے تو میں ان کی ساری شرطیں منظور کر کے ان کے ساتھ معاہدہ کروں گا۔ پہلے آپ نے آدمی بھیجا، اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا کہ اے عمر! آپ جائیے۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو تو معلوم ہے کہ مکہ والوں کو میرے ساتھ کیسی عداوت ہے اور میرے خاندان کے زیادہ لوگ بھی وہاں نہیں ہیں جو میری حمایت کریں۔آپ حضرت عثمان ؓ کو بھیجیں، ان کے خاندان کے بہت سارے لوگ وہاں ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ان کو جا کر کہیں کہ ہم لڑنے کے واسطہ نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمارا راستہ چھوڑ دو، ہم زیارت کر کے واپس لوٹ جائیں گے۔اور وہاں جو لوگ اسلام لا چکے ہیں لیکن کمزوری کی وجہ سے ہجرت نہیں کر پائے ہیں ان کو بھی بتلا دو کہ ان شاء اللہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی

کی صورتیں پیدا فرمائیں گے۔ یہ دونوں پیغام الگ الگ کہلوائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب یہاں سے چلے تو مکہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ عثمان آرہے ہیں تو ان کے خاندان کے لوگ بڑی تعداد میں ان کے استقبال کے لیے آئے اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے کہ آپ جس کام کے لیے آئے ہیں وہ اطمینان سے کیجئے، آپ کا بال بھی کوئی بیکا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ پہنچ کر انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سردارانِ مکہ کو پہنچا دیا۔ جب یہ کام ہوگیا تو ان کے خاندان کے لوگوں نے کہا کہ آپ تو یہاں آ ہی گئے ہیں، آپ بیت اللہ کا طواف کر کے عمرہ کر لیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کے رسول کو تو وہاں روکا جائے اور اکیلا عثمان یہاں طواف کر لے؟ یہ ناممکن بات ہے۔ ان کے اس جواب پر ان کے خاندان والوں کو بھی ناراضگی ہوئی کہ ہم نے ان کی اتنی ساری حمایت کی اور یہ تو انہیں کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے ان کو روک لیا اور واپس جانے نہیں دیا۔ جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو یہاں مسلمانوں کے لشکر میں یہ مشہور ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دئے گئے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کیکر کے درخت کے نیچے حضراتِ صحابہ سے بیعت لی کہ ہم عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے، اسی بیعت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان حضراتِ صحابہ کو اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کا پروانہ دیا گیا ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸) اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا ان ایمان والوں سے جو آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اسی بیعت کو ”بیعتِ رضوان“ کہا جاتا ہے، یعنی وہ بیعت جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضامندی وخوشنودی کا پروانہ دیا گیا۔ اب یہ بات بھی وہاں پہنچ گئی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے آدمی بھیجے اور

وہاں سے بھی کچھ لوگ آئے اور پھر اخیر میں ان کی طرف سے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے سہیل بن عمرو آئے، اور دس سال کے لیے صلح ہوئی کہ ہم آپس میں لڑائی نہیں کریں گے۔ اس صلح میں بہت ساری شرطیں تھیں ان میں سے پہلی شرط یہ تھی کہ اس سال ہم آپ کو عمرہ اور بیت اللہ کی زیارت کرنے نہیں دیں گے، ابھی تو واپس جانا پڑے گا، آئندہ سال اسی مہینہ میں آئیے، تین روز یہاں قیام کیجئے گا، اور اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے سوائے ایک ایک تلوار کے اور وہ بھی میان میں ہونی چاہیے۔ دوسری شرط یہ بھی تھی کہ اگر یہاں سے کوئی آدمی آپ کے یہاں آجائے گا تو اس کو واپس کرنا پڑے گا، اور آپ کا کوئی آدمی یہاں آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے اور دوسرے قبائل کو اختیار ہے کہ اس صلح میں جو جس کا ساتھ دینا چاہے دے۔ خیر! اس طرح کی اور بھی شرطیں تھیں اور یہ شرطیں ایسی تھیں جن کو قبول کرنے کے لیے آدمی کی طبیعت آمادہ نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ معاملہ حضراتِ صحابہ کے سامنے پیش کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! ہم اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے اگر شہید ہو گئے تو کیا جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ضرور جاؤ گے تو کہنے لگے کہ پھر ہم اتنا دب کر کیوں صلح کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ بہر حال! ان شرائط کو قبول کرنا اور واپس لوٹنا مسلمانوں پر بڑا شاق گذرا، سب ایک ہی بات پر تیار تھے کہ ہم لڑ لیں گے، لیکن ایسی صلح کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے سامنے اپنی طبیعت کے خلاف اور جوشِ غضب کے باوجود سب نے آپ ﷺ کی بات مان لی۔ یہ حضراتِ صحابہ کی بڑی آزمائش تھی لیکن وہ حضرات اس آزمائش میں پوری کامیابی سے

پار نکلے، کسی ایک نے بھی حضور ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔

جب صلح نامہ لکھوایا جا رہا تھا اس میں یہ جملہ لکھا تھا کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ نے قریشِ مکہ سے کیا ہے۔ حضور ﷺ نے اس صلح نامہ کے الفاظ میں اپنے نامِ مبارک کے ساتھ لفظِ ''رسول اللہ'' لکھوایا تھا۔ تو قریش کی طرف سے جو سہیل بن عمرو آئے تھے انہوں نے کہا کہ لفظِ رسول اللہ کاٹ دو، اس کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھو۔ اس لیے کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ لکھنے کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ اے علی! لفظِ رسول اللہ مٹا دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واللّٰہِ لَاأَمْحُوكَ أَبَداً'' اللہ کی قسم! مَیں کبھی بھی نہیں مٹا سکتا۔ حضور ﷺ نے وہ تحریر اپنے ہاتھ میں لی اور پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ یہ لفظ کہاں لکھا ہے؟ اور پھر اپنے ہاتھ سے وہ لفظ مٹا کر اس کی جگہ پر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ، ۲/ ۳۵۴ تا ۳۶۲ اختصاراً)

اس موقع پر ان لوگوں نے جو لفظ رسول اللہ مٹوایا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح صلحِ حدیبیہ سے واپسی پر راستہ ہی میں نازل فرمائی اس میں خاص طور پر ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ﴾ (الفتح، آیت ۲۹) فرمایا گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' لکھ دیا تاکہ قیامت تک آپ ﷺ کے نام کے ساتھ یہ پڑھا جاتا رہے۔ مشرکین بھلے ہی لفظِ رسول اللہ کو مٹواتے رہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تو آپ رسول ہی ہیں۔

ویسے قرآنِ پاک میں عام طور پر جہاں آپ ﷺ کا تذکرہ آتا ہے وہاں آپ کو لقب اور صفت کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے جیسے ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ۔ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ۔ يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ آپ ﷺ کا نام صرف چار جگہوں پر خاص خاص مصلحتوں کے پیشِ نظر لیا گیا ہے۔ ایک تو سورۂ آل عمران میں آیا ہے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾

(آل عمران ، آیت ١٤٤) دوسری جگہ سورۂ احزاب میں ہے ﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ﴾ (الاحزاب، آیت ٤٠) تیسرا سورۂ محمد میں ہے ﴿وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ﴾ (محمد، آیت ٢) اور چوتھا سورۂ فتح میں ہے ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ﴾ (الفتح۔ آیت ٢٩) اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی مصلحت تھی، یہاں یہی مصلحت تھی جو میں نے بیان کی، اس لیے آپ کے نام کے ساتھ لفظ رسول اللہ بھی لایا گیا ہے۔

حضرات صحابہ کی خوبیاں

اور حضراتِ صحابہ جنہوں نے اس آزمائش کے موقع کے پر بھی نبی کریم ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا، حالانکہ پورا صلح نامہ ان کے جذبات کے خلاف تھا، پھر بھی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی پوری اطاعت وفرمانبرداری کی، اور چوں کہ آپ ﷺ کے بعد اور کوئی نبی آنے والے نہیں ہیں، اور آپ ﷺ اپنے پیچھے جہاں قرآنِ پاک کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، وہیں حضراتِ صحابہ کی تربیت کی ہوئی پوری ایک جماعت کو امت کے لیے نمونہ بنا کر چھوڑ کر جا رہے تھے، اس لیے اس موقع پر باری تعالیٰ نے ان کی خوبیاں بھی بیان فرمائیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کے ساتھ جو ایمان والے ہیں (ان کی سب سے پہلی خوبی جو بیان کی ہے وہ دراصل اس باب سے تعلق رکھتی ہے۔ کہ ان کے ساتھ جو رفقاء ہیں) وہ کافروں کے اوپر سخت ہیں اور آپس میں بڑے مہربان اور محبت رکھنے والے ہیں۔

اور کفار پر سختی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ سختی کرتے تھے، بلکہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں ان کی رشتہ داری اور دوستی درمیان میں حائل نہیں ہوتی، اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بڑی سے بڑی سختی

کرنے کے لیے تیار ہیں، بلکہ ان کی گردن کاٹنے کے لیے بھی تیار ہیں لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، وہاں اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو بھی چاہیے کہ اللہ کی نسبت پر آپس میں محبت اور مہربانی کا معاملہ کریں جیسا حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازی وصف تھا۔ حضرات صحابہ کے آپس میں اللہ کی نسبت پر محبت کے جو تعلقات تھے، اس کو بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں حضرات صحابہ کی خوبیاں بیان کیں وہاں سب سے پہلی خوبی یہ بیان کی۔

انصار کی مہاجرین سے للہ محبت

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَ وَالإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ (الحشر۔ آیت ۹) یہ سورۂ حشر کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ ''مالِ فئ''، یعنی وہ مال جو دشمنوں کے پاس سے بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے اس کے حق دار کون لوگ ہیں، ان کو اس سورت میں بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں ہے ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ﴾ (الحشر، آیت ۸) وہ مہاجرین فقراء جو اپنے شہروں اور مالوں سے نکالے گئے۔ اور دوسرے حق دار کا اس آیت ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَ﴾ میں تذکرہ ہے، جس میں انصار کا ذکر ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانہ بنایا مدینہ منورہ کو جو دارالاسلام ہے۔ یہاں دار سے مراد دارالہجرت یا دارالاسلام ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز مدینہ منورہ ہی ہے، اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بغیر جنگ کے اسلام کا مرکز بنایا اور پھر وہیں سے

دوسرے تمام علاقے فتح ہوئے۔ تو جنہوں نے ٹھکانہ بنایا مدینہ منورہ کو جو دارالاسلام ہے۔

﴿وَالإِيمَانَ﴾ اور جنہوں نے ایمان کو بھی ٹھکانہ بنایا، گویا ایمان لائے ﴿مِن قَبْلِهِمْ﴾ مہاجرین کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آنے سے پہلے۔ گویا انصار مدینہ منورہ میں پہلے ہی سے آباد ہیں اور ان کے آباء و اجداد یہاں آکر اسی لیے آباد ہوئے تھے کہ انہوں نے اگلی کتابوں میں یہ پڑھا تھا کہ نبی آخرالزمان ہجرت کر کے اسی جگہ آنے والے ہیں، اسی لیے وہ یہاں آکر بسے تھے کہ ان کو یا ان کی اولاد کو اللہ تعالیٰ ایمان لانے کی سعادت دے۔ تو ان کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ انہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا ٹھکانہ بنایا، اسلام کو اپنے دل کے اندر جمایا۔

اور تیسری خوبی یہ بتلائی ہے ﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے ان کے پاس پہنچے، ان کے ساتھ وہ محبت کرتے ہیں۔ ورنہ دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی جگہ سے آکر کسی اور آبادی میں رہتا ہے تو اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا جو اپنے آدمیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اجنبی کو اجنبی ہی کہا جاتا ہے، اور وہ پرایا ہی سمجھا جاتا ہے، چاہے اس کی دو تین نسلیں گذر جائیں۔ لیکن حضراتِ انصار نے حضراتِ مہاجرین کے ساتھ محبت کا وہ سلوک کیا کہ ان کو اپنے گھروں میں جگہ دی، ان کا سارا خرچہ برداشت کیا، مال میں ان کو اپنے ساتھ شریک کیا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جاکر انہوں نے درخواستیں پیش کیں۔ ایک ایک مہاجری کو اپنے پاس رکھنے کے لیے انصار آپس میں جھگڑتے تھے۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ اس کو میرے یہاں ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے لیے نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ قرعہ اندازی فرمائی، اور اس میں جس کا نام نکلا اس کے یہاں اس کو ٹھہرایا گیا۔ گویا ان کا یہ ایسا وصف ہے کہ اس زمانہ سے

لے کر آج تک کوئی بھی اس کا نمونہ پیش نہیں کر سکا﴿یُحِبُّونَ مَنْ ھَاجَرَ إِلَیْھِمْ﴾ ان کی یہ محبت جو حضرات مہاجرین کے ساتھ تھی وہ اللہ کی نسبت پر تھی، اس لیے اس آیت کو یہاں پر لائے ہیں۔

ایمانی حلاوت کے تین اعمال

۳۷۵: عنْ أَنس رضی اللہ عنہ عنِ النَّبیِّ ﷺ قَالَ: ثَلاَثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَبِھِنَّ حَلاَوَۃَ الْاِیْمَانِ، أَن یَّکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ أَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا، وَأَن یُّحِبَّ الْمَرْءَ لاَیُحِبُّہُ اِلاَّلِلّٰہِ، وَأَنْ یَّکْرَہَ أَن یَّعُوْدَفِی الْکُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَہُ اللّٰہُ مِنْہُ، کَمَا یَکْرَہُ أَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کے اندر تین باتیں ہوں گی، وہ ایمان کی حلاوت کو محسوس کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کے نزدیک ان دونوں کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ اور آدمی کسی دوسرے شخص سے محض اللہ کے لیے محبت کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جب اس کو کفر سے نجات دی تو پھر اس میں لوٹنے کو ایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

افادات: ''ایمان کی حلاوت'' سے کیا مراد ہے؟ تو عام طور پر اس حدیث کی شرح کرنے والے علماء فرماتے ہیں کہ اس سے حلاوتِ معنوی مراد ہے۔ اس لیے کہ ایمان کھانے پینے کی محسوس چیز نہیں ہے جس کی مٹھاس اور شیرینی کو کوئی آدمی حسی طور پر محسوس کرے۔ بلکہ یہ ایک معنوی وصف ہے۔ گویا جس کے دل کے اندر ایمان سرایت کر جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی بجا آوری میں لذت محسوس کرے گا۔ استلذاذ بالطاعات یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادتیں کر کے اس کو مزہ آئے گا۔ اور دین پر عمل کرنا بڑا مشقت کا کام ہے لیکن جس آدمی کے دل میں ایمان گھر کر جاتا ہے اور یہ تینوں باتیں

پائی جاتی ہیں اس کے لیے ایمان کے نتیجہ میں جو احکام دیے گئے ہیں ان پر عمل کرنا مشکل اور دشوار نہیں رہتا، بلکہ اس میں اس کو مزہ آتا ہے۔

بھائی! سردی کے موسم میں آخری رات میں جلدی اُٹھ کر نماز پڑھنا، گرمی کے زمانہ میں سخت گرمی میں روزے رکھنا، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن جن کے دل میں ایمان گھر کیا ہوا ہوتا ہے ان کو اس میں مزہ آتا ہے، ان تکلیفوں کو برداشت کرنے میں وہ لوگ لطف محسوس کرتے ہیں؛ اسی کو ایمان کی حلاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا ایک قسم کی مٹھاس محسوس کر رہے ہیں۔

اور ابن ابی الجمرہ جنہوں نے بخاری شریف کی منتخب احادیث کی تشریح کی ہے اور ان کی وہ کتاب "بَهْجَةُ النُّفُوس" کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہاں مٹھاس سے حسی مٹھاس مراد ہے یعنی جیسے ہم کوئی میٹھی چیز کھاتے اور اس کی شیرینی محسوس کرتے ہیں اسی طرح جن کے دل میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کو حسی طور پر بھی ایمان کی مٹھاس کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ جو آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے وہی اس کو محسوس کرسکتا ہے، اس لیے جو وہاں تک نہیں پہنچا ہے اس کو چاہیے کہ جو محسوس کر رہے ہیں ان کی باتوں کو مان لے اور ان کی تصدیق کرے: ؎

لذتِ ایں بادہ نہ یابی بخدا تا نہ چشی

یہ جام ایسا ہے کہ اس کا لطف اور اس کی لذت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کو چکھتا ہے اس لیے جن کو محسوس ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں تو اس کو مان لینا چاہیے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جن میں تین باتیں ہوں وہ اپنے اندر

ایمان کی مٹھاس محسوس کرے گا۔پہلی بات ہے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول اس کے نزدیک ان دونوں کے ماسوا سب سے زیادہ محبوب ہوجائیں۔اصل الاصول تو اللہ تعالیٰ کی محبت ہے،اور مخلوق میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب اوراس کی صفات اور شئون کا مظہر نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے،اس لیے اللہ کی محبت کے نتیجہ میں حضور ﷺ کے ساتھ بھی اسی طرح کی محبت ہوگی۔پھر جو جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا، اللہ کے صالحین اور مقرب بندوں کی محبت بھی دلوں میں اسی مقدار میں ہوگی۔ورنہ اصل محبت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

اورآدمی کسی دوسرے شخص سے محض اللہ کے لیے محبت کرے۔اس روایت کو یہاں تو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ اللہ کے واسطے کسی سے محبت کرنا وہ چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ ایمان کی حلاوت نصیب کرتے ہیں۔

ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا”مَنْ أَعْطٰی لِلّٰهِ ومَنَعَ لِلّٰهِ وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِاسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ“ جس نے کچھ دیا تو اللہ کے واسطے دیا،اور نہیں دیا تو اللہ کے واسطے۔کسی سے محبت کی تو اللہ کی وجہ سے کی،اور کسی سے عداوت اور دشمنی رکھی تو اللہ کے واسطے رکھی؛تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو کامل الایمان ہوتا ہے اس کے سارے تعلقات اور ہر کام اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتے ہیں۔اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ وہ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے،اعزاء واقرباء اور دوسرے لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ماں باپ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا ہے،گویا اپنے نفس کے تقاضہ کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کرتا

ہے۔اس کے نزدیک ساری دنیا سے تعلقات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ سے جب محبت ہوگی تو وہ آدمی ایمان کی مٹھاس کومحسوس کرے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے جب اس کوکفر سے نجات دی تو پھر کفر میں دوباہ لوٹنے کوایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کوناپسند کرتا ہے۔چوں کہ اس زمانہ میں لوگ کفر سے ہی اسلام میں داخل ہوتے تھے،تو گویاجب اللہ تعالیٰ نے اس کوکفر سے نجات دے کراسلام لانے کی سعادت عطافرمائی،تو دوبارہ کفر میں لوٹنے کووہ اتنا ہی برا سمجھتا ہے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔یعنی دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کو کبھی تیار نہیں ہوتا۔

جس میں یہ تین باتیں ہوں گی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی ایمان کی حلاوت کومحسوس کرے گا۔اوراس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طاعات کی بجا آوری اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنا بہت آسان ہوگا بلکہ اس میں اس کولطف اورمزہ آئے گا۔

فضلُ الحُبِّ فی اللہ ِ والحثِّ علیہ

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

باب کا عنوان تھا کہ اللہ کے واسطے آپس میں جو تعلق اور محبت قائم کی جاتی ہے اس کی کیا فضیلت ہے؟ اسی سلسلہ میں یہ روایت لائے ہیں۔

عرش کے سائے میں سات آدمی

۳۷۶: عَنْ أَبی هریرةَ رضی الله عنه عنِ النَّبیّ صلی الله علیه وسلم قَالَ: سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِی ظِلِّهِ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ؛ اِمَامٌ عَادِلٌ۔ وَشَابٌّ نَشَأَفِی عِبَادَةِاللّٰهِ عزوجل۔ وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ۔ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ، اِجْتَمَعَاعَلَیْهِ وَتفرَّقَاعَلَیْهِ۔ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حُسْنٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ اِنِّی أَخَافُ اللّٰهَ۔ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُهُ۔ وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے سائے میں اس دن جگہ دیں گے جب اللہ کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ایک وہ حکمران جو عدل وانصاف سے کام لے۔ دوسرا وہ نوجوان جس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ تیسرا وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہوا ہو۔ اور ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی، اسی کی خاطر آپس میں ملے اور اسی کی خاطر جدا ہوئے۔ اور وہ آدمی جس کو کسی حسن وجمال والی عورت نے برائی وبدکاری کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کسی غریب کو دیا اور ایسا چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو آ گئے۔

سایہ سے کیا مراد ہے؟

افادات: قیامت کا دن بڑا سخت اور تکلیف دہ دن ہے۔ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ سورج دو یا تین میل کی دوری پر ہوگا اور گرمی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے،کوئی ٹخنوں تک،کوئی گھٹنوں تک،کوئی کمر تک،کوئی گلے تک،کوئی کان تک اور کوئی اپنے پسینہ میں تیر رہا ہوگا۔اس دن کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ ایک خاص ٹھنڈک میں گویا اپنی چھاؤں میں جگہ دیں گے۔اب یہاں اللہ کے سائے سے کیا مراد ہے؟ایک قول یہ ہے کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی توجہ اور عنایت کا ایسا معاملہ کیا جائے گا جس کی وجہ سے اس دن کی تپش اور حرارت سے وہ محفوظ رہیں گے،گویا ایرکنڈیشن میں ہوں گے۔ بعض لوگوں نے دوسری روایتوں کے پیش نظر اللہ کے عرش کا سایہ مراد لیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔

امام عادل عام ہے

ایک وہ حکمران جو عدل وانصاف سے کام لے۔پہلے بھی بتلا چکا ہوں کی امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے بھی ہوتا ہے،امامت کبریٰ بول کر یہی مراد لیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور حضراتِ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد بھی ایک طویل زمانہ تک یہ سلسلہ رہا کہ جو حکمرانِ اعلیٰ ہوتا تھا وہی نماز کی بھی امامت کرتا تھا،لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ دونوں چیزیں الگ ہوگئیں۔

خیر!حکمرانِ اعلیٰ جو سب کا حاکم ہو اس کو امام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ایسا حکمران جو اپنے ماتحت رعیت کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لے،تو وہ قیامت

کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔ اور حکمران چوں کہ صاحبِ اختیار ہوتا ہے، سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے، وہ جو کچھ کرنا چاہے اس کے لیے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، ایسا حکمران جب انصاف سے کام لیتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈر اس کے دل میں موجود ہے، اسی ڈر اور اللہ کے ساتھ کے تعلق کی وجہ سے وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اور اسی کی وجہ سے روزِ قیامت جبکہ گرمی اپنی شدت پر ہوگی اس کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائیں گے۔

اور جہاں امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے کیا گیا ہے، وہیں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضراتِ شراح نے لکھا ہے کہ ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ اختیارات دے رکھے ہیں۔ ایک آدمی اپنے پورے خاندان کا ذمہ دار ہے، تو اس کے خاندان کے سارے افراد اس کی ماتحتی میں ہیں۔ اسی طرح ایک آدمی اپنے گھر کا ذمہ دار ہے تو اس کے گھر میں جتنے افراد رہتے ہیں وہ اس کی ماتحتی میں ہیں۔ اور شوہر ہے تو اس کی بیوی اور اس کی اولاد اس کی ماتحتی میں ہیں۔ اور بیوی ہے تو شوہر کی بہت ساری چیزیں اسی کے دائرۂ اختیار اور حفاظت میں ہوا کرتی ہیں۔ بلکہ اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے تو اس کو اپنے اعضاء اور اپنی ذات پر اختیار حاصل ہے، تو اپنے اعضاء کو استعمال کرنے کے معاملہ میں وہ عدل وانصاف سے کام لے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں جو احکامات دئے ہیں اور شریعت کی طرف سے جو ہدایتیں دی گئی ہیں ان کے مطابق وہ اپنے اعضاء وجوارح کو استعمال کرے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں استعمال نہ کرے، تو یہ بھی امام عادل کے عموم میں داخل وشامل سمجھا

جائے گا۔ ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے بتلایا کہ اصل میں تو امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اور ایسے حکمران ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے زمانۂ حکمرانی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پوری پوری رعایت کی۔

نکیل خود پکڑ کر لائے

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں بخاری شریف میں ایک واقعہ موجود ہے کہ حضرت اسلم رضی اللہ عنہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے آزاد کردہ غلام ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امیر المؤمنین کے ساتھ جا رہا تھا، راستہ میں ایک عورت ملی اور اس نے کہا کہ مَیں خُفَاف بن اِیْمَاء غفاری کی بیٹی ہوں، میرے ابا غزوۂ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے اور آج میرے بچے بھوک کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہر گئے اور کہا کہ بہت ہی قریبی نسبت کا تم نے حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المال کے مخزن پر تشریف لے گئے اور ایک مضبوط قسم کا اونٹ نکال کر اس پر دو بوریوں میں غلہ بھر کر لادا، اور بیچ میں کپڑے اور نقدی رکھ کر اس اونٹ کی نکیل خود پکڑ کر لائے اور اس عورت کے حوالہ کر دیا، اور کہا کہ یہ ختم نہ ہونے پائے گا کہ اس سے پہلے دوسرا آجایا کرے گا۔ کسی آدمی نے یہ سارا معاملہ دیکھ کر کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ نے اس کو بہت زیادہ دے دیا، اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے باپ اور بھائیوں نے ایک قلعہ کی فتح میں حصہ لیا اور اس سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوا، آج بہت سارے لوگ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ گویا اس سب کے مقابلہ میں اس کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ تو بہت کم ہے۔ بہر حال! اس طرح کے واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں موجود ہیں۔ (بخاری شریف۔ باب غزوۃ حدیبیہ۔ ٣٩٢٨)

خود کھانا پکایا

ایک مرتبہ رات کو تفتیش کے لیے نکلے، دیکھا کہ ایک عورت ہنڈیا کو چولہے کے اوپر رکھے ہوئے ہے، اور وہیں اس کے بچے رو رہے ہیں۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ پکانے کے واسطے کچھ ہے نہیں، صرف بچوں کو بہلانے کے واسطے چولہے پر ہنڈیا میں پانی رکھا ہے تاکہ بچے بہل کر سو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے، فوراً واپس گئے اور کھانے کا سامان لائے اور خود چولہا جلا کر کھانا پکایا۔ حضرت اسلم کہتے ہیں کہ چولہے کی لکڑیاں جلانے کے واسطے پھونک مارتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی پوری ڈاڑھی بھی دھویں سے بھر گئی۔ جب کھانا پک گیا تو اپنے سامنے ان بچوں کو کھلایا اور فرمایا کہ جس طرح میں نے ان کو روتا ہوا دیکھا تھا، اب ہنستا ہوا دیکھ کر جانا چاہتا ہوں۔

کتنے بچے ضائع کر دیے

ایک اور موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ حالات کی تفتیش کے لیے نکلے ہوئے تھے، دیکھا کہ ایک بچہ رو رہا ہے، اس کی ماں سے کہا: یہ کیوں رو رہا ہے؟ اس کو راضی کرو اور اس کا رونا بند کراؤ۔ یہ کہہ کر آگے تشریف لے گئے، پھر جب دوبارہ وہاں سے گذرے تو دیکھا کہ وہی بچہ رو رہا ہے تو اس عورت کو تنبیہ کی۔ وہ عورت نہیں جانتی تھی کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ تیسری مرتبہ پھر تنبیہ کی تو اس عورت نے کہا کہ دراصل مَیں تو اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں، اس لیے رو رہا ہے۔ اس بچہ کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس بچہ کی عمر اتنی تو نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا دودھ چھڑایا جائے، ابھی سے اس کا دودھ کیوں چھڑوا رہی ہو؟ تو اس نے کہا کہ امیر المؤمنین بچوں کا وظیفہ اسی وقت مقرر کرتے ہیں جب ان کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ اس لیے میں

اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور آپ کی ہچکیاں بندھ گئی، اور اتنا روئے کہ اس روز صبح کی پوری نماز میں بھی روتے رہے، اور نماز کے بعد کہا "کَمْ ضَیَّعْنَاأَطْفَالَ الْمُسْلِمِیْنَ" ہم نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ضائع کر دیا، اس کے بعد اعلان فرمادیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔

آج کل بچوں کے وظیفے جو یوروپین ممالک میں جاری کئے جاتے ہیں، یہ بھی دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے جو جاری کئے تھے اسی کی نقل ہے۔

بہرحال! بات امام عادل کی چل رہی تھی۔تو آدمی کے ماتحت جو بھی ہوں وہ ان کا حکمران ہے۔مثلاً کوئی آدمی کسی فیکٹری کا مالک ہے، اور اس کے ماتحت بہت سارے مزدور کام کرتے ہیں، تو ان کے تمام معاملات میں بھی اس کو عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے۔ایسی تمام صورتیں جو ان کے استحصال کی ہوں، بلا معاوضہ ان سے فائدہ اُٹھا کر ان کے حقوق کو ضائع ہوتے ہوں؛ اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔

بہرحال! ہر وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ اختیار دیا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں جو لوگ بھی آتے ہیں، ان کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لے۔

خواہشات کو رام کر کے

دوسرا وہ نوجوان جس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اندر ہوئی ہو۔ نوجوانی میں جو جذبات ہوتے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی

شہوتیں پوری کرے اور رنگ رلیاں منائے، لیکن ایسی جوانی کے زمانہ میں بھی اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے احکامات مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے جذبات کو دبا کر اپنی خواہشات کو رام کر کے، اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری واطاعت کا اہتمام کیا، گویا کہ اس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی؛ تو ایسا نوجوان بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔

جس کا دل مسجد میں اٹکا ہو

اور تیسرا وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہوا ہے۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ وہ آدمی جب مسجد سے باہر نکلتا ہے تو دوبارہ جب تک مسجد میں واپس نہیں آجاتا، وہاں تک اس کا دل مسجد ہی میں لگا رہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ اس کا ایسا تعلق ہے کہ ایک نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ گھر یا دوکان پر واپس لوٹتا ہے تو دوسری نماز کا وقت آنے تک اس کا دل اسی طرف اٹکا ہوا رہتا ہے۔ جیسے ظہر کی نماز پڑھ کر اگر اپنے کسی کام یا ضرورت کے لیے گھر پر گیا، یا تجارت میں لگا ہے، تب بھی دل تو مسجد کے اندر ہی اٹکا ہوا ہے کہ کب عصر کا وقت ہو، اذان سنوں اور دوبارہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں۔ گویا ہر وقت اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز کی ادائیگی کا خیال اور اہتمام ہے، اور اس کی وجہ سے دل اسی فکر میں مشغول ہے؛ ایسا آدمی بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔

فرشتوں کی آمین کا کیا؟

نماز کی جماعت کے لیے جو قدم اُٹھائے جاتے ہیں اس کے بارے میں حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی تنہا نماز پڑھے اس کے مقابلہ میں جماعت کے ساتھ

نماز پڑھنے پرپچیس (۲۵) گنا ثواب زیادہ ملتا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، اور اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو قدم بھی مسجد کی طرف اُٹھاتا ہے اس پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

اور بعض روایتوں میں ستائیس (۲۷) گنا ثواب کا تذکرہ آیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہو، مسجد کے ساتھ ان کا ایسا تعلق ہوتا تھا کہ وہ کسی لمحہ بھی جماعت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

حضرت امام محمد بن سلمہؒ جو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگردوں میں سے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ روزانہ دوسو رکعات نفل نماز پڑھا کرتے تھے، اور جماعت کی نماز کا بڑا اہتمام تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی وجہ سے جماعت چھوٹ گئی تو چوں کہ حدیثِ پاک میں جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس (۲۷) گنا بتلایا گیا ہے۔ اور وہ تو فقیہ تھے اور جانتے تھے کہ ایک مرتبہ پڑھ لینے سے فریضہ ادا ہو جاتا ہے، اس کے باوجود اس حدیث کی وجہ سے انہوں نے اس نماز کو تنہا ستائیس (۲۷) مرتبہ ادا کیا، تاکہ جماعت کی نماز کی ستائیس گنا والی فضیلت حاصل کی جاسکے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اپنے خاص بندوں کے ساتھ انہیں کے مناسب ہوا کرتا ہے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے "يَا ابْنَ سَلِمَةَ! كَيْفَ بِتَأْمِيْنِ الْمَلَائِكَةِ؟" اے ابن سلمہ! فرشتوں کی آمین کا کیا کروگے؟ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور اس میں امام کے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھنے کے بعد آمین کہتا ہے تو اس وقت فرشتے آمین کہتے ہیں "فَمَنْ وَافَقَ تَأْمِيْنُهُ

تَأْمِیْنَ الْمَلاَئِکَةِ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ" جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوجاتی ہے یعنی وہ بھی اسی وقت آمین کہے جس وقت فرشتے آمین کہہ رہے ہوں تو اس کے اگلے سارے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔اس طرح گویا ان کو تنبیہ کردی گئی کہ آپ نے اس نماز کو ستائیس مرتبہ ادا تو کرلیا لیکن جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں امام کے ساتھ آمین کہنے پر جو فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ کہاں سے حاصل ہوسکتی ہے۔بہرحال! آدمی کا دل مسجد کی طرف لگا رہنا چاہیے کہ کب نماز کا وقت ہو اور مَیں پہنچوں۔

سنن ونوافل کا مقصد

آج کل تو مصیبت یہ ہوگئی کہ مسجد میں آنے بعد بھی لوگ باہر ہی کھڑے رہتے ہیں، وضو کرکے جماعت خانہ سے باہر ہی کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں اور گھڑی دیکھتے رہتے ہیں کہ ابھی تو پانچ سات منٹ باقی ہیں، سنتیں پڑھنے کی یا تلاوت و تسبیح میں مشغول ہونے کی توفیق نہیں ہوتی۔حالانکہ نماز سے پہلے سنتیں اسی لیے رکھی گئی ہیں کہ آدمی ان کو پڑھ کر اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرکے فرض ادا کرنے کے قابل بنائے۔گویا فرض کی ادائیگی اس شان کے ساتھ ہونی چاہیے کہ اس کا دل پورے طور پر اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف متوجہ ہوچکا ہو، اور رجوع وانابت کی ایسی کیفیت حاصل ہوچکی ہو کہ دوسرے سارے خیالات اس کے دل سے نکل چکے ہوں۔اسی کیفیت کو بنانے کے لیے اس سے پہلے سنتیں رکھی گئی ہیں، لیکن اب اس کا بھی اہتمام ختم ہوتا جارہا ہے، اور وقت ہونے کے باوجود لوگ اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتے۔یہ بڑی کوتاہی کی بات ہے۔

اللہ کے لیے باہم محبت

اور ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی، اسی کی خاطر آپس میں ملے اور اسی کی خاطر جدا ہوئے۔ بعض تعلقات تو وہ ہوتے ہیں جو ہم آپس میں اپنی اغراض، تجارت وکاروبار اور دنیوی کام کاج کے لیے قائم کرتے ہیں، ان تعلقات کے پیشِ نظر بھی آپس میں ملاقاتیں ہوتی ہیں، اس کے لیے بھی لوگ آپس میں ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک تعلق وہ ہوتا ہے جو اللہ کی نسبت پر، دین سیکھنے اور سکھانے اور دین کی باتوں کو عام کرنے کے واسطے قائم کیا جاتا ہے۔ اس نسبت سے آپس کے جو تعلقات ہوتے ہیں کہ اسی نسبت پر آپس میں ملے اور کام پورا ہونے پر اسی نسبت پر جدا بھی ہوئے۔ یہی وہ تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر وقیمت رکھتا ہے۔ اور اس روایت کو علامہ نوویؒ یہاں اسی بات کو بتلانے کے واسطے لائے ہیں کہ دیکھئے! یہ محبت وہ تھی جو اللہ کے واسطے تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو قیامت کے روز اپنے عرش کے سائے میں جگہ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپس میں دین کی نسبت پر تعلقات قائم کر کے ان کو ترقی دینے اور بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اکثر تعلقات اگر اسی نسبت پر قائم کر لیے جائیں تو ان شاء اللہ یہ فضیلت آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کی بڑی قدر وقیمت ہے

اور وہ آدمی جس کو حسن وجمال والی کسی عورت نے برائی وبدکاری کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ جوانی میں ویسے بھی آدمی پر شہوات کا غلبہ ہوتا ہے، نفس وشیطان کی طرف سے تقاضے ہوتے ہیں، اب ایسی حالت میں اگر کوئی

عورت اس قسم کی پیشکش کرے تو عام طور پر آدمی اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کو ایسی حسن و جمال والی عورت (اور دوسری روایت میں "ذات منصب" کے الفاظ آئے ہیں) جو شریف گھرانے کی بھی ہو۔ یعنی آبرو باختہ اور پیشہ ور عورتیں تو اپنی طرف دعوتیں دیتی ہی رہتی ہیں اور شریف آدمی اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا، لیکن جو عورت شریف گھرانے کی ہے اور حسین و جمیل بھی ہے، اگر ایسی عورت دعوت دے، اس کے باوجود کوئی آدمی یہ کہہ کر اپنے آپ کو اس سے الگ رکھے تو اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ بہت راضی اور خوش ہوتے ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نوازشات ہوتی ہیں۔

امتِ محمدیہ کے یوسف

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت سلیمان بن یسارؒ کا واقعہ لکھا ہے۔ یہ تابعین میں سے ہیں، بڑے حسین و جمیل تھے، فقہاءِ سبعہ مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، ایک مرتبہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حج یا عمرہ کے لیے جا رہے تھے، مقامِ ابوا میں انہوں قیام کیا اور خیمہ لگایا، ان کا ساتھی بازار میں کچھ لینے کے واسطے گیا۔ جہاں انہوں نے خیمہ لگایا تھا وہاں ایک چھوٹی سے پہاڑی تھی اور اس پر تنبو میں ایک بدو اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا، وہ عورت بھی بڑی حسین و جمیل تھی۔ جب اس عورت نے ان کو دیکھا تو ان پر فریفتہ و عاشق ہوگئی، اور وہ اس انتظار میں رہی کہ تنہائی کا موقعہ ملے تو میں ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے تو وہ فوراً پہاڑی سے اتر کر ان کے خیمہ میں پہنچ گئی اور اپنے چہرے پر سے نقاب ہٹا دیا۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ وہ اتنی حسین و جمیل تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔

حضرت سلیمان بن یسارؒ تو اس کو دیکھ کر گھبرا گئے، وہ سمجھے کہ کوئی چیز مانگنے کے واسطے آئی ہے، اس لیے دینے کے واسطے کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنے لگے۔ اس نے کہا کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ میں تو آپ سے وہ چیز چاہتی ہوں جو ایک عورت مرد سے چاہا کرتی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر اتنی زور زور سے رونا شروع کیا کہ وہ عورت بھی گھبرا گئی، اور یہ سوچ کر کہ کہیں رسوائی نہ ہو جائے جلدی سے وہاں سے چلی گئی یہ روتے رہے جس کی وجہ سے آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کا ساتھی جب واپس آیا تو ان کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے معاملہ کو چھپانے کے لیے کہا کہ گھر والے یاد آ گئے ہیں۔ اس نے کہا: نہیں! گھر والوں کی یاد میں آدمی ایسا نہیں روتا، سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے ساری تفصیل بتائی تو وہ بھی رونے لگا۔ انہوں نے کہا: تو کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ میں یہاں نہیں تھا، ورنہ میں تو پھنس ہی جاتا، اور اپنے آپ کو اس طرح بچا نہ پاتا جیسا تم نے اپنے آپ کو بچایا۔

خیر! آگے چلے اور مکہ مکرمہ پہنچے۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد اپنی چادر میں لپٹ کر مقامِ ابراہیم اور حجر اسود کے بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ غنودگی طاری ہوئی، خواب کی حالت میں ایک حسین اور خوبصورت نوجوان کو دیکھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا: آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: میں یوسف ہوں۔ پوچھا: یوسف صدیق ہو؟ کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا زلیخا کے ساتھ کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: وہ ابوا والی عورت کے ساتھ تمہارا قصہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا عمل کیسا قبول ہوا۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ

گناہ کے مواقع میں اپنے آپ کو بچالینا اور اپنی حفاظت کر لینا؛ یہ وہ عمل ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ حضراتِ انبیاء کا عمل ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نوازش ہوتی ہے۔ ایسا آدمی بھی کل قیامت میں اللہ کے عرش کے سائے میں جگہ پائے گا۔

......تب تک صدقہ قابل قبول نہیں

اور وہ آدمی جس نے صدقہ کسی غریب کو دیا اور ایسا چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ یعنی صدقہ چھپا کر دینے میں ریا ونمود سے حفاظت ہوتی ہے، اور ساتھ ہی جس کو دیا جا رہا ہے اس کی عزت وحرمت کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ اگر اس طرح دیا جاتا ہے کہ لوگ دیکھیں تو اس سے جس کو دیا جا رہا ہے اس کی غیرت پر بڑا اثر پڑتا ہے، اس لیے اگر چھپا کر دیا جائے تو اس سے بھی اس کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ کوئی آدمی یہ سمجھ کر صدقہ دے کہ جس غریب کو صدقہ دے رہا ہوں، وہ اس مال کا جتنا محتاج ہے، مَیں اس صدقہ کے ثواب کا اس سے زیادہ محتاج ہوں، اور اس کا احسان میرے اوپر اس سے زیادہ ہے جتنا میرا اس پر ہے؛ تب تک اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدقہ قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے یہ بھی ایک خاص چیز ہے، لہٰذا کوئی یوں نہ سمجھے کہ صدقہ دے کر میں احسان کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھے کہ وہ قبول کر کے میرے اوپر احسان کر رہا ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ثواب مل رہا ہے۔

......اور آنسو آ گئے

اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں

اور آنسو آ گئے۔ ظاہر ہے کہ تنہائی میں تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے کہ وہاں ریا ونمود اور دکھلاوا مقصود ہو، بلکہ تنہائی میں جو آدمی اس طرح اللہ کو یاد کر کے روئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر ہی کی وجہ سے روئے گا۔ تو یہ چیز بھی اللہ تعالیٰ کو بڑی پسند ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان اعمال کا اہتمام کرنے کی سعادت وتوفیق عطا فرمائے

فضلُ الحُبِّ فی اللہِ والحثِّ علیہ

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

اللہ کے واسطے محبت اور تعلق رکھنے کی کیا فضیلت ہے، اور اس کی ترغیب بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

آج میں ان کو سایہ دوں گا

۳۷۷. عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ أَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلاَ لِیْ، اَلْیَوْمَ أُظِلُّھُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلِّیْ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز یہ اعلان کریں گے کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو میری عظمت و بڑائی کی خاطر آپس میں محبت رکھتے تھے؟ آج میں ان کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا جبکہ میرے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔

افادات: اللہ تعالیٰ تو سب کو جانتے ہیں لیکن محشر میں جمع ہونے والے سارے مجمع کے اندر ان کے اس مقام کا لوگوں کو پتہ چل جائے اور دوسروں سے وہ ممتاز ہو جائیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی آدمی نیکی کا کوئی کام انجام دے، تو اگر حوصلہ افزائی کے واسطے اس کو دوسروں کے سامنے ممتاز کیا جائے، تا کہ دوسروں کو بھی پتہ چلے اور اس کام کی ترغیب ہو؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

جلال کا نکتہ

اور یہاں خاص طور پر لفظ ''جلال'' استعمال کیا ہے، لفظ ''جمال'' استعمال نہیں کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں محبت کا تعلق ہو، تا کہ ایسے صالح نوجوان جو بے ریش ہوں، ان کے صلاح کا نام لے کر ان کے ساتھ ظاہری

تعلق رکھ کر کسی کو یہ ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے کہ میں ان کے ساتھ اللہ واسطے محبت کرتا ہوں۔ گویا شہوانی طریقے پر کی جانے والی محبت نہ ہو، بلکہ اللہ کے واسطے ہی محبت کی جائے۔

جیسا کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں تو اللہ کے جمال کا آئینہ ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ سے کسی نے سوال کیا کہ جو نوجوان ہوتے ہیں، ان کے حسین چہرے تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمال کا آئینہ ہوتے ہیں؛ ان کو دیکھنے کی کیوں اجازت نہیں دی جاتی؟ حضرت تھانویؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ آتشیں آئینے ہیں اگر دیکھیں گے تو آنکھوں کو جلا کر رکھ دیں گے۔ چنانچہ جو لوگ عشق مجازی میں مبتلا ہوتے ہیں، ہمیشہ ان کا دل بے چین رہتا ہے، ان کو کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ جبکہ اللہ کے عشق میں مبتلا ہونے والوں کو ایک طرح کا سکون و طمانینت حاصل ہوتی ہے۔

خیر! تو ان لوگوں کو خطاب فرما کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ آج میں ان کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا جبکہ میرے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔ گویا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی عنایت اور توجہ کا معاملہ کیا جائے گا، اور اس دن کی گرمی اور تکالیف سے ان کو محفوظ رکھا جائے گا۔

باہم محبت پیدا کرنے کا نسخہ

۳۷۸. وعنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا۔ أَوَلَا أَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! تم لوگ جنت میں داخل نہیں

ہو سکتے یہاں تک کہ ایمان لاؤ (ظاہر ہے کہ ایمان کے بغیر تو آدمی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، ایمان تو داخلۂ جنت کے لیے شرط ہے) اور تم کامل طور پر مؤمن نہیں بن سکتے یہاں تک کہ آپس میں اللہ کے واسطے ایک دوسرے سے محبت کرو (گویا آپس میں اللہ واسطے محبت کرنا ہی آدمی کے کمالِ ایمان اور حقیقی معنٰی میں مؤمن ہونے کی دلیل ہے۔ آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ) مَیں تم کو ایسا عمل اور نسخہ نہ بتلاؤں کہ جب تم اس کو انجام دو گے تو اس کے نتیجہ میں آپس میں محبت پیدا ہوگی؟ آپس میں سلام کو رواج دو اور پھیلاؤ۔

افادات: سلام کی بڑی تاکید آئی ہے۔ وہ اعمال جو آدمی کو جنت میں لے جانے والے ہیں نبی کریم ﷺ نے بہت تاکید کے ساتھ ان میں خاص طور پر افشاءِ سلام یعنی سلام کے عام کرنے کو بیان کیا ہے۔

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ وہ اعمال جن کے انجام دینے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرے نیک اعمال کی توفیق ہوا کرتی ہے ان میں ایک سلام بھی ہے۔ اس لیے بھائیو! سلام کی عادت ڈالو۔

آج کل ہمارے معاشرہ میں سے سلام ختم ہوتا جا رہا ہے، اگر کوئی سلام کرتا بھی ہے تو کوئی جان پہچان والا مل گیا اسی کو کرتا ہے۔ قیامت کی علامتوں میں سے یہ بتلایا گیا ہے کہ جان پہچان والے ہی کو سلام کیا جائے گا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو، جب یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ مسلمان ہے تو اس کو سلام کیا جائے۔

بہرحال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سلام کے نتیجہ میں آپس میں محبت پیدا ہوگی اور اسی محبت کی وجہ سے تمہارے ایمان کے اندر قوت آئے گی۔ اب جو عمل ایمان کو تقویت پہنچانے والا اور درجۂ کمال تک پہنچانے والا ہو، جب حضور پاک ﷺ وہ نسخہ

ہمیں بتلا دیں تو پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟ ہر مومن کی یہ خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ مجھے ایمان کا کمال حاصل ہو۔

اللہ کی محبوبیت حاصل کرنے کا آسان عمل

۳۷۹. وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أَنَّ رَجُلاً زَارَ أَخاً لَهُ فِيْ قَرْيَةٍ أُخْرىٰ، فَأَرْصَدَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلىٰ مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا۔ وذكر الحديث الىٰ قوله: أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيْهِ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ کسی آدمی کا دوسری بستی میں ایک دینی بھائی تھا جس سے اس کو اللہ کے واسطے محبت تھی وہ اس کی ملاقات کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتے کو بھیجا جو اس کے انتظار میں رہا۔ جب وہ اس دینی بھائی کی ملاقات کے لیے اس بستی کے قریب پہنچا تو وہ فرشتہ اس سے ملا اور پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: اس بستی میں میرا ایک دینی بھائی ہے جس کے ساتھ مجھے اللہ واسطے محبت اور تعلق ہے، اسی سے ملاقات کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ تو اس نے پوچھا: کیا تم نے اس پر کوئی احسان کیا تھا جس کا بدلہ حاصل کرنے کی غرض سے تم یہاں آئے ہو؟ یا تمہارا کوئی مطالبہ اور اُگھرانی (وصولی) باقی ہے جس کی وصولی کے لیے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس! مجھے تو اس سے اللہ واسطے محبت ہے اور اسی محبت کی خاطر اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں، اس کے علاوہ کوئی اور غرض اور مطالبہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس پر اس فرشتے نے کہا کہ میں تیرے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ جیسے تو نے اس کے ساتھ اللہ واسطے محبت کی؛ اللہ تعالیٰ بھی تیرے ساتھ محبت فرماتے ہیں۔

افادات: کتنا آسان عمل ہے جس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ بعض اعمال تو

ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، جیسے رات میں تہجد کے لیے اٹھنا، عبادات کی انجام دہی کے لیے محنت کرنا، روزے رکھنا جس میں کھانا پینا چھوڑنا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں تو بس آدمی سچے دل سے اللہ کے واسطے محبت کا تعلق قائم کرلے تو اس سے کتنی بڑی فضیلت حاصل ہوگی۔

انصار کی فضیلت

۳۸۰: عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال فی الانصار: لایحبھم الامؤمن ولایبغضھم الامنافق۔ من أحبّھم أحبّہ اللّٰہ، ومن أبغضھم أبغضہ اللّٰہ.

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی فضیلت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ ان سے مؤمن ہی محبت کرے گا، اور منافق ہی ان کے ساتھ بغض رکھے گا۔ جو انصار کے ساتھ محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھیں گے۔ اور جو انصار کے ساتھ بغض وعداوت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بغض اور عداوت رکھیں گے۔

افادات: چوں کہ منافقین کو حضراتِ مہاجرین کا مدینہ منورہ آنا ناگوار تھا، اور اسی لیے وہ لوگ انصار سے بغض رکھتے تھے کہ انہوں نے ہی ان کو یہاں بلایا اور ان کو پناہ دی اور ان کا تعاون کرتے ہوئے ان کو اپنے گھروں میں جگہ دی۔ گویا انصار کے ساتھ محبت یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے کی دلیل ہے۔

فضلُ الحُبِّ فی اللہِ والحثِّ علیه

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

بیان چل رہا تھا: اللہ کی خاطر آپس میں محبت اور تعلق رکھنا، اور احادیث میں اللہ کے لیے محبت رکھنے کی جو ترغیب آئی ہے اس کو بتلانا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ روایت پیش فرماتے ہیں۔

انبیاء وشہداء رشک کریں گے

۳۸۱: عن معاذ رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: قال اللہ عزوجل: المتحابون فی جلالی، لهم منابر من نور یغبطهم النبیون والشهدآء.

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا (جس حدیث میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے) کہ میری عظمت اور جلال کی نسبت سے آپس میں محبت کرتے ہیں (یعنی اللہ کی بڑائی کے پیش نظر ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں) ان کے لیے قیامت کے روز نور کے منبر قائم کیے جائیں گے جس پر وہ لوگ براجمان ہوں گے۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر انبیاء کرام اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔

افادات: گویا وہ بھی تمنا کریں گے کہ یہ چیز ہمیں حاصل ہو جاتی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انبیاء کرام اور شہداء کو ان سے نیچا مقام ملا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی کے پاس عمدہ سے عمدہ سو گھوڑے ہیں لیکن اس نے کسی کے پاس کوئی بہت ہی عمدہ گھوڑا دیکھا تو اس کے جی میں یہ خیال آیا کہ ایسا عمدہ گھوڑا میرے پاس بھی ہوتا تو اچھا تھا۔ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی پاس کوئی مخصوص چیز دیکھ کر آدمی کے دل میں یہ خواہش اور تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ کاش! ایسی چیز مجھے بھی میسر آجاتی۔ تو یہاں بھی حضرات انبیاء کرام اور شہداء کے رشک کرنے سے کوئی اشکال

نہیں ہونا چاہیے۔

بہر حال! یہاں تو اللہ تعالیٰ کی خاطر جو لوگ آپس میں محبت کا تعلق رکھتے ہیں ان کو قیامت کے روز جو خصوصی انعام سے نوازا جائے گا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتلایا گیا کہ وہ ایک ایسا انعام ہوگا کہ اس چیز کے حصول کی انبیاء اور شہداء بھی تمنا کریں گے۔ اس سے اللہ واسطے کی جانے والی محبت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاص کر کے اہل اللہ کے ساتھ ہماری جو محبت ہوتی ہے کہ ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے خاص بندے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں محبت اور تعلق رکھنا ہمارے اختیار کی چیز ہے۔ اگر ہم ان فضیلتوں کو حاصل کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

بشارت سن لو

۳۸۲: وعن أبی ادریس الخولانیؒ دخلت مسجد دمشق، فاذا فتیً برّاق الثنایا واذا الناس معه، فاذا اختلفوا فی شیء، أسندوه الیه، وصدروا عن رأیه، فسألت عنه فقیل: هٰذا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔ فلما کان من الغد، هجرت، فوجدته قد سبقنی بالتهجیر، ووجدته یصلی، فانتظرته حتّٰی قضی صلاته، ثم جئته من قبل وجهه، فسلمت علیه۔ ثم قلت: واللّٰه انی لأحبك للّٰه۔ فقال: آللّٰه؟ فقلت: أللّٰه۔ فقال: آللّٰه؟ فقلت: أللّٰه، فأخذنی بحبوة ردائی، فجبذنی الیه، فقال: أبشر، فانی سمعت رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم یقول: قال اللّٰه تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فیَّ، والمتجالسین فیَّ، والمتزاورین فیَّ، والمتباذلین فیَّ۔

(حدیث صحیح رواه مالك فی المؤطا باسناده الصحیح)

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوادریس خولانیؒ (جو اکابر تابعین میں سے مستجاب الدعوات تھے اور صاحبِ کرامات بھی تھے، وہ) فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ دمشق کی مسجد میں داخل ہوا (دمشق اس زمانہ میں شام کا دارالسلطنت تھا) وہاں پر ایک نوجوان کو دیکھا جس کے دانت بڑے چمک دار تھے اور لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں لوگوں میں آپس میں اختلاف ہوتا تو اس کو حل کرنے اور اس الجھن کو دور کرنے کے لیے انہیں سے رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے لوگ اسی کو تسلیم بھی کر لیتے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ مجھے بتلایا گیا کہ یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب دوسرا دن آیا تو میں جلدی سے مسجد میں پہنچ گیا تاکہ مجھے ان سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملے، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں آ چکے ہیں اور نماز میں مشغول ہیں۔ مَیں ان کے انتظار میں رہا یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہوئے، تو میں نے ان کو سلام کیا اور عرض کیا کہ اللہ کی قسم! مَیں آپ سے اللہ واسطے محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم کھا کر یہ بات کہتا ہوں۔ دوبارہ انہوں نے پوچھا: اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ تو انہوں نے کمر کے پاس سے میری چادر پکڑی، اور مجھے اپنی طرف کھینچا، پھر فرمانے لگے کہ بشارت سن لو: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ میری خاطر آپس میں محبت اور تعلق رکھتے ہیں (اپنے کسی مفاد اور غرض کے لیے نہیں) اور اسی محبت کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کرتے ہیں اور (یہ ملاقات سوکھی سوکھی نہ ہو، بلکہ) ایک دوسرے پر اللہ واسطے کچھ خرچ بھی کرتے ہیں (آپس میں کھلانے پلانے کا بھی سلسلہ ہوتا ہے) تو ایسے لوگوں کے لیے میری محبت واجب ہوگئی۔

افادات: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور انصار میں سے ہیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف حاکم اور قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ صحابۂ کرام میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں حلال اور حرام کے سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں طاعون پھیلا تھا، جو طاعونِ عمواس کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اسی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

مشغول شخص کے انتظار کا ادب

حضرت ابوادریس خولانیؒ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا دن آیا تو میں جلدی سے مسجد میں پہنچ گیا تاکہ ان سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملے، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں آچکے ہیں اور وہ نماز میں مشغول ہیں، تو میں ان کے انتظار میں رہا یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہوئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انتظار میں تھے تو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے بھی بتلایا تھا کہ دورانِ نماز یا وِرد اگر کسی کا انتظار کرنا ہو تو اس انداز سے انتظار نہ کیا جائے کہ اس کو پتہ چل جائے کہ فلاں آدمی میرے انتظار میں ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہوگا تو اس کی نماز یا وِرد میں جو یکسوئی ہے وہ باقی نہیں رہے گی۔ اس کا جی اس طرف متوجہ ہو جائے گا تو اس وِرد کا جو مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا انتظار مقصود ہو، اور وہ کسی عبادت نماز، ذکر، دعا، تلاوت وغیرہ میں مشغول ہے تو اس انداز سے اس کا انتظار کیا جائے کہ اس کو پتہ نہ چلے کہ فلاں شخص میرے انتظار میں ہے۔

ملاقات کا مناسب طریقہ

اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جب وہ فارغ ہوئے تو ان کے چہرے کی طرف سے آیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی سے ملاقات کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ سامنے کی طرف سے آیا جائے۔

اللہ کی محبت کے حق دار

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی خاطر آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں، جیسے دین کی

باتیں سیکھنے سکھانے اور سننے سنانے کے لیے، دین کی دوسری ایسی فکریں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان امور کو انجام دینے کے لیے، لوگوں کی خدمت انجام دینے کے واسطے بیماروں کی مدد کا مشورہ کرنے کے لیے، جس میں اپنا مفاد اور غرض نہ ہو، ایسے امور کی تدبیریں اختیار کرنے کے لیے، اور ان پر غور و فکر کرنے کے لیے آپس میں مشورہ کے لیے بیٹھیں گے؛ وہ سب اسی ''اَلْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ'' میں شامل ہوگا۔ جیسے ہم سب آپس میں مل کر اس وقت یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ہماری کوئی اور غرض نہیں ہے، نبی کریم ﷺ کے ارشادات سننے سنانے کے لیے جمع ہوئے ہیں؛ یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اللہ اور رسول کی باتیں سننے کے لیے کہیں بھی بیٹھ جاؤ، کتاب کی تعلیم ہو رہی ہے، قرآن پاک کے سیکھنے سکھانے کے لیے جمع ہونا، مسائل کا سیکھنا سکھانا، لوگوں میں دین پھیلانے کے لیے دعوت و تبلیغ کی نسبت سے بیٹھنا؛ یہ سب اس میں داخل ہے۔

دیکھو! محبت کا محل قلب ہے، اور جب اللہ واسطے محبت ہوگی تو اجتماعِ قلوب ہوگا اور پھر جب وہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھیں گے تو اجتماعِ قوالب ہوگا۔

''وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ'' اور اسی محبت کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کرتے ہیں۔ کسی کے یہاں آپ کا اسی نسبت سے جانا ہوا کہ اللہ کے کسی حکم کو پورا کرنا مقصد ہے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔

''وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ'' اور یہ ملاقات سوکھی سوکھی نہ ہو بلکہ ایک دوسرے پر اللہ واسطے کچھ خرچ بھی کرے، آپس میں کھلانے پلانے کا بھی سلسلہ ہو۔ تو جو ایک دوسرے پر آپس میں اللہ کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں نکلے اور کہیں خرچ کی نوبت آ گئی تو ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہوئے اللہ ہی کی نسبت سے کہتے ہیں کہ میں خرچ کرتا ہوں، کوئی اور غرض مقصود نہیں ہے۔

اہل اللہ کی خدمت میں جب اللہ کے واسطے حاضری دی جاتی ہے تو وہاں یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں کہ ان سے محبت اللہ واسطے ہوتی ہے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنا اللہ کے واسطے ہوتا ہے۔ ان کی زیارت کے لیے جانا اللہ واسطے ہوتا ہے۔ اور جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، وہ بھی اللہ واسطے ہوتا ہے۔ اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے، اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے، اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے کی ملاقات کرنے والے اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے پر خرچ کرنے والے؛ ایسے تمام لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری محبت واجب ہے۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حق دار ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے

یہ وہ نغمہ ہے جو......

یہی وہ مجالس ہوتی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے چلتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے "اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ أَیَّامِ الدَّهْرِ نَفَحَاتٌ، أَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا، أَنْ تُصِیْبَکُمْ نَفْحَةٌ مِّنْهَا فَلَا تَشْقَوْنَ بَعْدَهَا أَبَداً" زمانہ کے دن اور راتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کے خاص جھونکے چلتے ہیں، آپ لوگ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ جیسے ہَوا چل رہی ہو اور اس کے سامنے اگر ہم آ جائیں تو ہَوا ہم پر سے گذرے گی۔ اسی طرح اللہ کی رحمت کے جھونکوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، اگر ایک آدھ جھونکا آپ کو بھی لگ گیا تو پھر کبھی بھی بدبختی پاس نہیں آئے گی، ہمیشہ کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اور گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ہمیشہ کے واسطے چن لیے جاؤ گے۔ گویا اجتباء وجذبِ خداوندی ہوگی۔ اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ گویا یہ نعمت وہ ہے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی اور ہر وقت نہیں ملتی: ؎

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں	یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر چھیڑا نہیں جاتا

بہر حال! یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔ لیکن بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو آدمی ذکر کا اہتمام کرے، اور گناہوں کو چھوڑ دے؛ تو ایسے لوگوں کے قلوب اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان قلوب میں اللہ کی رحمت کے جھونکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جب کسی سے اللہ واسطے محبت ہو

٣٨٣: عن أبی کریمة المقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِذَاأَحَبَّ الرَّجُلُ أَخَاهُ، فَلْيُخْبِرْهُ أَنَّهُ يُحِبُّهُ. (رواہ ابوداود والترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ: حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی سے اللہ کی خاطر محبت رکھے، تو اس کو چاہیے کہ جس کے ساتھ وہ اللہ کی نسبت سے محبت رکھتا ہے اس کو خبر کر دے کہ میں تم سے اللہ کی خاطر محبت رکھتا ہوں۔

افادات: اللہ کے لیے محبت کی جائے تو اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس کے ساتھ آپ اللہ کی نسبت سے محبت اور تعلق رکھے ہوئے ہیں اس کو بھی باخبر کر دیں کہ میں آپ سے اللہ کی خاطر محبت کرتا ہوں۔ اور پہلے ایک روایت گذر چکی ہے جس میں یہ بھی تھا کہ جس کو بتلایا جائے وہ اس کو دعا کے طور پر یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے جس طرح تم اس کی خاطر مجھ سے محبت رکھتے ہو، اور اس کی وجہ سے یہ تعلق اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

حدیث مسلسل بالمحبة

٣٨٤: وعن معاذ رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم أخذ بیدہ وقال: یامعاذ! واللّٰه انی لأحبك ثم أوصیك یامعاذ! لاتدعن فی دبر کل صلوٰة تقول: أَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ

عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ کہنا مت چھوڑیو، یعنی ہر نماز کے بعد پابندی سے یہ دعا کرتے رہنا "اَللّٰهُمَّ أَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ" (جس میں یہ دعا مانگی گئی ہے کہ) اے اللہ! تو میری مدد کر اس معاملہ میں کہ میں تیری یاد کروں اور تیرا شکر ادا کروں، اور تیری عبادت بہتر طریقہ سے انجام دے سکوں۔

افادات: یہ روایت محدثین کے یہاں مسلسل بالمحبۃ کے نام سے مشہور ہے کہ ہر استاذ اپنے شاگرد سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے مسلسل سند سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتا ہے، اور اخیر میں وہ بھی یوں کہتا ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں، تم بھی ہر نماز کے بعد یہ پڑھا کرو۔ آپ لوگ بھی اس کا اہتمام کریں۔

میں نے بھی اپنے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اور اسی طرح حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے یہ روایت اسی تسلسل کے ساتھ سنی ہے۔

معمولات پر پابندی کی دعا

اس دعا کی بڑی برکتیں ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے معمولات کی پابندی کے سلسلہ میں پریشان ہوتے ہیں کہ کچھ دنوں تک پابندی ہوتی ہے، پھر چھوٹ جاتے ہیں۔ بہت سے نیک اعمال شروع کرتے ہیں، کچھ دنوں تک معاملہ چلتا ہے، پھر ان سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اس دعا کا اہتمام کرنے کی برکت سے ان شاء اللہ معمولات کی پابندی بھی آسانی سے نصیب ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس دعا میں اللہ تعالیٰ کی مدد خاص ان تین کاموں کے لیے مانگی گئی ہے کہ اے اللہ! تو میری مدد کر اس بات پر کہ

میں تیری یاد اور ذکر کروں اور تیری نعمتوں پر تیرا شکر ادا کروں، اور تیری عبادت بہتر سے بہتر طریقہ سے انجام دوں۔ لہٰذا اس دعا کی عادت بنالو۔ فرض نماز کے سلام کے بعد فوراً پہلا کام یہ ہونا چاہیے۔ ان شاء اللہ اس دعا کی برکت سے آپ کے لیے اپنے معمولات پر پابندی بہت آسان ہوجائے گی۔

کیا تم نے ان کو بتادیا؟

٣٨٥: عن أنس رضی اللہ عنہ أن رجلا کان عندالنبی ﷺ، فمرّ رجل به، فقال: یارسول اللّٰه! انی لأحب هٰذا، فقال له النبی ﷺ: أأعلمته؟ قال: لا، قال: أعلمه۔ فلحقه فقال: انی أحبك فی اللّٰه۔ فقال: أحبك الذی أحببتنی له. (رواه ابوداود باسناد صحيح)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے ایک صاحب گذرے۔ ان صحابی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اس آدمی سے محبت کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم نے اس کو بتلادیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو باخبر کردو۔ چنانچہ وہ صحابی اُٹھے اور جلدی سے جاکر ان سے ملے اور کہنے لگے: اللہ کی خاطر میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ تو ان صحابی نے کہا: جس ذات کی خاطر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو، وہ ذات بھی تم سے محبت رکھے۔

افادات: یہی آداب میں سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں جو محبت اور تعلق قائم کیا جاتا ہے، جس میں اپنی کوئی غرض اور اپنا کوئی مفاد شامل حال نہ ہو، اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر ہے، اور اس کے نتیجہ میں آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے، اور قیامت کے روز اس کی وجہ سے بڑا مرتبہ حاصل ہوگا۔ یہ بڑی آسان چیز ہے، اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ کسی

کے ساتھ اللہ کی نسبت پر محبت کا تعلق قائم کر لینا بہت سہل سودا ہے۔ جتنے بھی دینی کام ہیں ان کو انجام دینے کے لیے آپس میں جو تعلق قائم کئے جائیں گے وہ سب اسی میں داخل ہیں۔ ان سب میں یہ فضیلت بڑی آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔

عَلاماتُ حبِّ اللهِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ وَالحَثّ عَلَى التَّخَلُّقِ بِهَا

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

١٧/ربیع الثانی ١٤٢٠ھ ٣١/جولائی ١٩٩٩ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ أما بعد:—

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں، اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب اوراس کے لیے کوشش کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندے سے کب محبت کرتا ہے، اس کی نشانی بتلائی جاتی ہے، اوراللہ تعالیٰ کی محبت کو ہم کیسے حاصل کر سکتے ہیں کہ اللہ ہم سے محبت کرے، اوراس مقام کو ہم کیسے پا سکتے ہیں، اس کی ترغیب بھی دی ہے اوراس کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔

محبت کی نشانی

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌرَّحِيْمٌ﴾ اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کا معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ محبت رکھتا ہے یہاں اس کی علامت یہ بتلائی گئی کہ آدمی نبی کریم ﷺ کی پیروی اور اتباع کرے۔ جو آدمی اپنی زندگی کے مختلف احوال اور شعبوں میں نبی کریم ﷺ کی زیادہ سے زیادہ پیروی اور آپ کے نقش قدم پر چلنے کا اہتمام کرے گا، یہ اس بات کی علامت سمجھی جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہی ہے کہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کی پیروی اور اتباع کرے، حضورِ اکرم ﷺ کی سنتوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرے۔

مقامِ محبوبیت

اس لیے کہ دنیا میں کوئی آدمی کسی چیز کا دعویٰ کرتا ہے تو اس دعویٰ کی صداقت کے لیے اس سے کوئی علامت اور شہادت مانگی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو خود اللہ تعالیٰ نے ہی یہ فرمادیا کہ اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، اور جب اللہ کی محبت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی پیروی کی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انعام سے نوازے جاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی تم سے محبت کرنے لگے گا یعنی اب تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ پہلے محبّ تھے، اب محبوب بن گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام بہت اونچا مقام ہے۔

میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بہت کثرت سے کیا ہے، کسی اور نبی کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اس کثرت سے نہیں کیا گیا ہے، اور بعض جگہوں پر تو بڑی محبت اور خاص انداز سے کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو یہ کہا گیا ہے ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر میں نے محبت ڈال دی، تاکہ تمہاری پرورش میری نگاہوں کے سامنے ہو۔ تو علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ نبی کریم ﷺ تو سید الانبیاء ہیں، لیکن آپ کا بھی تذکرہ قرآنِ پاک میں اس کثرت سے نہیں ہے، حالانکہ قرآن تو آپ

پر نازل ہوا؟ لیکن جب اس آیت پر غور کیا تو قلبی انشراح ہوگیا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ جو آدمی نبی کریم ﷺ کی پیروی کرے گا، اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرے گا۔ تو جن کی پیروی کرنے سے، اور جن کے نقشِ قدم پر چلنے سے؛ پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہو؛ تو خود اس ذات کو محبوبیت کا کتنا اونچا مقام حاصل ہوگا!!!

اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لائے گا

دوسری آیت پیش کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اس کی کچھ علامات بتلائی ہیں۔ ﴿يَـأَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَـأْتِي اللّٰهُ بِقَـوْمٍ يُّـحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ۔ يُـجَاهِـدُوْنَ فِـيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَـآءُ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ اے ایمان والو! جو آدمی اپنے دین سے ہٹ جائے گا تو (اللہ تعالیٰ کو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اللہ تعالیٰ کی ذات تو غنی ہے) وہ ان کی جگہ پر ایسی قوم کو لائے گا جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے۔ وہ لوگ ایمان والوں سے بڑی تواضع اور انکساری سے پیش آئیں گے، اور کافروں کے مقابلہ میں بڑی قوت کا معاملہ کریں گے۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے ہوں گے۔ اور اللہ کے معاملہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہ (وہ مقام ہے جو) اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا کشادہ عطا کرنے والا ہے اور بہت زیادہ جاننے والا ہے (کہ کون اس کا اہل ہے اور کون نہیں۔)

دو کاموں پر اعلانِ جنگ

٣٨٦: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ: مَنْ عَادىٰ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ. وَمَاتَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَايَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبُّهٗ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِيْ أَعْطَيْتُهٗ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهٗ. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آدمی میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی رکھے گا، تو میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں، لڑائی کی دھمکی اور چیلنج کرتا ہوں۔

افادات: دیکھو! قرآنِ پاک میں لڑائی کا ایک چیلنج دیا گیا ہے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ سود کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے جن لوگوں نے آپس میں سودی معاملہ کر رکھا تھا جیسے کسی کو سود پر قرض دے رکھا تھا تو باری تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا کہ اس سے پہلے سود کے جو معاملے تم کر چکے ہو، اس میں صرف اپنی اصل رقم ہی لیجیو۔ اوپر تم نے جو سود مقرر کیا ہے وہ مت لینا۔ سود کے معاملہ میں اتنا سخت رویہ اپنایا گیا۔ سابقہ جو معاملات ہو چکے تھے ان کے بارے میں بھی یہ تاکید کی گئی کہ بس! اصل ہی لینا، اوپر کا مت لینا۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو ایسے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ اور لڑائی کی خبر کر دو۔ اتنا خطرناک معاملہ ہے۔

آج اگر سورت کا کوئی معمولی پی ایس آئی، یا حکومت کا معمولی عہدے والا کوئی افسر کسی کو دھمکی دیدے کہ میں دیکھ لوں گا، تو اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی

ہے، اس کے کھانے کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے، زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جس کو جنگ کی دھمکی دیں، اس کو کہاں سکون اور چین میسر آ سکتا ہے۔ اس کے باوجود جو مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہوئے سود کے معاملات کرے گا؛ وہ بھلا کیسے سکون پا سکے گا؟ اور پھر اس کے لیے ترقی کا راستہ کیسے کھل سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ اور لڑائی کی دھمکی والا ایک حکم تو سود والا ہے جو قرآنِ پاک میں آیا ہے۔ اور دوسری دھمکی حدیثِ قدسی میں آئی ہے کہ جس نے میرے کسی دوست اور ولی سے، کسی اللہ والے سے دشمنی رکھی؛ تو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ۔ میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

قبر سے تین پیغام

اسی لیے ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہمیشہ اپنی مجلس میں بڑی تاکید سے فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! ان اللہ والوں سے ڈرتے رہو۔

اور حضرت شیخ فرماتے تھے کہ میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا تو وہ اپنے سر پر بڑا قرضہ چھوڑ گئے تھے، جس کی ادائیگی مجھ پر آ پڑی تھی، اور خاندان والوں کو بھی اس کی بڑی فکر تھی، لیکن مجھے اطمینان تھا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ایک صاحب تعزیت کے لیے آئے، بڑے آدمی تھے، اللہ والے تھے، اور ان کو کشفِ قبور ہوتا تھا، وہ والد صاحب کی قبر پر گئے اور مراقبہ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد کہا کہ بھائی! تمہارے والد صاحب نے تین باتیں کہی ہیں اور میرے ذریعہ سے تم پر تین پیغام کہلوائے ہیں۔ ایک تو یہ کہا ہے کہ ان اللہ والوں سے ڈرتے رہیو، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔ اور دوسرا پیغام یہ دیا ہے کہ میرے قرضہ کے متعلق فکر مت کرنا وہ ادا ہو جائے گا۔ اور حضرت

شیخ فرماتے ہیں کہ شروع جوانی میں والد صاحب کے انتقال کے بعد مکان کے جس حصہ میں مَیں آرام کرتا تھا اس کے دروازے کی کنڈی نہیں لگاتا تھا، تو والد صاحب نے تیسرا پیغام یہ کہلوایا کہ دروازہ کی کنڈی لگالیا کرو۔ ویسے کنڈی لگانے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے۔

اُلٹی کیسے سیدھی ہوسکتی ہے؟

حضرت شیخ نے آپ بیتی میں بھی لکھا ہے اور حضرت کی مجلس میں خود میں نے بھی کئی مرتبہ سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ جب یہ جملہ میں نے سنا کہ ان اللہ والوں سے ڈرتے رہیو، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ مَیں یوں کہا کرتا تھا کہ اُلٹی تو اُلٹی ہی ہوتی ہے، کسی کی بھی ہو، اللہ والا ہے تو کیا ہوا؟ اُلٹی کیسے سیدھی ہوسکتی ہے؟ اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اس کے بعد جس زمانہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ ـــ جو حضرت شیخ کے شیخ اور پیر ہیں ـــ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو جاتے وقت انہوں نے مدرسہ مظاہر علوم کی نظامت کے لیے حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ کو مقرر کیا، وہ حافظ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ سہارنپور میں دو چار لوگ حضرت حافظ صاحب کے مخالف تھے، ان سے بیر اور عداوت رکھتے تھے۔ حضرت سہارنپوریؒ جب مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے تو یہ لوگ یہاں سے حضرت پر حافظ صاحب کی جھوٹی جھوٹی شکایتوں کے خط لکھا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں یہ غلط خط وہاں پہنچتے تھے تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوریؒ بھی وہاں مقیم تھے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت رائپوریؒ نے مجھ پر یہ لکھا کہ آپ حافظ صاحب سے کہئے کہ فلاں صاحب آپ

کے متعلق شکایتوں کے ایسے خط یہاں لکھ رہے ہیں، ان کو ذرا سنبھالیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رائپوری کو جواب میں لکھا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ان کو حافظ صاحب سے خواہ مخواہ کی دشمنی ہے، اور کوئی بات نہیں۔ اس لیے وہ لوگ جھوٹی شکایتوں کے خط لکھ رہے ہیں اور آپ بھی جانتے ہیں۔ حضرت رائپوری نے دوبارہ مجھے لکھا کہ نہیں! حافظ صاحب کو تاکید کرو کہ ان کی دل جوئی کرتے رہیں، تاکہ ان کی طرف سے اس طرح کے خطوط نہ پہنچیں۔ اس کے بعد حضرت رائپوریؒ جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں لکھا، آپ کو بھی معلوم تھا۔ اس پر حضرت رائپوریؒ نے فرمایا کہ بھائی دیکھو! اگرچہ یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ وہ جھوٹی شکایتیں لکھتے ہیں، لیکن جب بار بار ایسے خطوط حضرت کے پاس پہنچتے رہیں گے تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی جھوٹی بات بار بار کہی جاتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر تو کرتی ہی ہے۔

فوراً بدگمانی

اور مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ آج کل تو ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ ہم تو بہت کچے ہوگئے ہیں۔ ایک آدمی کے ساتھ سالہا سال سے ہمارا اُٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا ہے، اس کے مزاج سے ہم واقف ہیں اور ہمارے مزاج سے وہ واقف ہے۔ اس کے باوجود ایک غیر متعلق آدمی آکر ہمارے کان میں یوں کہہ دے کہ تمہارا دوست تمہارے متعلق ایسا ایسا کہہ رہا تھا، تو بس! ہمارا اس کے ساتھ کا پندرہ سال کا تجربہ ایک طرف رہ جائے گا اور اس غیر کی اس ایک بات پر ہم یقین واعتماد کرلیں گے۔ حالانکہ جس آدمی نے آکر یہ بات کہی ہے اسی پر ہم دوسری باتوں میں اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتے، پھر بھی اس بات کو سن کر تو ہمارا دماغ چکرا ہی جاتا ہے، اور ہم فوراً بدگمانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اور اپنے

اس دوست اور ساتھی کے متعلق ہمارا پندرہ سال کا تجربہ دھرا کا دھرارہ جاتا ہے۔ ہمارا حال تو ایسا ہو گیا ہے۔

خیر! یہ تو بیچ میں ایک بات آ گئی تو صرف اسی غرض سے کہہ رہا ہوں کہ اس زمانہ میں اس طرح کے چکّر بہت بڑھ گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر بھائی بھائی میں، دوست دوست میں، اہلِ خاندان میں آپس میں اختلافات اور جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جب اس کی تحقیق کی جاتی ہے اور اس بات کی اندر سے کھود کرید کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں صاحب نے ایسا کہا تھا۔ اب جن صاحب نے اس کی بات پر اعتماد کیا ہے ان سے اگر سوال کیا جاتا ہے کہ بھائی! تم نے ان کی اتنی سی بات سن کر یہ کام کیا؟ کیا تمہارے نزدیک یہ آدمی معتبر ہے؟ تو وہی کہتا ہے کہ یہ معتبر آدمی تو نہیں ہے۔ جب معتبر نہیں ہے تو پھر کیوں اپنے زندگی بھر کے تجربہ کو اس کی وجہ سے قربان کر رہے ہو؟ آج کل ایسا ہو رہا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں میں بہت سمجھ داری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

تو ایک غلط بات بھی جب بار بار آدمی کے سامنے آتی ہے تو وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ حضرت رائپوریؒ نے فرمایا کہ حضرت کے پاس بھی جب بار بار یہ لوگ جھوٹی شکایتوں کے خط لکھتے رہیں گے، تو حضرت کے دل میں ان کے متعلق کدورت اور ناگواری پیدا ہو جائے گی کہ حافظ صاحب وہاں کیا کر رہے ہیں (جیسے اپنے کسی متعلق آدمی کے بارے میں جب بار بار شکایت پہنچے کہ وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے تو اس کی وجہ سے بڑے کو تکلیف ہوتی ہے نا کہ یہ کیا غلط حرکتیں کرتا رہتا ہے) اور اللہ والوں کے دل میں کسی کے متعلق ناگواری کا پیدا ہونا اس کو فتنہ میں ڈالنے کا

ذریعہ بنتا ہے۔اس کے اوپر اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ایسے حالات آہی جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ جب حضرت رائپوریؒ نے یہ بات کہی تو میری سمجھ میں وہ بات آئی کہ اللہ والوں کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے اسلام کا قصہ

اسی سے ایک اور بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے جو حدیث میں بھی آتا ہے لیکن بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔اُس وقت وہ کفار کی طرف سے آئے تھے اور ان کے آقا نے ان سے کہا تھا تم ان کو (حضرت حمزہ کو) قتل کرو گے تو مَیں تم کو آزاد کردوں گا۔ چوں کہ ان کے آقا کے چچا کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے موقع پر مارا تھا۔تو حضرت وحشی اس وقت اسی لیے آئے تھے،اورانہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا تھا،اور پھران کو آزادی ملی۔جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو عام معافی دیدی تھی،لیکن ان میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں؛کل پندرہ اشخاص ایسے تھے جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا تھا کہ ان کا جرم نا قابل معافی ہے۔ان پندرہ میں سے ایک حضرت وحشی بھی تھے۔اس لیے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر بڑا اثر ہوا تھا،اوراس کے بعدان کی نعش کے ساتھ بھی ان لوگوں نے جو معاملہ کیا تھا وہ بڑا بھیانک تھا،اس کی وجہ سے اور زیادہ تکلیف ہوئی تھی۔یوں کہنا چاہیے کہ اس نے تو جلتے پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔ خیر! جب ان کے متعلق یہ اعلان ہوا تو حضرت وحشی وہاں سے بھاگ کر طائف چلے

گئے، فتح مکہ کے بعد طائف کا بھی محاصرہ کیا گیا تھا لیکن وہ فتح نہیں ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو بتادیا گیا تھا کہ وہ ابھی فتح ہونے والا نہیں ہے، اس لیے آپ نے وہاں سے محاصرہ اٹھالیا اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کو ہدایت دیدے اور مدینہ بھیج دے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کو ہدایت دی۔ اور جس زمانہ میں مختلف قبائل کی طرف سے وفود حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں (۹ ھ) پہنچ رہے تھے، طائف والوں نے بھی یہ کہلوانے کے لیے اپنا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔

طائف والوں کا وفد (deputation) جب مدینہ منورہ جارہا تھا تو کسی نے حضرت وحشی سے کہا کہ ابھی موقع ہے، تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ جو آدمی وفد میں سفیر بن کر جاتا ہے اس کو گزند نہیں پہنچاتے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں دی جاتی۔ اگرچہ آپ کے متعلق یہ اعلان ہو چکا ہے، لیکن اگر اس طرح جاؤ گے تو امید ہے کہ بچ جاؤ گے۔ چنانچہ اس وفد میں یہ بھی گئے۔ جب یہ مدینہ منورہ پہنچے اور نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے تو کسی نے حضور سے عرض کیا کہ یہ حضرت حمزہ کے قاتل وحشی ہیں۔ انہوں نے فوراً کلمہ پڑھا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کا اسلام لانا مجھے ایک ہزار کافروں کے قتل کرنے کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے۔ (فتح الباری۔ باب قتل حمزہ، ۳۷۶/۲)

انہوں جب کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرلیا تو حضور اکرم ﷺ نے ان سے کہا کہ اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آؤ اور اپنا چہرہ مجھے نہ دکھاؤ؛ تو ایسا کرو۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خواہش یہ دیکھی تو مدینہ

منورہ سے روانہ ہو گئے تاکہ آپ کے سامنے آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ بھی دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ محبوب کی خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دینا اسی کو کہتے ہیں:۔

أُرِيدُوِصَالَهُ وَيُرِيدُهَجْرِیْ	فَأَتْرُكُ مَا أُرِيدُلِمَا يُرِيدُ

مَیں تو محبوب کے وصال کا طلبگار ہوں لیکن وہ میری جدائی چاہتا ہے۔ تو مَیں اپنی خواہش کو اس کی خواہش پر قربان کرتا ہوں۔ حضرت وحشی نے بھی نبی کریم ﷺ کی خواہش معلوم ہونے کے بعد مدینہ منورہ چھوڑ دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ (بخاری شریف۔ باب قتل حمزہ،۴۰۷۲۔)

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو کیوں منع فرمایا؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو رحمۃ للعالمین تھے اور ہیں، پھر آپ نے ان سے یہ کیوں فرمایا کہ تم اپنا چہرہ مجھے مت دکھاؤ اور میرے سامنے نہ آؤ؟

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ یہاں آپ ﷺ کا ان کو اپنے سے دور رکھنا اپنے لیے نہیں، بلکہ اُن کے لیے تھا۔ حضرت وحشی کی بھلائی اور خیر خواہی اسی میں تھی کہ وہ حضور کی نظروں سے دور رہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس سے حضور اکرم ﷺ کے قلبِ اطہر پر جو تکلیف ہوئی تھی، وہ بہت زیادہ تھی۔ چوں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا گیا تھا جس کو دیکھ کر حضور اقدس ﷺ نے قسم کھائی تھی کہ مَیں اس کے بدلہ میں ستّر (۷۰) آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کروں گا۔ اور جب تک بدلہ نہیں لوں گا تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اسی پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ﴾ اگر تم بدلہ لینا چاہو تو پھر اتنا ہی بدلہ لو جتنا انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے، اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ اچھا ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ

نے اپنا وہ ارادہ بدل دیا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردیا۔ (تفسیر ابن کثیر۴/۵۹۲۔سورۂ نحل)

خیر! حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی سے جو یہ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت وحشی جب بھی حضور کے سامنے آتے، تو وہ واقعہ تازہ ہوجاتا۔ جیسے کسی نے کسی کے بیٹے کو قتل کردیا ہو تو چاہے والد نے قاتل کو معاف کردیا ہو لیکن اس کو دیکھ کر بیٹے کے قتل کا منظر تو سامنے آہی جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے سامنے آنے سے حضور ﷺ کو وہ واقعہ تازہ ہوجاتا اور آپ کے دل پر غیر اختیاری تکلیف ہوتی۔ اس لیے کہ تکلیف کا ہونا اختیاری چیز نہیں ہے۔ آپ کے اختیار میں معاف کردینا تھا؛ وہ کردیا۔ لیکن کسی کو دیکھ کر آدمی کے دل میں غیر اختیاری طور پر جو غم پیدا ہوجاتا ہے، اس میں اس آدمی کے اختیار کو دخل نہیں ہے۔ تو ایک واقعہ ہوچکا تھا اور حضرت وحشی کو دیکھ کر وہ چیز تازہ ہوجاتی، اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ کے دل پر اثر ہوتا جس سے آپ ﷺ کے دل کو تکلیف پہنچ سکتی تھی، اور یہ چیز حضرت وحشی کو آئندہ چل کر فتنہ میں ڈال سکتی تھی، اس سے بچانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا کہ میرے سامنے مت آنا۔ گویا اس میں انہیں کی بھلائی تھی۔ نعوذ باللہ! یہ بات نہیں تھی کہ نبی کریم ﷺ ان سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ آپ کی شان تو حدیثِ پاک میں یہ آئی ہے کہ کبھی آپ نے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا، تو یہاں بھلا کیسے لیتے۔

اللہ والوں سے عداوت نہ رکھو

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اپنی مجلس میں بار بار یہ ارشاد فرماتے تھے۔ اور خاص طور پر اہلِ علم سے کہتے تھے کہ دیکھو! اللہ والوں کے ساتھ دل میں عداوت نہ رکھو۔ کسی سے تم کو عقیدت نہیں ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے ان سے عقیدت کیوں نہیں رکھی۔ اور تم ان سے بیعت کیوں نہیں ہوئے۔ لیکن ان کے متعلق اپنی دل میں بدگمانی اور عداوت نہ رکھو۔ اس لیے کہ اس پر "فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" والی بہت سخت وعید آئی ہے۔

اخبار لا اعتبار

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ آج کل لوگوں کی عادت ہے کہ بڑے اور مشہور علماء کے متعلق جب مخالفین اخباروں میں ایسی چیزیں دیدیتے ہیں تو وہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ فلاں صاحب نے ایسا کیا، اور فلاں صاحب نے ایسا کیا۔ ایک تو ویسے بھی اخباروں میں جو چیزیں آتی ہیں، اگر ہماری ذات کے متعلق آتا ہے تو ہم خود کہتے ہیں کہ اخبار والے جھوٹ لکھتے ہیں، اور اللہ کے کسی بندے کے متعلق ایسی کوئی بات اخبار میں آگئی، اور اس کو اللہ کا مقبول بندہ سمجھتے ہیں، پھر بھی ہم اخبار والے کی بات کو سچا مان لیتے ہیں۔ ہم نے بھی عجیب دو پیمانے اختیار کر رکھے ہیں۔

تب بھی بدگمانی نہ کریں

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ تم نے اپنی آنکھوں سے اس کو کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھا ہو، تب بھی کیا ضروری ہے کہ اپنے دل میں اس کے متعلق بدگمانی رکھو۔ تم نے اس کو غلط کام کرتے ہوئے تو دیکھا، لیکن معاملہ تو اس کا اور اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات کی تنہائیوں اور اندھیریوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر، آنسو بہا کر اس نے تو توبہ کر لی، اور آپ کو اس کی اس توبہ کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اس نے تو اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوبارہ ٹھیک کر لیا، اور تم زندگی بھر اس کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھ کر اور اس کی برائیاں کر کر کے اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔ واقعہ یہی

ہے کہ ہم لوگ بہت سے اللہ والوں کے معاملہ میں اسی فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس لیے بھائیو دیکھو! یہ چیز بہت ضروری ہے۔آج کا یہ زمانہ فتنوں کا ہے،اور لوگوں میں ایسی باتیں بہت چلتی رہتی ہیں،اس لیے ذرا وضاحت کے ساتھ میں نے عرض کر دیا۔

معصوم کون ہے؟

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ معصوم کون ہے؟معصوم تو صرف انبیاء کرام ہی ہیں۔صحابہ کرام کے متعلق بھی ہم اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ وہ معصوم تھے۔ہاں! ہم ان کو محفوظ ضرور سمجھتے ہیں۔تو پھر دوسروں کے متعلق کیا کہنا چاہیے۔خلاصہ یہ ہے کہ کسی اللہ والے کے متعلق دل میں ایسا جذبہ رکھنا جس کو عداوت سے تعبیر کیا جائے،اور پھر اس سے آگے بڑھنا کہ اس کی مخالفت کرنا،اس کی برائیاں کرنا،اس کے متعلق لوگوں میں غلط باتیں پھیلانا،اور اس کے درپئے آزار ہونا تو اور زیادہ خطرناک ہے۔

اور دیکھئے! اہلِ علم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ "مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا" اصل میں تو یہاں یوں تھا "مَنْ عَادٰی وَلِیًّالِیْ" جس کا مطلب یہ تھا کہ جو میرے کسی دوست کے ساتھ عداوت رکھے۔"لِیْ" بعد میں ہونا چاہیے تھا،لیکن یہاں پہلے لائے۔گویا اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی اللہ والے کے ساتھ عداوت رکھنا یوں سمجھئے کہ اللہ کے ساتھ عداوت رکھنا ہے۔اس لیے یہ بڑی خطرناک چیز ہے،اس سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی ضرورت ہے۔اس زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے ابتلاء میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔بھائی! ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے دلوں کو ایسی چیزوں سے پاک اور صاف رکھنے کا تو نہایت ہی اہتمام کریں۔

یہ حدیث تو ذرا لمبی ہے،ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں اس کی تشریح کریں گے۔

عَلاماتُ حبِّ اللّٰہِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ وَالحَثّ عَلی التَّخَلُّقِ بِهَا

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب

۲۴؍ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ ۷؍اگست ۱۹۹۹ء

یہ بیان چل رہا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی کیا علامتیں اور نشانیاں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کے لیے ابھارنے والی باتیں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو آدمی میرے کسی ولی سے عداوت رکھتا ہے، ایسے آدمی کو میری طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ اس کی وضاحت گذشتہ مجلس میں ہو چکی ہے۔

قرب بالفرائض

آگے ارشاد ہے کہ بندہ میرا قرب کسی چیز سے اتنا زیادہ حاصل نہیں کرسکتا جتنا ان چیزوں سے کرسکتا ہے جو میں نے بندوں کے اوپر فرض کی ہیں۔ یعنی اللہ کا کوئی بندہ اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہے تو اس کے دو راستے ہیں، ایک قرب بالفرائض، اور دوسرا قرب بالنوافل۔ قرب بالفرائض یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو چیزیں فرض کی ہیں جیسے پنج وقتہ نمازیں، رمضان المبارک کے روزے، زکوٰۃ، حج، اسی طریقہ سے جو چیزیں واجب ہیں وہ بھی عملی طور پر فرض کے ہی حکم میں ہیں جیسے قربانی اور صدقۃ الفطر۔ تو اس حدیثِ قدسی میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا بندہ میری طرف سے اس پر فرض کی ہوئی چیزوں کو اور جن امور کو میں نے اس پر لازم اور ضروری قرار دیا ہے ان کو بجالا کر اور ان پر عمل کر کے میرا جتنا قرب اور نزدیکی حاصل کرسکتا ہے، کسی اور چیز سے اتنا قرب اور نزدیکی حاصل نہیں کرسکتا۔ گویا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونے میں نمبر اول پر فرائض ہیں۔

نفس وشیطان کا ایک دھوکہ

آج کل لوگوں کا جو مزاج بنتا جا رہا ہے، اس حدیثِ پاک میں اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ ہر زمانہ میں شیطان اور نفس آدمی کو ایک الگ انداز سے دھوکہ دے کر گمراہی میں ڈالتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ نوافل کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں؛ فرائض کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ جتنی توجہ نوافل کی طرف کرتے ہیں، اتنی توجہ فرائض کی طرف نہیں کرتے۔ بعضوں کو دیکھا ہوگا، بقول حضرت حکیم الامت تھانویؒ: ''وظیفہ چیں بن جاتے ہیں'' یعنی یہ پڑھو اور وہ پڑھو۔ یہ اسم اعظم ہے اس کو ہزار اور لاکھ مرتبہ پڑھو۔ بس! اسی طرح صبح سے شام تک تسبیح لیے بیٹھے رہتے ہیں اور سب پڑھ رہے ہیں، لیکن فرض نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، اس کی طرف سے غفلت ہے۔ فلاں صاحب نے یہ بتلایا کہ اس کے پڑھنے سے روزی میں برکت ہوگی اور اس کے عمل سے کاروبار میں ترقی ہوگی، اور اس کے پڑھنے سے لوگ ہماری طرف یوں مائل ہوں گے، اور یہ پڑھنے سے دشمنوں کے دل میں ہمارا رعب بیٹھے گا، وغیرہ وغیرہ۔ کہیں سے ذرا کچھ سن لیا کہ ہزار مرتبہ پڑھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے، تو بس! تسبیح لے کر پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ دراصل نفس وشیطان کا بڑا دھوکہ ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے، اس میں باری تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ کوئی بندہ میرا جتنا قرب فرائض کے ذریعہ سے حاصل کرسکتا ہے، نوافل یا کوئی اور عمل کے ذریعہ سے اتنا قرب حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک مثال

اور اس کو ایک سیدھی سادی مثال سے سمجھو کہ آپ نے اپنے یہاں کسی کو ملازم رکھا اور اس کی ایک ڈیوٹی مقرر کی کہ مثلاً آفس میں تم کو یہ کام کرنا ہے، یہ حساب وکتاب

رکھنا ہے، اور یہاں جو مال آتا ہے اور جاتا ہے اس کی اینٹری کرنی ہے۔ یہ سارے کام اس کے ذمہ لگائے اور اسی کی تنخواہ آپ نے مقرر کی۔ اب وہ آدمی مقررہ کام جو آپ نے اس کے لیے ضروری ٹھہرائے ہیں وہ تو کرتا نہیں، حساب و کتاب تو رکھتا نہیں اور جہاں آپ آفس میں داخل ہوئے تو فوراً چائے پیش کرتا ہے، جب آپ اٹھنے لگے تو آپ کے جوتے سیدھے کر رہا ہے، آپ لیٹنے گئے تو آپ کے پاؤں دبانے لگتا ہے، لیکن جس کام کی آپ اس کو تنخواہ دے رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ نے پوچھا کہ وہ حساب لاؤ، تو کہتا ہے کہ ذرا رہ گیا ہے، کل کرلوں گا۔ دوسرے روز پوچھا کہ اس حساب کا کیا ہوا؟ تو کہتا ہے کہ ہاں! کر رہا ہوں، آپ بے فکر رہیے۔ آپ کی دوسری ساری خدمتیں برابر کر رہا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حالانکہ آپ نے اس کو اس کے لیے رکھا بھی نہیں ہے، اپنی طرف سے وہ کام انجام دے رہا ہے۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہوگی؟ آپ چند دنوں تک تو اس کا یہ حال برداشت کریں گے، اس کے بعد آپ اس کو رخصت کردیں گے۔ حالانکہ وہ آپ کی ذات کی خدمت زیادہ کر رہا ہے، لیکن آپ کہیں گے کہ میں نے اس کو اس کام کے لیے نہیں رکھا ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو فرض قرار دیا ہے اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کرسکتی۔

نماز باجماعت کی تاکید

اس زمانہ میں یہ ایک بڑی مصیبت ہے کہ کوئی آدمی اگر کسی چیز کی طرف مائل ہوا اور اس کے ذہن میں کوئی وظیفہ آیا تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ کا نام کوئی آدمی پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کا ثواب ضرور دیں گے۔ مَیں اس سے منع نہیں کر رہا ہوں

لیکن جو فرائض ہیں ان کو وہ آدمی ادا نہیں کرتا۔ یا نماز تو پڑھتا ہے لیکن گھر ہی میں پڑھ لیتا ہے، جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتا؛ تو یہ بہت ہی غلط بات ہے۔ جماعت کی تو اتنی زیادہ تاکید آئی ہے کہ حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو لوگ رات کی نماز میں جماعت میں نہیں آتے، میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں یہاں نماز کھڑی کرنے کا حکم دے کر جاؤں، اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اگر عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایسا کرتا۔ بعض علماء کے نزدیک تو نماز کے لیے جماعت شرط ہے۔ ہمارے حنفیہ کے یہاں بھی جماعت سنتِ مؤکدہ ہے، کوئی آدمی اگر جماعت چھوڑنے کی عادت بنالے تو وہ فاسق ہے، اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ اور بھی بہت ساری احادیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک آدمی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں نہیں آتا اور صبح صادق سے پہلے سے اٹھ جاتا ہے، اور اپنے گھر کے ایک کونہ میں مصلیٰ پر بڑی تسبیح لے کر بیٹھ جاتا ہے، مصلیٰ سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا، اور فرض نماز وقت پر گھر ہی میں پڑھ لیتا ہے، جماعت کا اہتمام نہیں کرتا؛ تو اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے لیے کیا فیصلہ ہے۔ اور جو آدمی نماز ہی نہیں پڑھتا اور سارے وظیفے پڑھتا رہتا ہے؛ اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ تو درحقیقت اس قسم کے لوگ خاص دھوکہ میں ہیں، اور نفس وشیطان آدمی کو ان چیزوں میں ڈال کر اس کی جو اصل ذمہ داری ہے، اور اس کا جو فرضِ منصبی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مختلف حیثیتوں سے جو چیزیں لازم اور ضروری قرار دی گئی ہیں، ان سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میرا بندہ میرا قرب کسی اور چیز سے اتنا زیادہ حاصل نہیں کر سکتا، جتنا فرائض کے ذریعہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری مثال

اس کے بالمقابل آپ اپنا وہ ملازم دیکھئے کہ اس کے لیے آپ نے جو ڈیوٹی مقرر کی ہے، وہ برابر اس کو انجام دیتا ہے۔ وقت پر پابندی سے حاضر ہو جاتا ہے، اور اپنی ذمہ داری میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو سلام بھی نہیں کرتا، اور کبھی آپ کے جوتے اس نے سیدھے نہیں کئے، آپ کے ٹیبل پر ٹھنڈا پانی لا کر بھی کبھی نہیں رکھا، آپ بیمار ہوئے تو کبھی آپ کی خیریت پوچھنے بھی نہیں آیا، تب بھی جو واقعتاً تجارتی ذہن کا آدمی ہوگا وہ اس کی یہ ساری باتوں کو برداشت کرلے گا کہ وہ اپنی ڈیوٹی تو برابر پوری کر رہا ہے نا، بس! کافی ہے۔ اس کے متعلق آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، آپ اس سے خوش ہیں، چاہے آپ اس کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار نہ کریں۔

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرائض لازم کئے گئے ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو فرض کیا ہے، اور پھر بندہ اس کی طرف سے غفلت برتے، تو یہ سوچنے کی چیز ہے کہ وہ کتنی بڑی غفلت قرار دی جائے گی۔ وہ نا قابل معافی جرم ہے۔ اور فرائض جان بوجھ کر چھوڑنے پر شریعت میں بہت سخت سزائیں ہیں۔ لیکن کوئی آدمی نفل نہیں پڑھے گا تو کوئی بھی سزا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بڑی اہم بات ہے۔ ہم لوگ اس قسم کی حدیثوں کو پڑھتے ہیں اور ترجمہ سمجھ کر گزر جاتے ہیں، لیکن اس کے اندر جو سبق دیا گیا ہے، اور جس چیز کی طرف خاص طور سے متوجہ کیا گیا ہے، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ اس میں ہماری اصل بیماریوں کو پکڑا ہے۔

بعض لوگ فرائض تو ادا کرتے ہیں لیکن نوافل کا جتنا اہتمام کرتے ہیں، اتنا اہتمام فرائض کا نہیں کرتے۔ ان کی جو توجہ نوافل کی طرف ہوتی ہے، اتنی توجہ فرائض کی

طرف نہیں ہوتی۔ پہلی قسم تو وہ تھی جو فرائض سرے سے ادا ہی نہیں کرتی تھی۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ جو فرائض ادا تو کرتی ہے لیکن جو خاص اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں کرتی۔ وہ بھی غلط ہے اور یہ بھی غلط ہے۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست فرض قرار دیا ہو؛ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چیز کتنی اہم ہوگی۔ اور جس کو فرض نہیں کیا ہے اس کا بھی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس چیز کی کتنی اہمیت ہے وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں اسی سے پتہ چلتا ہے۔

قرب بالنوافل

اب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کا مسئلہ آیا، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد محبت پیدا کرنے والی چیز نوافل ہے، کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا مقام بنانا چاہتا ہے، تو خود اللہ تعالیٰ اس کے لیے نوافل کا راستہ بتا رہے ہیں۔ جیسے ایک آدمی اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ خدمتیں بھی کرتا ہے؛ تو آپ اُس کے ساتھ دل سے جو محبت کریں گے؛ وہ ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ ایک آدمی ایسا ہے جو اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا پورا انجام دیتا ہے، اس کی ڈیوٹی کے معاملہ میں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن آپ کے ساتھ خدمت وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں رکھتا تو سیدھی سی بات ہے کہ اِس سے اگر چہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن جو محبت اُس کے ساتھ ہوگی وہ اِس کے ساتھ نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ خود حفاظت کا انتظام کرتے ہیں

آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں

اور اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا قائم ہو جاتا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

ان چیزوں کا کیا مطلب ہے؟ اس کی تشریح میں شراح اور علماء نے بہت ساری باتیں کہی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی بندے کو اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوبیت کا مقام ملتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کی ہر حرکت وسکون، اس کا چلنا پھرنا، اس کا دیکھنا اور سننا؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اسی چیز کو سنتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اس کو اسی چیز کے سننے کی توفیق دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور جس کام سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس کو اس کام کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کریں گے تو اس کے دل میں بھی ایسی چیزوں کے سننے کا خیال کہاں پیدا ہوگا۔ اس کو تصور ہی نہیں آئے گا۔ کوئی لاکھ اس کے پیچھے پڑے، اس کو اپنے ارادے سے ہٹا نہیں سکتا۔ دوسرے جملوں کا بھی یہی مطلب ہے کہ میں اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو وہی چیزیں دکھلاتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوتے ہیں، دوسری چیزوں کے دیکھنے کی اس کے دل میں خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے جس بچے سے باپ محبت کرتا ہو تو اس بچے کو باپ ایسی چیز کرنے ہی نہیں دیتا جو باپ کو پسند نہیں ہے۔ اس کو سمجھاتا رہتا ہے کہ دیکھو

بیٹا! ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس سے نقصان ہوگا۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، وہ تو دلوں کا مالک ہے، اس لیے وہ تو دلوں میں ایسی چیز کی رغبت اور میلان ڈالتا ہی نہیں جو خود کو ناپسند ہے۔

اس لیے کہ آدمی کوئی بھی کام اس وقت کرتا ہے جب پہلے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ ہی کسی چیز کو دیکھنا نہ چاہیں تو پھر آپ کی آنکھ وہ چیز کیوں دیکھے گی؟ آنکھ تو وہی چیز دیکھتی ہے جس کا آدمی کے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ پہلے دل حکم دے گا، پھر آنکھ ادھر متوجہ ہوگی۔ سننے کے لیے بھی یہی معاملہ ہے۔ پکڑنے کے لیے بھی یہی مسئلہ ہے۔ چلنے کے لیے بھی یہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اس کی حفاظت کا انتظام کرتے ہیں، اور شیطان کو اس پر قابو اور تسلط دیتے ہی نہیں۔

قرآنِ پاک میں اسی کو کہا گیا ہے ﴿وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ شیطان نے جب اللہ تعالیٰ کے سامنے قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ میں اولادِ آدم کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے گمراہ کروں گا، اور ان کا برابر شکار کرتا رہوں گا، اور ان میں سے اکثر وہ ہوں گے جو تیرے شکر گزار اور اطاعت شعار نہیں ہوں گے۔ تو نے ان کو جو نعمتیں جن مقاصد کے لیے دی ہیں؛ وہاں استعمال کرنے والے نہیں ہوں گے۔

شکر کس کو کہتے ہیں؟

آنکھ کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جس کام کے لیے دی ہے، وہاں استعمال کی جائے۔ کان کا شکر یہ ہے کہ کان جس کام کے لیے دیا ہے، وہاں استعمال کیا جائے۔ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو وہی چیز سنی جائے، یہی کان کا شکر ہے۔ اور شیطان کے تسلط کے نتیجہ میں آدمی ان اعضاء کو ایسی جگہ استعمال کرنے لگتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ

نے استعمال کرنے سے منع کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ میرے جو مخصوص بندے ہیں ان پر میں تجھے قابو نہیں دوں گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بندہ فرائض کی ادائیگی کے بعد جب نوافل کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو وہی چیز دکھلاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور وہی چیز سنواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ وہی چیز اس کے ہاتھوں پکڑواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اسی طرف اس کے قدم آگے بڑھتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ اس حدیث کے تمام مطالب کا خلاصہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ تو اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ جب محبت کرے گا تو اس کی پوری طرح سے حفاظت کرے گا۔ دنیا کا بھی یہی دستور ہے کہ محبت کرنے والا جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کو کسی ایسی جگہ جانے ہی نہیں دیتا جہاں وہ نہیں چاہتا۔

سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں

"وَاِنْ سَأَلَنِیْ أَعْطَیْتُهُ" جب اس کو یہ مقام حاصل ہو گیا تو اب ظاہر ہے کہ آگے کے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے تو میں اس کو دوں گا۔ اس کی کوئی درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ جو دعا کرے گا وہ قبول ہوگی۔

"وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَأُعِیْذَنَّهٗ" اور اگر کسی شر سے اللہ کی حفاظت چاہے گا اور اللہ کی پناہ میں آنا چاہے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی پناہ میں لے لیں گے۔ جب بھی کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کریں گے۔

اس کے لیے تو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوتی رہے گی۔

ایسی خیرات سے کیا حاصل؟

یہاں بات قرب کی چل رہی تھی اور اسی سے محبوبیت کا مقام ملتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ نمبر اول پر عبادات کے تمام شعبوں میں فرائض کا اہتمام کیا جائے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ خوب خیرات کرتے ہیں لیکن ان کو پوچھو کہ زکوٰۃ کا حساب کیا ہے؟ تو کہیں گے کہ نہیں کیا ہے۔ تو اب ایسی خیرات سے کیا حاصل ہوا؟ اس لیے فرائض اپنی جگہ پر فرائض ہیں، جب تک کہ وہ نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے یہاں نوافل قبول نہیں ہوتے۔ اس لیے فرائض کے اہتمام کے ساتھ جیسا کہ ابھی بتلا دیا کہ نوافل بھی کوئی بے کار چیز نہیں ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ہر طرح سے اس کی مدد اور حفاظت کرتے ہیں۔

مقبولیت و مردودیت کا معیار

٣٨٧: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ تَعَالیٰ الْعَبْدَ نَادیٰ جِبْرِيلَ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، فَيُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولَ فِي الْأَرْضِ. (متفق عليه)

وفي رواية لمسلم: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ إِذَا أَحَبَّ عَبْداً دَعَا جِبْرِيلَ، فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي

السَّمَاءِ، فَيَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحِبُّوْهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقُبُوْلَ فِيْ الْأَرْضِ. وَإِذَا أَبْغَضَ عَبْداً دَعَا جِبْرِيْلَ، فَيَقُوْلُ: إِنِّيْ أُبْغِضُ فُلَاناً فَأَبْغِضْهُ، فَيُبْغِضُهُ جِبْرِيْلُ، ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَاناً فَأَبْغِضُوْهُ، فَيُبْغِضُهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِيْ الْأَرْضِ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو پکارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتے ہیں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اس کے بعد حضرت جبرئیل آسمان والوں میں آواز لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے زمین پر قبولیت ڈال دی جاتی ہے۔

یہی روایت ایک اور سند سے پیش کی ہے جس میں ایک اضافہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو فرماتے ہیں کہ مَیں فلاں بندے سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس کو ناپسند کرو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل اس کو ناپسند کرتے ہیں اور تمام آسمان والوں میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتے ہیں، اے آسمان والو! تم سب بھی اس کو ناپسند کرو اور اس سے نفرت کرو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان والے اس کے ساتھ نفرت اور بغض کا معاملہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے لیے روئے زمین پر ناپسندیدگی رکھ دی جاتی ہے۔

افادات: اس حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقبولیت اور مردودیت کا صحیح معیار بتایا ہے۔ اس حدیث سے ہمارے اکابر اور شراح نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو مقبولیت اوپر سے نیچے کی طرف یعنی خواص سے عوام کی طرف جاوے، وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ عنداللہ مقبول ہے۔ اور جو قبولیت ایسی نہ ہو، بلکہ صرف عوام ہی عوام تک محدود رہے، یا عوام میں بہت چرچا ہونے کی وجہ سے خواص بھی اس کو جاننے لگ

جائیں، لیکن اخص الخواص پھر بھی اس کی طرف متوجہ نہیں؛ تو یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت نہیں ہے۔

عنداللہ مقبولیت کی اصل ترتیب تو یہی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کریں، پھر حضرت جبرئیل، پھر وہ آسمان میں کہیں اور تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگیں اور پھر اس کی محبت زمین والوں میں ہو۔ اور پھر زمین میں بھی یہی ترتیب رہتی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے اخص الخواص بندوں کے دلوں میں اس کی محبت پہلے آتی ہے۔ وہ اس سے محبت کا تعلق اور معاملہ کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ محبت کا معاملہ کرنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں اہل اللہ کے یہاں یہ آدمی مقبول ہے۔ اور تمام اللہ والے اس سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ پھر یہ معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ اور پھر عوام کے اندر مقبولیت آتی ہے۔ یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے۔

مقبولیت یا فتنہ

کھیرالو والے باپو ([illegible]) کا کسی زمانہ میں بہت چرچا ہوا تھا، موجودین میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ ان کے دم کرنے کا عوام میں اتنا زبردست چرچا تھا کہ وہ بھروچ میں دم کریں گے اور ان کا دم سورت میں پہنچ جائے گا۔ کسی زمانہ میں ہر جگہ ان کا خوب چرچا تھا، لیکن اس زمانہ میں اللہ کے مقبول جو بندے تھے ان کو پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور پھر تو لوگوں نے بھی دیکھ لیا کہ کچھ دنوں کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گذر گیا۔ یہ کوئی مقبولیت نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایک فتنہ ہوا کرتا ہے۔

اوراگرفساق وفجار کے وہاں کسی کا مقام ہے،اوراہلِ ایمان تواس کو پسند ہی نہیں کرتے تو پھراس کا تو کوئی سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔ایسوں کے متعلق تو کوئی گمان ہونا ہی نہیں چاہیے کہ یہ بھی مقبولیت ہوسکتی ہے۔ساری دنیاکے فساق وفجاراس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اورتعریفیں کرتے ہیں،اوران کی طرف سے نکالے جانے والے اخباروں کے اندراس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں،تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ظاہرفرمادیں گے

حدیثِ پاک کامضمون ہے،حضوراقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا کوئی عمل کرتاہے،چاہےسات پردوں کے اندرہو،مکان کے کونے میں اوراندھیریوں میں ہو؛تب بھی جب وہ اللہ کی اطاعت کرے گاتواس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کولوگوں میں ظاہرفرمادیں گے۔اورجوآدمی اللہ کی نافرمانی کے کام کرتاہے،چاہےسات پردوں میں چھپ کرکرتاہو،تووہ بھی لوگوں میں ظاہرہوجاتاہے۔

دلوں پرحکومت

دیکھو!ہرزمانہ میں جواہل اللہ ہوتے ہیں ان کی محبت کا یہ عالم ہوتاہے کہ ساری دنیاان سے محبت کرتی ہے۔کوئی ان سے پوچھے کہ کیا آپ نے ان کودیکھاہے،تو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ نہیں!آج تک ملاقات نہیں ہوئی ہے۔لیکن ان کے دلوں میں بھی ان کی محبت جوش مارتی ہے۔ابھی ماضی قریب میں ہمارے حضرت قاری صدیق صاحب باندویؒ جب تشریف لاتے تھے۔لوگ جب ان کی آمدکا سنتے تو کھنچے چلے جاتے تھے۔ہرزمانہ میں اللہ والوں کی یہی مقبولیت رہی ہے۔اوربعض اہل اللہ کاحال

تو ایسا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی صدیوں تک ان کی یاد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے وعظ میں ہے کہ ایک انگریز کہنے لگا کہ ایک آدمی صدیوں سے قبر میں سویا ہوا ہے، اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ کون؟ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ۔ حالانکہ وہ قبر میں ہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ والوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں کس نے ڈالی؟ کیا کوئی ان کا خاص پروپیگنڈہ کرتا ہے؟ کسی اخبار میں آیا؟ کہیں ریڈیو اور ٹی وی پر ان کا نام آیا؟ بلکہ یہ لوگ تو ایسی تمام چیزوں سے اپنے آپ کو بہت دور رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے باوجود ان کا پورے عالم میں چرچا ہوتا ہے۔ حالانکہ اِس دور کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا نام میڈیا میں ضرور آنا چاہیے، لیکن میڈیا میں ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا، اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، اسی کو "ثُمَّ یُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ" کہا گیا ہے۔

یہی حال مبغوضیت کا بھی ہے۔ دنیا کے بہت سے بدمعاش اور اللہ کے بڑے بڑے نافرمانوں کو مَیں نے اور آپ نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ فرعون اور ابو جہل کو کس نے دیکھا ہے، لیکن ابو جہل کے متعلق میرے اور آپ کے دل میں کیا محبت کا جذبہ ہے؟ اسی طرح ہر زمانہ کے اعلیٰ درجہ کے نافرمانوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ایک نفرت سی ہوتی ہے۔ آخر وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ حالانکہ جس کے دل میں نفرت ہے اس سے پوچھا جائے کہ فلاں بندہ نے تیرا کچھ بگاڑا ہے؟ اس نے تیرا کوئی نقصان کیا

ہے؟ تو وہ کہے گا کہ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر کیوں اس کے متعلق نفرت ہے؟ کس نے دل میں نفرت ڈالی؟ دراصل یہی بات ہے کہ یہ سب قدرت کا نظام ہے۔

بہرحال! یہ دونوں چیزیں؛ مقبولیت اور مردودیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں۔ اور اس بات کو آپ لوگ یاد رکھ لیجئے کہ کون سی مقبولیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ خواص سے عوام کی طرف آوے۔ اگر صرف عوام ہی عوام میں رہے، خواص کی طرف نہ ہو، تو وہ عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں سمجھی جاتی۔

ایک صحابی کی ادا

٣٨٨: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ رَجُلاً عَلىٰ سَرِيَّةٍ، فَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهِ فِي صَلاَتِهِمْ، فَيَخْتِمُ بِـ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾، فَلَمَّا رَجَعُوْا ذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: "سَلُوْهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ"؟ فَسَأَلُوْهُ، فَقَالَ: لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ، فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَخْبِرُوْهُ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يُحِبُّهُ". (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو لشکر کی ایک ٹکڑی کے اوپر امیر بنا کر بھیجا۔ (پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ جو لشکر روانہ فرماتے، اور آپ بنفسِ نفیس اس میں تشریف نہیں لے جاتے تھے، ایسے لشکر کو "سَرِيَّةٌ" کہتے ہیں۔ اور جو امیرِ لشکر ہوتا تھا وہی نماز کی جماعت کا امام بھی ہوتا تھا، اس کی تفصیل بھی پہلے بتلا چکا ہوں) تو وہ امیرِ لشکر جب ساتھیوں کو نماز پڑھاتا تھا تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد جو قراءت کرنی ہوتی وہ کرتا، اور اخیر میں "سورۂ قل ھواللہ اُحد" پڑھتا۔ وہاں سے آنے کے بعد ساتھیوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا

تذکرہ کیا (کہ یارسول اللہ! ہمارے امام صاحب تو عجیب آدمی ہیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد جو قراءت کرنی ہوتی وہ کرتے، اوراخیر میں ''سورۂ قل ھواللہ أحد'' ضرور پڑھتے تھے۔ گویا تعجب کے طور پر رفقاء نے اس چیز کا تذکرہ کیا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ صرف یہی سورۃ پڑھتے تھے جیسے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، لیکن اِس روایت میں ''یَـخْتِـمُ'' کا لفظ ہے۔) تو حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے پوچھو کہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ (آخراس نے ایسی عادت کیوں بنائی ہے؟) لوگوں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے (﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ أَحَدٌ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ اللہ بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں ﴿لَمْ يَلِدْوَلَمْ يُوْلَدْ﴾ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

شانِ نزول

روایتوں میں آتا ہے کہ کفارِ قریش نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ''أُنْسِبْ لَنَا رَبَّكَ'' چوں کہ ان کے یہاں تو نسب نامہ کی بڑی اہمیت تھی، اور وہ اپنے نسب اور خاندان پر فخر کرتے تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کو، بچہ بچہ کو، دیہاتی اور شہری کو اپنا نسب نامہ پورا یاد ہوتا تھا، بلکہ اپنا ہی نہیں، پورے خاندان کا نسب نامہ یاد ہوتا تھا۔ تو انہوں نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب بیان کرو، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے نہ کوئی پیدا ہوا ہے، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

خیر! ان صحابی نے۔ جو اپنی ہر رکعت میں قراءت کے بعد یہ سورت پڑھا

کرتے تھے- جواب میں عرض کیا کہ)مَیں اس سورت کو پڑھنا اس لیے پسند کرتا ہوں (کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے یہ وجہ بتائی) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو بتادو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

افادات: سیدھی بات ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں، جن کے ذریعہ سے آدمی اللہ کی محبت حاصل کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی محبت ومعرفت کے انوار سے ہمارے قلوب کومنور فرمادے۔

اَلتَحْذِیْرُ مِنْ اِیْذَآءِ الصَّالِحِیْنَ وَالضُّعْفَةِ وَالْمَسَاکِیْنَ

نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا

۱؍جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۲۰ھ ۱۴؍اگست ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّآاللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔أمابعد:

نیا عنوان قائم کیا ہے جس میں نیک لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے ڈرایا جارہا ہے کہ نیک لوگوں کے ساتھ کوئی آدمی اگر ایذاء رسانی کا معاملہ کرے، کوئی ایسا سلوک یا رویہ اختیار کرے، جس سے ان کو تکلیف پہنچتی ہو؛ تو اس کے اوپر کیا وعید ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس آدمی کو کیا نقصان بھگتنا پڑے گا۔ اس کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں۔

بڑا بہتان، کھلا گناہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے، اگرچہ وہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، اس میں یہ حضرات بھی آجاتے ہیں جن کا باب کے عنوان میں تذکرہ آیا ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں ﴿بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا﴾ بغیر اس کے کہ ان ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے کچھ ایسا کام کیا ہو جس کی وجہ سے وہ تکلیف کے حق دار بنتے ہوں۔ (مطلب یہ ہے کہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ناحق تکلیف پہنچاتے ہیں) ﴿فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ تو ایسے لوگ اپنے اوپر بہتان کا اور کھلم کھلے گناہ کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ اگر تکلیف زبان کے ذریعہ سے غیبت کر کے یا اور کسی طریقہ سے پہنچائی ہے، تو

گویا وہ ایک طرح کا بہتان ہے جس کا گناہ اپنے سر ڈال رہے ہیں۔قولی تکلیف کے لیے بہتان کا لفظ استعمال کیا۔اور اگر اپنے کسی عمل اور فعل سے تکلیف پہنچا رہے ہیں تو بھی گویا کھلم کھلا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ کسی بھی اہلِ ایمان مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانے پر، چاہے وہ قولی ہو یا فعلی ہو، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ایسا کر کے وہ اپنے سر پر بہت بڑا بہتان اور الزام لے رہے ہیں اور کھلم کھلا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ جب کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کی سزا بھی ان کو بھگتنا ہے۔

گویا ان کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بہتان اور اثمِ مبین سے تعبیر کیا ہے۔اور قرآنِ پاک جس چیز کو اثمِ مبین کہے وہ کبیرہ گناہ میں داخل ہوگا۔اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ کسی بھی مسلمان مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، چاہے کسی بھی طریقہ سے تکلیف پہنچائے، اپنی زبان سے پہنچائے یا اپنے ہاتھ سے پہنچائے، کوئی ایسا طرزِ عمل یا ایسی عملی شکل اختیار کرے جس کے نتیجہ میں کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہے؛ تو وہ سب حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔

غلط پارکنگ

ہم لوگ بہت سی مرتبہ ایسا کام کر لیا کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جیسے ایک آدمی اسکوٹر پر سوار ہو کر جا رہا تھا، کوئی ملنے والا سامنے آیا تو وہیں راستہ میں اپنی سواری اس طرح کھڑی کر دی، یا اپنی گاڑی راستہ ہی میں ٹھہرا دی، اس کی وجہ سے پیچھے والوں کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔یا اپنی سواری ایسی جگہ پارک کر دی جس کی وجہ سے آنے

جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔آدمی جب عجلت میں ہوتا ہے تو عام طور پر یہ سمجھ کر کہ مَیں ابھی آتا ہوں، اپنی موٹرسائیکل یا کار کو غلط جگہ پارک کرکے چلا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی ایک دو کو نہیں، بلکہ کئی آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تو یہ سمجھ کر گیا تھا کہ دو چار منٹ میں آجاتا ہوں لیکن انہیں دو چار منٹ میں یہاں کیا ہو رہا ہے، اس کا اس کو اندازہ نہیں ہوتا۔ جب کبھی خود ہی اس طرح کی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو پھر اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے۔

ٹیپ ریڈیو زور سے بجانا

اسی طرح اپنے گھر میں زور زور سے ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ بجا رہا ہے، چاہے اس میں کسی کا وعظ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ جو وعظ سننا چاہتے ہیں وہ دوسروں کو- جبکہ وہ اپنے کام مشغول ہیں- زبردستی سنائیں۔ جب زور زور سے آواز ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کی نیند خراب ہوتی ہے۔ یا آپ کے لیے چاہے سونے کا وقت نہ ہو لیکن کوئی بیمار ایسا ہے کہ جس کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی، اور اِس وقت اس کی آنکھ لگ ہی رہی تھی کہ آپ کی ریڈیو کی آواز سن کر اس کو جو آرام پہنچنے والا تھا اس سے وہ محروم ہوگیا۔ لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی اور بھی بہت ساری شکلیں ہیں۔

نماز سے تکلیف نہ دے

علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک آدمی نماز کی نیت مسجد کی آخری صف میں باندھ رہا ہے، اور پوری مسجد خالی ہے تو اس کو چاہیے تھا کہ آگے کی صفوں میں کہیں کھڑا ہوکر نیت باندھتا۔ جب آخری صف میں نیت باندھے گا اور کوئی نکلنا چاہے گا تو اس کو پوری مسجد گھوم کر جانا پڑے گا۔ یہ بھی ایذاء مسلم میں آجاتا ہے۔ ہر موقع پر آدمی کو اس

بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مَیں جو شکل اختیار کر رہا ہوں اس کی وجہ سے کسی کو دانستہ یا نادانستہ کوئی تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے۔

عام استعمال کی چیزوں کو اس طرح استعمال کر کے رکھ دینا کہ آئندہ وہ کسی دوسرے کے لیے قابلِ استعمال نہ رہیں؛ یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ بہرحال! آدمی اگر سمجھ داری سے کام لے، تو ایسی بہت سی باتوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے جو اس کی بے خبری میں لوگوں کی ایذاء اور تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔

یہاں تو علامہ نوویؒ نے یہ آیت پیش کی ہے، اس میں چوں کہ عام اہلِ ایمان -چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں ان- کو ایذاء پہنچانے پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعید سنائی ہے، اس میں صالحین تو بطریقۂ اولیٰ آجائیں گے۔ جب عام اہلِ ایمان کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے تو جو نیک لوگ اور اللہ کے مقبول اور مقرب یا کمزور اور مسکین بندے ہیں ان کو اگر کوئی آدمی تکلیف پہنچائے گا تو اس میں تو اور زیادہ گناہ ہوگا۔

جس کا کوئی نہیں

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ کسی یتیم کے اوپر مسلط مت ہو جاؤ، اور اس کو مغلوب مت کرو۔ یعنی یتیم کے ساتھ زبردستی ایسا معاملہ مت کرنا جس کی وجہ سے وہ دباؤ میں آجائے۔ یتیم بھی کمزوروں میں آجاتا ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسا کمزور جس کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اس معاملہ پر ہمارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکے گا، اس کی طرف سے ردِّ عمل کے طور پر کوئی کارروائی نہیں ہوگی، تو قوی آدمی اس کے ساتھ غلط معاملہ کرنے کی جرأت کر لیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کا اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔

بھلے ہی دنیا میں وہ کمزور ہے اور اس وجہ سے وہ آپ کے اس غلط رویہ پر فوری طور پر کوئی ایکشن اور بدلہ نہیں لے سکتا۔ لیکن آپ یہ سمجھ کر کہ وہ میرا کچھ نہیں کرسکتا، اس کے ساتھ ناحق زیادتی کریں؛ شریعت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔

بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جس کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہو، ایسے آدمی کے ساتھ جب کوئی زیادتی کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آجاتی ہے، اور پھر وہ آدمی ایسا پکڑ لیا جاتا ہے کہ دوسروں کے لیے عبرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کسی کی کمزوری کو دیکھ کر اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرنا؛ یہ آدمی کے لیے بڑا مہلک اور خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہا کہ یتیم کو مغلوب مت کرو، بلاوجہ اس کو دباؤ میں مت لاؤ۔

سائل کو مت جھڑکو

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلاَ تَنْهَرْ﴾ اور مانگنے والے کو مت جھڑکو۔ کوئی آدمی آپ کے پاس سوالی بن کر آیا، تو اگر اس کے سوال کو پورا کرنے کے لیے آپ کے پاس کچھ موجود ہے تو آپ اپنی حیثیت کے مطابق اس کو دے دیجیے۔ لیکن آپ اس کو کچھ دیتے تو ہیں نہیں اور بلاوجہ جھڑکتے ہیں، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ شریعت نے ہر ایک کے لیے کچھ حقوق مقرر کیے ہیں کوئی آدمی جب آپ کے دروازہ پر سائل بن کر آیا ہے تو شریعت نے اس کا بھی حق رکھا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے "لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَإِنْ جَآءَ عَلَىٰ فَرَسٍ" (ابوداود شریف۔۱٦٦۷) مانگنے والے کا بھی ایک حق ہے، چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہی آیا ہو اگر کوئی آدمی موٹر سائیکل پر مانگنے کے لیے آیا تو آپ اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیرے پاس موٹر سائیکل

ہے، اور تو مانگتا ہے؟ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بے چارہ موٹر سائیکل پر جارہا تھا، اور کسی نے لوٹ لیا۔ اب اس کی جیب میں کچھ نہیں بچا اس لیے اس کو مانگنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ہمیں اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے اور مانگتا ہے۔ ہم اس کے سوال پر اپنی حیثیت کے مطابق اگر اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔ اور اگر ہمارے پاس اتنی طاقت اور استطاعت نہیں ہے، تو کم از کم اس کو جھڑکنے کی یا اس کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے اُلجھا نہ جائے، بلکہ اس کو کوئی مناسب اور بھلی بات کہہ دیجیے؛ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔ اور جب مانگنے والا آپ کو یہ دعا دے رہا ہے کہ اللہ تمہارا بھلا کرے تو آپ بھی اس کو یہی دعا دیدیجیے، لیکن اس کو کسی حال میں بھی جھڑکا نہ جائے؛ یہ بدسلوکی ہے۔ وہ تو آپ سے اچھی توقع لے کر آیا تھا، اب آپ اس کی وہ توقع تو پوری نہیں کررہے ہیں، اور زبان سے اس کو بھلی دعا دے سکتے تھے، یا اچھی بات کہہ سکتے تھے؛ وہ بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں تو آپ کا کوئی خرچ بھی نہیں ہو رہا ہے، اوپر سے اس کو جھڑک رہے ہیں گویا یہ تو بالکل گھٹیا درجہ کی اور نچلی سطح کی بات ہوئی۔ کوئی معمولی آدمی بھی اس گوارہ نہیں کرسکتا کہ جب آپ کچھ مال نہیں دے رہے ہیں تو زبان سے اچھی بات کہہ دینے میں تو آپ کا کچھ خرچ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی تو آپ اس کو ڈانٹنے کے لیے زبان ہلا ہی رہے ہیں؛ تو بھلی بات کے لیے یا دعا دینے کے لیے ہلانے میں کیا حرج تھا؟ شریعت کی یہی تعلیم ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو کیوں خراب کریں؟ ہاں! اگر وہ بار بار بلاوجہ آپ سے اُلجھ رہا ہے، تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے حسنِ تدبیر سے کم سے کم جو طریقہ ہوسکتا ہو، وہ اختیار کرسکتے ہیں۔

آگے اس سلسلہ میں جو روایتیں لا رہے ہیں ان میں دو روایتوں کا تو حوالہ ہی دیدیا۔ ایک تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو پچھلے باب میں گذری "مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے کسی دوست اور ولی کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے، اس کو مَیں جنگ کی وارننگ دیتا ہوں۔ اس کی پوری تفصیل اوپر والے باب میں گذر چکی ہے۔

ایک اور روایت کا حوالہ دیا ہے جو کئی ابواب پہلے گذری ہے، اس کو تو ہم دوبارہ تازہ کر لیتے ہیں۔

اللہ کی تلواروں نے حق وصول نہیں کیا

عَنْ أَبِی هُبَیْرَةَ عائِذِبْنِ عَمْرِوالْمُزَنِیِّ وَهُوَمِنْ أَهْلِ بَیْعَةِالرِّضْوَان رضی اللہ عنہ أَنَّ أَبَا سُفْیَانَ أَتٰی عَلیٰ سَلْمَانَ وَصُهَیْبٍ وَبِلالٍ فِیْ نَفَرٍ، فَقَالُوْا: مَا أَخَذَتْ سُیُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عَدُوِّاللّٰهِ مَأْخَذَهَا۔ فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ: أَتَقُوْلُوْنَ هٰذَا لِشَیْخِ قُرَیْشٍ وَسَیِّدِهِمْ؟ فَأَتٰی النَّبِیَّا فَأَخْبَرَهٗ، فَقَالَ: یَاأَبَابَكْرٍ! لَعَلَّكَ أَغْضَبْتَهُمْ؟ لَئِنْ كُنْتَ أَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْأَغْضَبْتَ رَبَّكَ۔ فَأَتَاهُمْ، فَقَالَ: یَااِخْوَتَاه! آغْضَبْتُكُمْ؟ قَالُوْا: لَا، یَغْفِرُاللّٰهُ لَكَ یَا أَخِیْ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوہبیرۃ رضی اللہ عنہ جو اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ صلحِ حدیبیہ کے زمانہ میں ابوسفیان کا مدینہ منورہ آنا ہوا۔ حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء مسلمان ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے (اور یہ تینوں پردیسی تھے۔ حضرت سلمان فارس کے رہنے والے تھے۔ حضرت صہیب روم کے رہنے والے تھے اور حضرت بلال حبشہ کے رہنے والے تھے۔ ابوسفیان وہاں سے گزرے) تو ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے (ان کی یہ بات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اچھی نہیں لگی۔ ابوسفیان اگرچہ اسلام نہیں لائے تھے لیکن قریش کے سردار اور بڑے آدمی تھے۔ اور قریش عرب کا باعزت خاندان تھا) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ (حضرت ابوبکر نے ان کی بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ تم نے یہ اچھی بات نہیں کہی۔ اگرچہ حضرت ابوبکر نے ان حضرات کو تنبیہ کرنے کے لیے کوئی سخت بات نہیں کہی تھی، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ قریش کے سردار کے ساتھ تم اس طرح پیش آ رہے ہو؟ اور اس کو ایسی بات کہہ رہے ہو؟) پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خود ہی نے یہ اطلاع دی کہ یا رسول اللہ! آج ایسا ایسا ہوا (ممکن ہے اس خیال سے آگاہ کیا ہو کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی اس رائے سے اتفاق کریں گے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کی) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یَا أَبَا بَكْرٍ! لَعَلَّكَ أَغْضَبْتَهُمْ؟ لَئِنْ كُنْتَ أَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْ أَغْضَبْتَ رَبَّكَ“ اے ابوبکر! شاید تم نے ان حضرات کو ناراض کر دیا (یعنی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اس جملہ کی وجہ سے ان حضرات کو ناگواری ہوئی ہو، تمہاری یہ بات ان کو پسند نہ آئی ہو) اگر تم نے ان کو ناراض کیا ہے (یعنی اگر تمہارے اس جملہ سے ان کو تکلیف پہنچی ہے اور ناگواری ہوئی ہے) تو تم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ”یَا اِخْوَتَاہ! آغْضَبْتُكُمْ؟“ اے بھائیو! کیا میں نے تم لوگوں کو ناراض کر دیا؟ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں! ہمیں کوئی ناراضگی نہیں ہوئی ہے۔ ”یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ یَا أَخِیْ“ اے ہمارے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے (یعنی ہماری طرف سے تو معاف ہے ہی، لیکن اگر تم کو یہ احساس ہے تو ہم بھی تمہارے لیے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔)

افادات: دیکھو! یہاں کہنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کا ایک مقام تھا، اس مناسبت سے اگر انہوں نے ایسی بات اپنی ہی جماعت کے چھوٹے لوگوں کو اچھی نیت سے کہی، تو ان کو حق تھا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ تم نے ایسا کہہ کر ان کو ناراض کیا ہو۔ یعنی یہ امکان ہے کہ تمہاری اس بات سے ان کو ناگواری ہوئی ہو، اور واقعتاً اگر ناگواری ہوئی ہے تو تم نے ایسا کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔

بس! یہاں تو یہ روایت اسی لیے لائے تھے کہ دیکھو! حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر متنبہ کیا۔اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات جن لوگوں سے کہی تھی وہ صالحین میں سے بھی تھے، اور ضعفاء و کمزوروں میں سے بھی شمار ہوتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ان میں تھیں۔اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے مقام اور منصب، یا اپنی کسی دنیوی حیثیت کی وجہ سے کمزور ہو، تب بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی بات کریں جو اس کے لیے ناگواری اور تکلیف کا باعث ہو جائے۔

جب حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ان حضرات کے پاس معافی مانگنے کے لیے گئے۔ یہ بھی حضراتِ صحابہ ہی کی شان تھی۔ میں پہلے بھی بار بار یہ بات بتلا چکا ہوں اور بار بار اس لیے متنبہ کرتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی اس سے سبق لینا چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ حضراتِ صحابہ میں سے کسی کو کسی بات پر اگر متنبہ کرتے تھے تو فوراً وہ حضرات اس چیز کی تلافی کی کوشش کرتے تھے۔فوراً ان کی طرف سے اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ جو قصور ہم سے سرزد ہوا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو متنبہ کیا کہ ہوسکتا ہے کہ تمہاری اس بات سے ان حضرات کو تکلیف پہنچی ہو، اور اگر ان کو تکلیف پہنچی ہے تو پھر تم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا؛ تو فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایسی بات کہی جائے اور حدیث بھی سنائی جائے اور قرآن کی آیت بھی سنائی جائے، تب بھی ہم تاویلیں کر کے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کر لیتے ہیں، اگرچہ دل مطمئن نہ ہو، لیکن اس کی جو تلافی کرنی چاہیے، اس کا اہتمام ہماری طرف سے نہیں کیا جاتا۔

جب صدیق رضی اللہ عنہ نے فاروق رضی اللہ عنہ سے معافی مانگی

یہاں تو ایک بڑے آدمی نے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں۔ لیکن اگر کسی بڑے کے ساتھ یہ بات کی گئی ہو تو پھر معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ بخاری شریف میں قصہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر غصہ میں ڈال دیا، یعنی کسی بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور ناراضگی ہو گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ معافی مانگنے لگے کہ میری بھول ہو گئی مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اتنی زیادہ ناراضگی تھی کہ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے پیچھے جارہے ہیں اور کہہ رہے ہے کہ معاف کر دو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراضگی کی حالت میں آگے آگے چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھر آیا تو وہ گھر میں داخل ہو رہے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پھر ان سے کہا کہ معاف کر دو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور گھر میں چلے گئے۔ جب انہوں نے گھر کا دروازہ ہی بند کر لیا تو اب کیا باقی رہ جاتا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھ گئے، لیکن انہوں نے حضور سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی احساس ہوا کہ مَیں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے مجھے ناراض کیا تھا تو وہ معافی بھی تو مانگ رہے تھے، اس لیے مجھے معاف کر دینا چاہیے تھا۔

اب وہ مجرم ہے

یہاں ایک بات یاد رہے کہ اگر کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا اور اس کو اپنے اس غلط رویہ پر احساس ہوا اور وہ معافی مانگ رہا ہے، تو اب سامنے والے کی

ذمہ داری ہے کہ وہ معاف کردے۔ اگر وہ معاف نہیں کرتا ہے تو اب وہ مجرم بن جاتا ہے۔ کسی سے معافی مانگی جائے اور وہ معاف نہ کرے؛ تو اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں ایک بیماری یہ بھی ہوگئی ہے کہ اگر کسی کو احساس ہوا اور وہ جاکر معافی مانگتا ہے، تو یہ کہتا ہے کہ جاؤ! مَیں معاف نہیں کروں گا، وہ بار بار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے، تب بھی یہ انکار کرتا ہے۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ شریعت اس کی تعلیم نہیں دیتی۔

بھائی! اللہ تعالیٰ کے یہاں تو اس معافی کی اتنی زیادہ قدردانی ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ یوں کہہ دے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے اس نے جتنا بڑا جرم کیا تھا، کسی دوسرے کو ناراض کر کے تو اتنا بڑا جرم نہیں ہوسکتا ہے؟ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی اپنا توشہ پانی لے کر سفر میں نکلا اور ایک جگہ پر آرام کے لیے لیٹا، اس کے اونٹ پر سارا سامان موجود تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ اونٹ سارے سامان کے ساتھ غائب ہے اب وہ اس جنگل بیابان میں اکیلا ہے، نہ وہاں پانی ہے اور نہ کھانے کے لیے کچھ ہے۔ اس نے اپنے اونٹ کو خوب تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ آخر تھک ہار کر یہ سوچ کر کہ اب تو موت ہی آنے والی ہے، دوبارہ اسی جگہ پر آکر لیٹ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کا وہ اونٹ موجود ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کو جو خوشی ہوگی وہ ظاہر ہے گویا اس کو نئی زندگی ملی۔ تو اب وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے جب بولنے لگا تو مارے خوشی کے زبان بھی قابو میں نہیں رہی، اور یوں کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ اور مَیں تیرا رب۔ (مشکوٰۃ۔٢٠٣)

یہ مثال دے کر حضور ﷺ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس کی خوشی دیکھو کہ کتنا زیادہ خوش ہوا

ہوگا۔ جبکہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے تو نئی زندگی ملی، کہ اس کی زبان بھی قابو میں نہیں رہی۔

تو جب کوئی بندہ گناہ کرنے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے اس توبہ و استغفار پر اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی اس آدمی کو اپنی سواری کا گمشدہ جانور ملنے پر ہوئی تھی جس پر اس کا کھانا پینا اور سامان تھا اور وہ بے قابو ہو گیا تھا کہ زبان بھی اُلٹ سُلٹ بولنے لگی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ تو معافی مانگنے والے سے اتنا زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر کچھ کیا جاتا تو وہاں سے کیا جاتا کہ وہ خالق ہے، مالک ہے۔ اس کی نعمتیں ہم ہر آن اور ہر لمحہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس کی نافرمانی کی گئی اور وہاں معافی مانگی گئی اور وہ معاف نہ کرتا اور سزا دیتا؛ تو انصاف کی بات تھی۔ لیکن وہاں سے تو خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور یہاں ہمارے ساتھ کبھی کسی نے کوئی معاملہ کر دیا اور جب وہ ہم سے معافی مانگنے آیا تو ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے گناہ بھی معاف کئے جائیں۔

کیا تمہیں معافی پسند نہیں؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ یاد کرو جو پہلے کئی مرتبہ بتایا جا چکا ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تہمت کا معاملہ پیش آیا تھا، اور بعد میں قرآنِ پاک میں تہمت سے ان کے پاک ہونے کی آیتیں نازل ہوئیں تو اس واقعہ میں مخلص مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان میں ایک حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، غریب تھے اور مہاجری بھی تھے، ان کا سارا خرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی برداشت کرتے تھے۔ وہ بھی منافقین کی چرب زبانی کی وجہ سے اس سازش میں پھنس گئے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی

براءت آئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اب میں ان کا خرچہ نہیں دوں گا وہاں انہوں نے تو معافی بھی نہیں مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی سفارش کی ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ تم میں سے جو فضیلت اور کشادگی والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت دے رکھی ہے، وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں، غریبوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہیں کریں گے ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ (روح المعانی۔۱۸/۱۲۵)

آدمی اپنے معاملہ میں چاہتا ہے کہ اگر اس سے غلطی اور کوتاہی ہوئی اور اس کو اس کا احساس ہے اور معافی بھی مانگتا ہے، تو اسے معاف کیا جائے۔ تو جب ہم اپنے معاملہ میں یہ چاہتے ہیں تو یہی چیز ہم اپنے دوسرے بھائی کے حق میں کیوں نہ چاہیں؟ اگر اس نے ہمارے ساتھ غلطی کا معاملہ کیا، اور وہ معافی بھی مانگ رہا ہے؛ تو اب ہمیں چاہیے کہ اس کو معاف کردیں۔

میرے دوست کے معاملہ میں میرا خیال نہ کرو گے؟

بہرحال! بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو آکر چپکے سے حضور کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ وہ میرے پاس معافی مانگ رہے تھے، لیکن میں نے معاف نہیں کیا اور گھر کا دروازہ بند کرلیا؛ یہ میں نے اچھا نہیں کیا، تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور خود ہی پورا قصہ حضور کی خدمت میں بیان کررہے ہیں کہ یا رسول اللہ! ایسا ہوا کہ انہوں نے میرے ساتھ یہ

معاملہ کیا اور مجھے ناراضگی ہوئی، پھر وہ مجھ سے معافی مانگ رہے تھے، لیکن میں نے معاف نہیں کیا، یہاں تک کہ میرا گھر آ گیا تو میں نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر حضور اقدس ﷺ کو بہت غصہ آیا، اور آپ کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے "هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوْالِيْ صَاحِبِيْ، هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوْالِيْ صَاحِبِيْ" کیا میرے دوست کو معاف کرنے کے لیے تم تیار نہیں ہوئے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے اس غصہ کو دیکھ کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! غلطی میری تھی یعنی میں نے ہی ابتدا کی تھی، ان کی کوئی غلطی نہیں تھی، پھر بھی حضور اکرم ﷺ برابر یہی جملہ ارشاد فرماتے رہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد تو کوئی بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام ہی نہیں لیتا تھا، سب بہت زیادہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو حضور اکرم ﷺ ناراض ہو جائیں گے۔ (بخاری شریف۔۳٦٦۱)

صالحین اور نیک لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے جو روکا جاتا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے دوست ہیں، اگر ان کو تکلیف پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، اور ہمارا تو بیڑا ہی غرق ہو جائے گا۔

کہیں اللہ تعالیٰ تم سے مطالبہ نہ کر لے

۳۸۹: وعن جندب بن عبداللّٰه رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰه ﷺ: مَنْ صَلّٰى صَلاَةَالصُّبحِ فَهُوَفِيْ ذِمَّةِاللّٰهِ، فَلاَيَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ، فَاِنَّهُ مَن يَّطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ، ثُمَّ يَكُبُّهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ نَارِجَهَنَّمَ۔

ترجمہ مع تشریح: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی فجر کی نماز اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھ لے، وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آ جاتا ہے۔ (یہ بھی بہت بڑی چیز ہے جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، وہ اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں آ گیا، جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے امان

دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس کو حفاظت مل گئی ہے؛) تو اب دیکھنا کل قیامت میں اللہ تعالیٰ اپنی اس حفاظت کی وجہ سے تم سے کوئی مطالبہ نہ کرے (یعنی وہ آدمی جو فجر کی نماز اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھ چکا ہے، چوں کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہے، اب اگر تم اس آدمی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرو گے اور کوئی تکلیف پہنچاؤ گے، تو گویا تم ایسے آدمی کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امان مل چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے پوچھے گا کہ ہم نے جس آدمی کو امان دے رکھی تھی تم نے اس کو تکلیف پہنچائی؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟ اور اللہ تعالیٰ جب کسی سے مطالبہ کر لے، تو آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کا آگے انجام کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کسی سے اپنی ذمہ داری اور امان کے بارے میں کوئی مطالبہ اور پوچھ تاچھ کرے گا تو ایسے آدمی کو اللہ تعالیٰ پکڑے گا، اور پھر اس کو اوندھے منھ جہنم میں ڈالے گا۔

اس لیے بھائیو! جو نماز پڑھنے والے ہیں ان سے بھی ڈرتے رہنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ وہ بھی صالحین میں آ گئے۔

اِجْرَآءُ أَحْكَامِ النَّاسِ عَلٰى الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ عَلٰى اللّٰهِ

ظاہر کے مطابق معاملہ کرو
دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ ۲۱/ اگست ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن یُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَعَلیٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً كَثِیْراً كَثِیْراً۔أمابعد:—

فَإِن تَابُوْاوَأَقَامُوْاالصَّلاَةَ وَآتَوُاالزَّكَاةَ فَخَلُّوْاسَبِیْلَهُمْ(التوبۃ۔آیت ۵)

شک شبہ کرنے کی اجازت نہیں

اسلام میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ مسلمان کی حیثیت سے، یا مشرک کے ساتھ مشرک کی حیثیت سے جو معاملہ رکھنے کا حکم دیا ہے؛ وہ ظاہر کے مطابق ہوگا۔یعنی جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان بتلا رہا ہے اور وہ اپنی زبان سے کلمۂ اسلام کا اظہار کرتا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ میں مؤمن ہوں،اور ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے جو علامتیں اسلام نے بتلائی ہیں مثلاً نماز پڑھنا،زکوٰۃ کا ادا کرنا وغیرہ، وہ سب علامتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں تو پھر ہم اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے۔چوں کہ اس نے اپنے آپ کو مسلمان بتلایا اور مسلمانوں والی علامتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں،تو اب ہم اس کے معاملہ میں شک وشبہ نہیں کریں گے کہ معلوم نہیں اس کے دل میں کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم کو دھوکہ دیتا ہو؟ ہمارے سامنے اسلام و ایمان کا اظہار کرتا ہو؛اور دل میں دوسری بات ہو؟ دکھلاوے کے واسطہ نماز پڑھتا ہو؟ اس طرح کا کوئی شک وشبہ کرنے کی ہمیں اجازت نہیں دی گئی۔بلکہ ہم کو شریعت نے اس بات کا مکلّف کیا کہ جب اس نے اپنی زبان سے کلمۂ اسلام کا اظہار کیا

اور اپنے آپ کو مؤمن بتلایا، اور کسی مؤمن کے ایمان کے لیے جو علامت شریعت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے وہ بھی اس میں پائی جاتی ہے، تو اب آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ مؤمنوں کا سا معاملہ کریں۔ پھر اگر حقیقت میں اس کے دل میں کوئی دوسری بات ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیجئے۔ اگر اس کے دل میں کوئی دوسری چیز ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں جب حساب و کتاب لیں گے تو اس سے نمٹ لیں گے۔ ہمیں اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ معلوم نہیں اس کے دل کے اندر کیا ہے۔ اسلام کا یہ ایک خاص حکم ہے جس کو علامہ نوویؒ اس عنوان کے تحت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو جیسا ظاہر کر رہے ہیں، اسی کے مطابق احکام جاری کیے جائیں گے اور اندرونِ دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے گا۔

تو ان کا راستہ چھوڑ دو

چنانچہ اس سلسلہ میں آیت پیش کی ﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکین اہلِ حرب (یعنی جن مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کا جنگ کا سلسلہ چل رہا ہے ان) کے متعلق حکم دیا ہے کہ ان کو گھیرو، پکڑو اور قتل کرو۔ ان کو چھوڑو مت۔ لیکن پھر فرمایا کہ اگر وہ توبہ کریں اور اپنے شرک سے باز آجائیں اور ایمان قبول کرلیں، اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں، گویا کلمۂ اسلام کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ظاہری علامتیں بھی ان میں پائی جاویں، تو اب ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یعنی اب ان کو گھیرنے، گرفتار کرنے، قتل کرنے اور ان کے خلاف مشرک ہونے کی حیثیت سے جو کارروائی کرنے کا حکم تھا، اس کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اب آپ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا

معاملہ کیجئے، اورایک مسلمان کی جان مال، عزت وآبرو جس طرح محفوظ سمجھی جاتی ہے اس کے ساتھ بھی اسی جیسا معاملہ ہونا چاہیے۔

مجھے قتال کا حکم دیا گیا ہے

۳۹۰۔عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ۔ فَاِنْ فَعَلُوْا ذَالِكَ، عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَآئَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ۔ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم دیا گیا کہ لوگوں کے ساتھ قتال کروں (مشرکین کے ساتھ جنگ کروں) یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دینے لگیں کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگیں (یعنی زبان سے کلمۂ اسلام پڑھ لینے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے) تو یہ حضرات مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کرلیں گے (یعنی وہ قتال اور جنگ جو ان کے ساتھ کی جاری تھی، جس کی وجہ سے ان کی جان مال محفوظ نہیں تھی، انہوں نے ان کاموں کی وجہ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کرلیا) البتہ اسلام کا مطالبہ ان پر باقی رہا۔ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

مگر اسلام کے حق سے

افادات: "اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ" البتہ اسلام کا مطالبہ ان پر باقی رہا۔ یعنی اس کے بعد اگر کوئی کام ایسا کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی حکم یہ ہے کہ ان کی جان پر ہاتھ ڈالا جائے، یا ان کے مال کو لیا جائے، تو پھر اس میں اس کو حفاظت نہیں ملے گی۔ مثلاً اس نے مؤمن ہو جانے کے بعد کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دیا، تو اب ظاہر

ہے کہ اسلام نے اس موقع پر قاتل کے لیے یہی سزا مقرر کی ہے کہ مقتول کے بدلہ میں بطورِ قصاص کے اس کو قتل کیا جائے۔ اب کوئی آدمی یوں کہے کہ بھائی! یہ کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ ایک آدمی کلمۂ شہادت پڑھ لے، نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، تو اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو اب اس پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے، اس کی جان تو محفوظ ہے؟ تو ''بِحَقِّ الْاِسْلَامِ'' کہہ کر اس قسم کے احکام کو مستثنیٰ کر دیا۔

یا مثلاً ایک آدمی نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ ''مُحْصَنْ'' یعنی شادی شدہ، عاقل بالغ اور آزاد ہے۔ اور اس کی عاقلہ بالغہ آزاد عورت کے ساتھ شادی ہو چکی ہے، اس کے بعد بھی اس نے زنا کا ارتکاب کیا، تو ایسے آدمی کے لیے اسلامی حکومت کو شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے۔ یعنی پتھر مار کر اس کی جان ختم کی جائے تو دیکھو! یہاں شریعتِ اسلام نے ہی اس کی جان لینے کا حکم دیا ہے۔

''اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ'' کا مطلب یہی ہے کہ جہاں اسلام ہی اس کی جان لینے کا مطالبہ کرتا ہے، تو وہاں چاہے وہ کلمہ پڑھ چکا ہو، نمازوں کا اہتمام کرتا ہو، زکوٰۃ بھی دیتا ہو؛ سب کچھ کر رہا ہو، لیکن جب اس نے کوئی ایسی حرکت کر لی، جس پر اسلام نے ہی سزا کے طور پر یہ حکم مقرر کیا ہے کہ اس کی جان لی جائے، یا اس کا مال لیا جائے، تو پھر وہاں یہ تینوں کام اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ وہاں کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ دیتا ہے، اس کی جان اور مال تو محفوظ ہے پھر کیوں اس پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے؟ یہاں اسلام ہی کے حکم سے اس پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے جس اسلام نے کلمۂ اسلام کا اظہار کرنے پر اور نماز و زکوٰۃ کا اہتمام کرنے پر اس کے

جان و مال کی حفاظت کی گارنٹی دی تھی؛ وہی اسلام اب یہ حکم دے رہا ہے کہ اس کی اس حرکت پر اس کی جان لی جائے۔ تو اب معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں

"وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ" یہاں اس روایت کو اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا کہ جب یہ لوگ کلمۂ شہادت کا اقرار کرلیں، نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں، تو اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال محفوظ ہوجائیں گے۔ اب کسی کو یہ شک وشبہ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے ظاہر میں دکھلاوے کے واسطے ایسا کیا ہو، اور حقیقی طور پر وہ ایمان نہ لائے ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں "وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ" ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے۔ اب ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے دل کے اندر کی چیز کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہ کا اظہار کریں، یا اپنے دل میں اس کے متعلق کوئی تردد رکھیں کہ معلوم نہیں وہ دھوکہ دینے یا دکھلاوے کے واسطہ ایسا کررہا ہو۔ شریعت نے جب ہم کو یہ بتلا دیا کہ جو آدمی ان اعمال کو انجام دے، اس کے ساتھ تمہیں یہ معاملہ کرنا ہے۔ جب وہ ان اعمال کو انجام دے رہا ہے تو ہمیں اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہے۔ اب اس کے دل میں کیا ہے، اس کے متعلق ہمیں کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے

بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے یمن بھیجا تھا، وہاں سے انہوں نے مالِ غنیمت کے خمس کے طور پر کچھ سونا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ جب وہ سونا مدینہ منورہ پہنچا تو چار حضرات جو مؤلفۃ القلوب تھے۔ یعنی ایسے

لوگ جن کی دل جوئی کرنا مقصود تھا۔ ان میں وہ سونا نبی کریم ﷺ نے تقسیم کردیا، اس پر ایک آدمی نے کہا کہ ہم اس سے زیادہ حقدار تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا "أَلَا تَـأْمَنُوْنِیْ وَأَنَا أَمِیْنُ مَنْ فِی السَّمَآءِ" تم لوگ مجھ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ آسمان والا یعنی اللہ تعالیٰ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے؟ رات اور دن اس کے پاس سے مجھ پر وحی آتی ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کررہا ہے اور مجھے امین قرار دے رہا ہے تو تمہیں میرے اوپر بھروسہ کیوں نہیں؟ جیسے کوئی بڑی شخصیت کسی کے ساتھ اعتماد کا معاملہ کرتی ہو اور کوئی چھوٹا ایسا کہے، تو کہتے ہیں کہ فلاں پر تجھے بھروسہ نہیں؟

اس موقع پر ایک آدمی کھڑا ہوا جس کا حلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی آنکھیں اندر کو گھسی ہوئی تھیں، رخسار اُبھرے ہوئے تھے، پیشانی باہر کو نکلی ہوئی تھی، سر منڈا ہوا تھا ڈاڑھی گھنی تھی اور پائنچے اونچے تھے۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا "اِتَّقِ اللّٰہَ" اللہ سے ڈریو، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مَیں اللہ سے نہیں ڈروں گا تو اور کون ڈرے گا؟ اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اُٹھے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اجازت دیجئے کہ مَیں اس کی گردن اُڑادوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں! "لَعَلَّهٗ أَنْ یَّکُوْنَ یُصَلِّیْ" شاید یہ نماز پڑھتا ہو۔ اس کے جواب میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "کَمْ مِّنْ مُّصَلٍّ یَقُوْلُ بِلِسَانِهٖ مَالَیْسَ فِیْ قَلْبِهٖ" بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں وہ بات نہیں ہوتی جو ان کی زبان پر ہوا کرتی ہے۔ یعنی ہوسکتا ہے کہ ظاہری اور نمائشی طور پر نماز پڑھتا ہو اور کلمہ کا اظہار کرتا ہو، لیکن اس کے دل میں یہ بات نہ ہو؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: "اِنِّیْ لَمْ أُوْمَرْ أَنْ أَنْقُبَ عَنْ قُلُوْبِ النَّاسِ" مجھے یہ

حکم نہیں دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں کے دلوں کی باتوں کو کھود کرید کروں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری شریف:٤٣٥١)

مقصد یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا یہ ایک اصول ہے، خاص کر جبکہ اسلامی مملکت ہو، اور وہاں اسلامی احکام ظاہری طور پر لوگوں پر جاری کئے جاتے ہوں، تو اس کی خاص ضرورت پیش آتی ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے، اس کے متعلق کوئی شک وشبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے۔

ایک غلط طریقہ

آج کل ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اسلام قبول کرنے کے لیے آیا، اور ہمارے سامنے کلمہ بھی پڑھا اور نماز پڑھنا بھی شروع کر دیا اور اسلامی احکام پر عمل بھی کرنے لگا، اس کے باوجود بعض لوگ اس شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ یہ کون آدمی ہوگا۔ کوئی جاسوس تو نہیں ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ جب اس نے ساری چیزیں کر لیں تو آپ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیجئے، اب اگر اس کے دل میں کوئی دوسری بات ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس سے حساب لے لیں گے۔ جنت تو حقیقی اسلام پر ہی ملنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ ہمیں اس چکر میں پڑنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو جس چیز کا کہا گیا ہے اسی کی پابندی کرنی ہے۔

اب اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے

٣٩١: عن أبی عبداللہ طارق بن أشیم ﷛ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّااللّٰہُ وَکَفَرَ بِمَا یُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ؛ حَرُمَ مَالُهٗ وَدَمُهٗ

وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى.

ترجمہ مع تشریح: حضرت طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی لاالٰہ الااللّٰہ کہے (یعنی اسلام کا کلمہ پڑھے۔ یہاں شراح نے لکھا ہے کہ لاالٰہ الااللّٰہ کے ساتھ محمد رسول اللّٰہ بھی ہے، اس لیے کہ صرف لاالٰہ الااللّٰہ سے آدمی مؤمن نہیں ہوجاتا جب تک کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار نہ کرے۔ یہ تو کلمہ اسلام کا ایک عنوان ہے۔) اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن چیزوں کی پوجا کی جاتی ہے ان کا انکار کردے (اس سے اپنے آپ کو بری ظاہر کردے۔ یہ ایک ضروری چیز ہے کہ کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو جب اس کو کلمہ اسلام پڑھایا جائے گا وہاں پہلے ہی اس سے پوچھ لیا جائے گا کہ اب تک کس چیز کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس عقیدے سے بھی توبہ کرائی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ جن بتوں کی وہ پوجا کرتا تھا اس سے توبہ کرکے اپنی براءت کا اظہار کردے، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا قائل ہوجائے) تو اس کا مال اور خون حرام ہوجاتا ہے (یعنی اب ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے) اور اس کا حساب اللہ کے حوالہ کیا جائے گا (یعنی اب ہمیں اس کے معاملہ میں شک وشبہ اور تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

عین لڑائی میں کلمہ پڑھ لیا تو؟

٣٩٢: وَعَنْ أَبِيْ مَعْبَدِ الْمِقْدَادِ بِنِ الْأَسْوَدِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: أَرَأَيْتَ إِنْ لَقِيْتُ رَجُلًا مِنَ الْكُفَّارِ، فَاقْتَتَلْتُ، فَضَرَبَ إِحْدٰى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا، ثُمَّ لَاذَ مِنِّيْ بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ، أَأَقْتُلُهٗ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بَعْدَ أَنْ قَالَهَا؟ فَقَالَ: لَاتَقْتُلْهُ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَطَعَ إِحْدٰى يَدَيَّ ثُمَّ قَالَ ذٰلِكَ بَعْدَ مَا قَطَعَهَا، فَقَالَ: لَاتَقْتُلْهُ، فَإِنْ قَتَلْتَهٗ فَإِنَّهٗ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهٗ، وَإِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهٖ قَبْلَ أَنْ يَقُوْلَ كَلِمَتَهُ الَّتِيْ قَالَ. (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح: حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میدانِ جنگ میں کسی کافر سے میری مڈبھیڑ ہوجائے (اور ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑیں) اسی دوران وہ تلوار کے ذریعہ سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے، اس

کے بعد (جب وہ دیکھے کہ اب میں اس پر حملہ آور ہونا چاہتا ہوں تو) اپنے بچاؤ کے لیے وہ ایک درخت کی آڑ میں چلا جائے، اور وہاں پہنچ کر فوراً کہے "أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ" میں اسلام لے آیا۔ تو اے اللہ کے رسول! اب کیا مَیں اس کو قتل کرسکتا ہوں؟ (چوں کہ اس زمانہ میں جہاد کا سلسلہ جاری تھا اور یہ صورتیں پیش آتی رہتی تھیں۔ دیکھئے! یہاں ظاہری حالات یہ بتلا رہی ہے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہے، اسی لیے انہوں نے سوال کے واسطے نبی کریم ﷺ کے سامنے خاص یہ صورت پیش کی۔) حضور ﷺ نے فرمایا "لَا تَقْتُلْهُ" آپ اس کو قتل نہ کیجئے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا اس کے بعد وہ یہ بات کہہ رہا ہے؟ (تو اس کی وجہ سے سمجھ میں تو یہی آرہا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کہہ رہا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے پھر کہا "لَا تَقْتُلْهُ" تب بھی اس کو قتل نہ کرو۔

افادات: یعنی جب وہ کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر چکا جس کی وجہ سے اس کی جان اور مال محفوظ ہو گئے، اس کے باوجود بھی اگر تم نے اس کو قتل کر دیا تو اس کو قتل کرنے سے پہلے جو حالت اور پوزیشن تمہاری تھی، اب وہ پوزیشن اس کی ہو گئی۔ اور جو پوزیشن کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی تھی وہ پوزیشن تمہاری ہو گئی۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ مسلمان تھے اور کسی جرم کے مرتکب بھی نہیں ہوئے تھے، وہ معصوم الدم تھے۔ انہوں نے کسی مسلمان کی جان نہیں لی تھی کہ جس کی وجہ سے ان کی جان لینا درست ہو۔ اور اس نے جب کہہ دیا کہ میں مسلمان ہوا تو اب اس کی پوزیشن بھی وہی ہو گئی کہ اس کی بھی جان و مال محفوظ ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر اس کو قتل کر دیا تو جو پوزیشن کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی تھی وہ پوزیشن تمہاری ہو گئی۔ یعنی نعوذ باللہ وہ کافر نہیں ہو گئے، بلکہ اس کے کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی جان محفوظ نہیں تھی، اور کلمہ پڑھ لینے کی وجہ سے اس کی بھی جان محفوظ ہو گئی تھی، اور جب اس کے قتل کا ارتکاب کیا تو اس کی وجہ سے قصاص کے طور پر اب تمہاری جان لینا جائز ہو گیا۔ اس لیے اب تمہاری جان محفوظ نہیں رہی۔ یہ مثال دے کر بطورِ تشبیہ جان کے محفوظ ہونے اور نہ ہونے کو سمجھایا گیا ہے۔

دراصل بتلانا یہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے ایسی صورت موجود تھی جس میں ایک قرینہ اور علامت بھی ہے کہ اس نے ان کا ہاتھ کاٹا، اور جب یہ اُس پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسی بات کر رہا ہو، تب بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کا پابند بنایا کہ جب ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہو، اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرنا چاہیے۔ وہ کس حالت میں اپنے اسلام کا اظہار کر رہا ہے، اس کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

آگے اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔

لاڈلے، لاڈلے زادے

٣٩٣: وَعَنْ أُسَامَةَ بنِ زيدٍ رضي الله عنه قَالَ: بَعَثَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِلَى الْحُرَقَةِ مِنْ جُهَيْنَةَ، فَصَبَّحْنَا الْقَوْمَ عَلَىٰ مِيَاهِهِم، وَلَحِقْتُ أَنَا وَرَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ رَجُلًا مِنْهُم، فَلَمَّا غَشِينَاهُ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَكَفَّ عَنْهُ الْأَنْصَارِيُّ وَطَعَنْتُهُ بِرُمْحِي حَتَّىٰ قَتَلْتُهُ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ بَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ لِي: يَا أُسَامَةُ! أَقَتَلْتَهُ بَعْدَ مَا قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّمَا كَانَ مُتَعَوِّذًا، فَقَالَ: أَقَتَلْتَهُ بَعْدَ مَا قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا عَلَيَّ حَتَّىٰ تَمَنَّيْتُ أَنِّي لَمْ أَكُنْ أَسْلَمْتُ قَبْلَ ذٰلِكَ الْيَوْمَ. (متفق عليه)

وفي رواية: فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَقَتَلْتَهُ؟ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّمَا قَالَهَا خَوْفًا مِنَ السِّلَاحِ، قَالَ: أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ حَتَّىٰ تَعْلَمَ أَقَالَهَا أَمْ لَا؟ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّىٰ تَمَنَّيْتُ أَنِّي أَسْلَمْتُ يَوْمَئِذٍ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے۔ یہ حضرت اسامہ بن

زید رضی اللہ عنہ حضورا کرم ﷺ کے محبوب ہیں۔حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے متبنّٰی رہ چکے تھے اور نبی کریم ﷺ کے بڑے محبوب اور لاڈلے تھے،انہیں کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہیں،اسی لیے ان کو ''حِب ابنُ الحِب'' کہا جاتا تھا۔نبی کریم ﷺ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک شاخ حرقہ تھی۔وہ لوگ بنو حرقہ اور حرقات کہلاتے تھے۔ان کی طرف نبی کریم ﷺ نے مجھے لشکر لے کر بھیجا (تو کفار کے جس علاقہ پر حملہ کرنے کے لیے ہم گئے تھے، وہ سارا مشرکین کا علاقہ تھا) صبح کے وقت ان کے چشمہ اور قیام گاہ پر ہم نے ان کو جا لیا (یعنی ہم نے حملہ کر دیا) میں اور ایک انصاری ہم دونوں اس قبیلہ کے ایک آدمی پر حملہ کے لیے پہنچ گئے۔جب ہم بالکل اس کے اوپر پہنچے تو وہ بول پڑا الا الٰہ الا اللہ۔

دوسری روایت میں ہے کہ سب قبیلہ والے بھاگ گئے اور ایک آدمی رہ گیا اور ہم اس کے پاس اس کے قتل کے ارادہ سے پہنچ گئے۔جب اس نے ہم کو بالکل اپنے پر چڑھا ہوا آیا دیکھا تو اس نے کلمہ پڑھ لیا۔تو وہ انصاری تو رک گئے،لیکن میں نے اپنا نیزہ اس کی طرف بڑھایا اور اس کو قتل کر دیا۔ (یہ واقعہ تو وہاں ہو گیا) پھر جب ہم مدینہ منورہ واپس آئے تو نبی کریم ﷺ کو یہ ساری تفصیلات معلوم ہوئیں (سارے حالات آپ ﷺ کے سامنے آئے تو) نبی کریم ﷺ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ اے اسامہ! اس آدمی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تھا،اس کے باوجود تم نے اس کو قتل کر دیا؟ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ تو جان بچا رہا تھا (یعنی اس نے لا الٰہ الا اللہ دل سے تھوڑا ہی کہا تھا؟ بلکہ جب اس نے دیکھا کہ ہم تلوار لے کر اس کے سر پر پہنچ گئے ہیں تو اپنی جان بچانے کے لیے اس نے یہ جملہ کہہ دیا۔حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ) حضور ﷺ نے پھر دوبارہ فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اس کو قتل کر دیا؟ حضورا کرم ﷺ بار بار یہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ میں دل میں یہ سوچنے لگا کہ کاش! آج ہی مَیں مسلمان ہوا ہوتا۔

افادات: مطلب یہ ہے کہ اگر آج اسلام لایا ہوتا تو چوں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے ''اَلْاِسْلَامُ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهُ'' کوئی آدمی اسلام قبول کرے تو اسلام لانے

سے پہلے جتنے بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے، چاہے بیسیوں آدمیوں کو قتل کیوں نہ کیا ہو؛ وہ سب معاف ہو جاتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میرا آج اسلام لانا میرے اس گناہ کے معاف ہونے کا ذریعہ بن جاتا۔ یہ جملہ بول کر ان کا مقصد اپنے آپ کو اس گناہ سے پاک صاف رکھنا تھا اور کوئی چیز نہیں تھی۔

کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا؟

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے اسامہ! اس نے لا الہ الا اللہ کہا، پھر بھی تم نے اس کو قتل کر دیا؟ مَیں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! تلوار کے ڈر سے اس نے کہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس نے یہ کلمہ تلوار کے ڈر سے کہا ہے؟ یعنی اس نے یہ کلمہ سچے دل سے پڑھا، یا تلوار کے ڈر سے پڑھا؛ یہ تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ تم نے تو صرف ظاہری حالت کو دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ عین اس حالت میں بھی ایک آدمی سچے دل سے یہ کلمہ پڑھ لے۔ یہ کوئی بعید اور ناممکن بات تو ہے نہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق دل سے ہو، اس معاملہ میں کبھی ہمیں اس بات کی جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے دل کی نیت کے متعلق کوئی فیصلہ کریں۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جو معاملہ بھی دل سے تعلق رکھنے والا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا چاہیے، ہم اس کے متعلق کوئی دوٹوک بات نہیں کہہ سکتے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ان کے اس فعل پر بار بار ٹوکا۔

صحابہ کی شان

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ کسی چیز پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو تنبیہ کی جاتی، یا تاکید کے طور پر کوئی بات کہی جاتی، تو زندگی میں ایک بار جو بات کہہ دی گئی وہ ان کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی تھی۔ پھر کبھی اس کے خلاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرما دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی سے کوئی سوال مت کرنا۔ اس کے بعد اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوتے اور ہاتھ میں سے کوڑا نیچے گر جاتا، تو کبھی کسی مانگتے نہیں تھے کہ میرا کوڑا دو۔ بلکہ خود اترتے، کوڑا اُٹھاتے اور پھر سوار ہوتے۔

ہر صحابی کی یہی شان تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کی جانے والی ہدایت ایسی نہیں ہے کہ اس کی طرف سے آدمی غفلت برتے اور بے پرواہی سے کام لے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جب ایک مرتبہ تنبیہ کر دی گئی تو ایک مؤمن کی شانِ ایمانی کا تقاضہ یہی ہے کہ زندگی بھر کے واسطے وہ بات اس کے قلب پر نقش ہو جانی چاہیے۔

کسی کا ساتھ نہ دیا

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جب ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش آ گیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اجتہادی نظریات کے اختلاف کے پیشِ نظر آپس میں جنگ کی نوبت آئی، تو مسلمانوں ہی کے دو لشکر آپس میں ٹکرائے۔ اس زمانہ میں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تین گروہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ہو گئے تھے۔ بعض

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تھے۔اور بعض غیر جانبدار(Neutral) تھے، یعنی کسی کی طرف نہیں تھے۔وہ اس سے اپنے آپ کو الگ ہی رکھتے تھے۔اس وقت جو لوگ اس سے الگ تھلگ رہے تھے، انہیں میں سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔حالانکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا تعلق نبی کریم ﷺ کے گھرانہ کے ساتھ بالکل گھر جیسا تھا۔بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دوسری ران پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی ان سے محبت رکھیو۔(بخاری شریف، ۳۵۲۸۔سنن النسائی الکبری، ۸۱۸۴)

بہر حال! میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تو آپ ﷺ کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھرانہ کے ایک فرد کی طرح تھے۔لیکن اس کے باوجود اس معاملہ میں انہوں نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

مجھے جرأت نہیں ہوتی

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین تھے اور اہلِ حق کے نمائندے تھے، اس لیے ہر ایک کا فریضہ بنتا تھا کہ ان کا تعاون کرکے ان کا ساتھ دیتا۔اور جنہوں نے اس معاملہ میں غیر جانبدار رہ کر یا کسی اور طریقہ سے کمی کوتاہی سے کام لیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔بخاری شریف ہی میں ایک واقعہ موجود ہے کہ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کسی ضرورت سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی بھیجا۔تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ پوچھیں گے کہ انہوں نے ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا؟ تو جواب میں ان کو میری طرف سے یہ کہنا کہ اگر مَیں آپ کو شیر

کے منھ میں دیکھتا تو اس بات کو پسند کرتا کہ آپ کے ساتھ ساتھ مَیں بھی ہوتا، لیکن آپس کی یہ جنگ ایک ایسی چیز ہے جس میں مجھے جرأت نہیں ہوتی (بخاری شریف،۷۱۱۰) چوں کہ یہ ایک ایسی بات تھی جس پر نبی کریم ﷺ ان کو ایک مرتبہ تنبیہ کر چکے تھے، اس لیے آئندہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے انہوں نے اس معاملہ میں اپنے آپ کو الگ رکھا تھا۔

تب تم کیا جواب دو گے؟

٣٩٤: عَنْ جُنْدُبِ بنِ عَبدِاللّٰهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ بَعثاً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلىٰ قَوْمٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ، وَأَنَّهُمْ اِلتقَوا، فَكَانَ رَجُلٌ مِّنَ المُشْرِكِينَ إِذَا شَاءَ أَن يَّقْصُدَ إِلىٰ رَجُلٍ مِّنَ المُسلِمِيْنَ قَصَدَ لَهُ فَقتَلَهُ، وَأَنَّ رَجُلاً مِّنَ المُسلِمِينَ قَصَدَ فَقتَلَهُ، وَكُنَّا نَتَحدَّثُ أَنَّهُ أُسَامَةُ بنُ زَيدٍ، فَلَمَّا رَفَعَ السَّيفَ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَقَتَلَهُ، فَجَاءَ البَشِيرُ إِلىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَسَأَلَهُ وَأَخبَرَهُ، حَتىٰ أَخبَرَهُ خَبَرَ الرَّجُلِ كَيفَ صَنَعَ، فَدَعَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: وَلِمَ قَتَلتَهُ؟ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! أَوجَعَ فِي المُسلِمِينَ وَقَتَلَ فُلَاناً وَفُلَاناً، وَسَمّٰى لَهُ نَفَراً، وَإِنِّي حَمَلتُ عَلَيهِ، فَلَمَّا رَأَى السَّيفَ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَقَتَلتَهُ؟ قَالَ: نَعَم، قَالَ: فَكَيْفَ تَصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَت يَومَ القِيَامَةِ؟ قَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! اِستَغفِرلِيْ، قَالَ: وَكَيْفَ تَصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَت يَومَ القِيَامَةِ؟ فَجَعَلَ لَا يَزِيدُ عَلىٰ أَن يَّقُولَ: كَيْفَ تَصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَت يَومَ القِيَامَةِ؟ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی ایک قوم کی طرف ایک لشکر بھیجا۔ جب دونوں کی آپس میں جنگ ہوئی تو مشرکین میں ایک بڑا بہادر آدمی تھا، جس مسلمان کا وہ رخ کرتا، اس پر حملہ آور ہو کر اس کو قتل کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مسلمان آدمی اس کی

بے خبری کا منتظر رہا، تاکہ وہ اس پر حملہ کرے۔ (حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان جو اس مشرک کی بے خبری کا منتظر تھا وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ تھے۔) جب انہوں نے موقع پالیا اور دیکھا کہ وہ غافل ہے تو اس کو مارنے کے لیے اس انداز سے تلوار اُٹھائی کہ اس کو جوابی حملہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا (غفلت کا مطلب یہی تھا کہ وہ جوابی کارروائی نہ کر پائے اور اس سے پہلے ہی اس کا معاملہ ختم ہوجائے۔ خیر! جب انہوں نے تلوار اُٹھائی اور اس نے بھی دیکھا کہ اب میرے پاس دفاع کا کوئی موقع نہیں ہے) تو فوراً اس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھا لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کردیا۔ (گویا وہ اس کا کلمہ سننے کے باوجود بھی رکے نہیں) اس جنگ میں جب مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو اس کی خبر دینے والا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس سے تمام حالات پوچھے، اس آدمی نے سارے حالات بتائے اور اس میں اس بہادر کا واقعہ بھی سنایا کہ اس نے کئی مسلمانوں کو قتل کیا اور جب اس پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا تو اس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھا، لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا حضور ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پوچھا کہ تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا، کئی آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ فلاں اور فلاں کو اس نے قتل کیا، اور پھر جب میں اس پر حملہ آور ہوا اور اس نے میری تلوار کو اپنے سر پر دیکھا کہ وہ اپنا کام کرنے جارہی ہے تو اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کو قتل کردیا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے اسامہ! قیامت کے روز جب اس آدمی کا یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ تمہارے خلاف دعویٰ دائر کرے گا؛ تو تم کیا جواب دو گے؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے جب یہ سنا تو کہا کہ آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے۔ اس کے جواب میں پھر حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ قیامت کے روز جب وہ آئے گا تو اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے؟ حضور ﷺ بار بار یہی جملہ فرماتے رہے۔

افادات: اس موقع پر شراح نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض محدثین نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے جب ان کے لیے دعاءِ مغفرت کی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی نازل ہوئی۔

اب فیصلہ ظاہر پر ہوگا

۳۹۵: عَنْ عَبدِاللّٰہِ بنِ عُتبَۃَ بنَ مَسعُودٍ قَالَ: سَمِعتُ عُمَرَ بنَ الخَطَّابِ یَقُولُ: إِنَّ نَاساً کَانُوا یُؤْخَذُونَ بِالوَحْيِ فِي عَهدِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ، وَإِنَّ الوَحيَ قَدِ انقَطَعَ، وَإِنَّمَا نَأخُذُکُمُ الاٰنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ أَعمَالِکُمْ، فَمَنْ أَظهَرَ لَنَا خَیراً أَمَّنَّاهُ وَقَرَّبنَاهُ، وَلَیسَ لَنَا مِنْ سَرِیرَتِهٖ شَيْءٌ، اَللّٰہُ یُحَاسِبُهٗ فِي سَرِیرَتِهٖ، وَمَنْ أَظهَرَ لَنَا سُوءاً لَمْ نَأْمَنْهُ وَلَمْ نُصَدِّقْهُ، وَإِنْ قَالَ إِنَّ سَرِیرَتَهٗ حَسَنَةٌ. (رواہ البخاري)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں لوگوں کو وحی کی وجہ سے پکڑا جاتا تھا۔ اب وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا اس لیے تمہارے جو ظاہری اعمال ہیں، اسی کے مطابق ہم تمہارے ساتھ معاملہ کریں گے۔

افادات: یعنی بعض منافقین جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور نبی کریم ﷺ بھی ان کے ساتھ مؤمنوں ہی کا سا معاملہ کرتے تھے؛ لیکن جب ان کے متعلق خاص طور پر بذریعۂ وحی حضور اکرم ﷺ کو بتلایا جاتا، تو ان کے ساتھ مشرکوں کا سا معاملہ کیا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کر رہا ہے لیکن وحی نے آکر اس کے خلاف کوئی چیز بتلائی تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آئی ہے اس کی وجہ سے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اب وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا اس لیے تمہارے جو ظاہری اعمال ہیں، اسی کے مطابق ہم تمہارے ساتھ معاملہ کریں گے۔ چنانچہ جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو بھلا ظاہر کرے گا یعنی کلمۂ اسلام پڑھے گا، نماز ادا کرے گا، زکوٰۃ ادا کرے گا اور ہمیں

اس میں مسلمانوں کی سی علامتیں نظر آئیں گی، تو ہم اس کو جان و مال کی گارنٹی دیں گے، اپنے قریب کریں گے، مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے اور اپنی جماعت میں اس کو داخل کریں گے، اس کے اندر کے حال سے ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہے، اندر کے معاملہ کا حساب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس سے لیں گے۔ یہاں دنیا میں تو وہ اپنے آپ کو جیسا ظاہر کر رہا ہے؛ ہم اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔ اور جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو برا ظاہر کرے گا یعنی کافروں کا سا معاملہ کرے گا تو ہم نہ تو اس کو جان و مال کی امان دیں گے، اور نہ اس کو مسلمان قرار دیں گے، چاہے اس کے اندر کچھ بھی ہو۔ اس کے اندر کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے تو شریعت کی طرف سے یہی تاکید کی گئی ہے کہ جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو جس طرح ظاہر کرتا ہے، اس کے مطابق ہم اس کے ساتھ معاملہ کریں، اور اس کے دل میں کیا ہے اس کے متعلق کوئی تردد اور شک وشبہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے۔